قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

نومبر 2022 قیمت 15 ₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

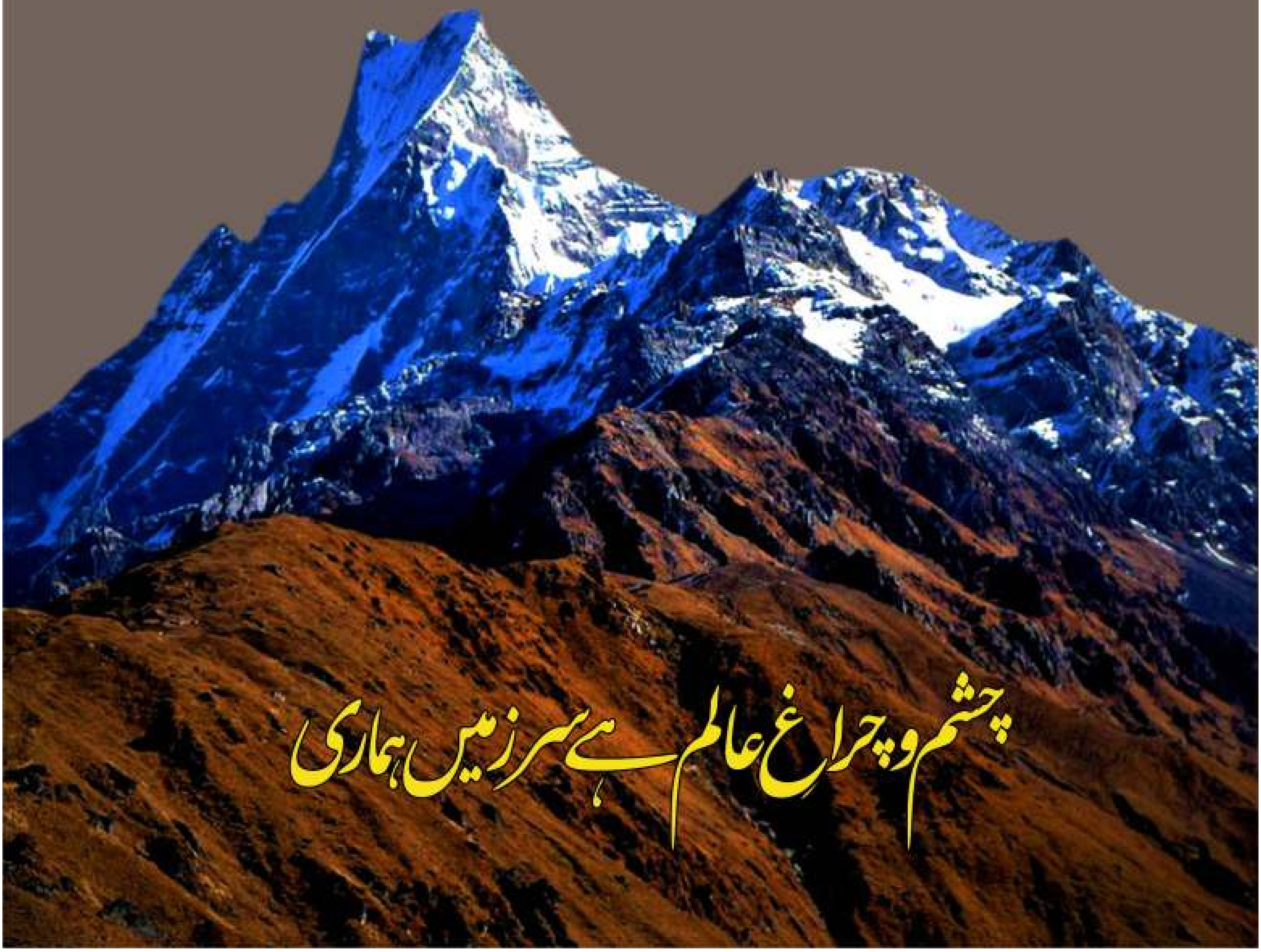

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

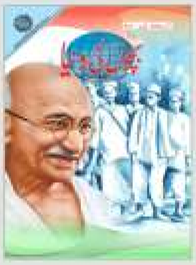

ان کے علاوہ:

- کہکشاں
- زبان شناسی
- میرا بچپن
- بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ
- ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 24، شمارہ: 11، نومبر 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000   شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002
فون: 040-2441519

مشمولات

اداریہ

ہماری بات — 4

خطوط

ربط و التفات — قارئین کے خطوط — 5

زبان اور زمینی صورت حال

زبان کو زندہ رکھنے کے لیے مقتضائے وقت اور عصری مطالبات کا التزام ضروری — منظور احمد گنائی — 7

ادب: زاویے اور جہات

ڈراما انارکلی میں ڈرامائی کنایہ — م ن سعید — 11
ساحر لدھیانوی کی شاعری میں پیکر تراشی — عرشیہ جبین — 14

میراجی کی فکری جہات — شاہ عالم — 17
اردو کے دخیل الفاظ اور رشید حسن خاں — مجاہد الاسلام — 20
داستانوں کے مافوق الفطری تصورات کا ٹکنالوجی میں اطلاق — محمد وحید الدین — 23

لعل و گہر

برج پریمی چند تاثرات — پریمی رومانی — 27
محمود بیگ ساز برہانپوری — محمود بیگ تشنہ — 30
ترنم ریاض: قصہ گوئی نہ کہ جادو بیانی — یاسمین رشیدی — 32
جدید نظم اور ندا فاضلی — صبا زہرا رضوی — 34

ذکر ن م راشد

راشد کی شاعری میں اساطیری حوالے — قمر جہاں — 36
ن م راشد شمیم حنفی کی نظر میں — ثاقب فریدی — 40
احتجاجی فکر اور ن م راشد — عالیہ بیگم — 44

خراج عقیدت

اصغر عباس:
عشق کا نام جس سے روشن تھا — معید الرحمٰن — 47
رضوان اللہ فاروقی — نایاب حسن — 51

سلسلۂ صحافت

کمپیوٹر پر دیدہ زیب صفحہ سازی کا طریقہ — افضل مصباحی — 54

نکہت نثر

طاؤس چمن کی مینا
جذباتی رشتوں کا پراثر بیانیہ — حسینہ خانم — 58
نیر مسعود کی خاکہ نگاری — ریاض احمد نجار — 60

تاریخ

عہد وسطیٰ: اقتدار حسین صدیقی کے چند مضامین کی روشنی میں — مہتاب جہاں — 63

خصوصی گفتگو

حبیب کیفی سے بات چیت — اکمل نعیم صدیقی — 67

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ — 71

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ — 81

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 82

ہماری بات

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس ملک کے اندر جو خوبصورتی ہے وہ یقیناً قابل رشک ہے۔ شاید یہیں کے حسین قدرتی مناظر کو دیکھ کر کسی شاعر نے کہا تھا کہ

اگر فردوس بر روئے زمیں است　　ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

یقیناً ہمارا یہ ملک جنت نشان ہے، جہاں مختلف تہذیبوں اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے سے محبت اور اخوت کا رشتہ رکھتے ہیں۔ یہاں کے صوفیوں، سنتوں، رشیوں اور منیوں کے پیغامات کی وجہ سے تمام طبقات میں ایک طرح سے وحدت و ہم آہنگی ہے۔ ہمارا ملک مشترکہ تہذیب و تمدن، مذہبی رواداری اور روحانی قدروں کا دیس ہے۔ یہاں زبانیں بھی بے شمار ہیں، تہذیبوں کی بھی کثرت ہے اور مذاہب کی تعداد بھی۔ ان تمام کے باوجود سب لوگ سیکڑوں سال سے مل جل کر رہتے ہیں۔ یہاں انسان دوستی اور محبت کا جو سبق صوفیوں اور سنتوں نے دیا اس پر لوگوں نے عمل کیا۔ یہی محبت و یگانگت دراصل ہندوستان کا حسن ہے، یہاں کی خوبصورتی ہے اور اسی وجہ سے یہاں سکون بھی ہے، امن بھی ہے۔ یہ امن و آشتی کا ایک گہوارہ ہے جہاں انسانوں سے نفرت نہیں، محبت سکھائی جاتی ہے۔ یہاں کے رہنے والے اپنے ملک کے ذرے ذرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اقبال نے تو یہاں تک کہا کہ ع

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

یہاں کے پیڑ ہوں یا پہاڑ، ندیاں ہوں یا سمندر، گنگا ہو یا جمنا ہر ایک ذرے سے یہاں کے لوگوں نے بے پناہ محبت کی ہے اور اپنی تہذیب و ثقافت سے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔

ہندوستان نے پوری دنیا کو ایک فکر و فلسفہ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا ہندوستان کی عظمت کا لوہا مانتی ہے۔ عرب کے سیاحوں نے بھی ہندوستان کی عظمت کو اپنے سفرناموں کا حصہ بنایا تو دوسرے ملک کے مورخین بھی ہندوستان کی رفعت کا گن گاتے ہیں۔ مولانا غلام آزاد بلگرامی جیسے جید فاضل نے بہت پہلے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا 'سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان' اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا ملک ہندوستان بہت سی خوبیوں سے متصف ہے، اس کی ہزاروں خوبیاں ہیں جن پر دنیا رشک کرتی ہے۔ امیر خسرو کو بھی اس سرزمین سے بے پناہ عشق تھا، انھوں نے بھی ہندوستان کو جو خراجِ محبت پیش کیا ہے اسے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا ملک ہندوستان معدن علم و حکمت ہے، مخزن رموز و اسرار ہے۔ یہاں کی فضا پرسکون ہے، اور ماحول اتنا خوشگوار کہ علامہ اقبال نے کہا تھا

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

اس ملک کو کبھی سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ ہر اعتبار سے ہمارے ملک کے پاس علمی اور فکری دولت و حشمت تھی اور یہاں کے اقدار و افکار پوری دنیا کو متاثر کرتے تھے۔ اردو کے شاعروں و ادیبوں نے بھی اپنی شاعری میں اپنے ملک سے محبت کے جذبے کو پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ خاک ہند میں عظمتوں کے ہزاروں نشاں ہیں۔ برج نرائن چکبست نے 'خاک ہند' کے عنوان سے جس جذبے کا اظہار کیا ہے اس میں ہندوستان کے تمام باشندوں کی آواز شامل ہے۔ چکبست کہتے ہیں۔

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری

سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں

تاباں تھا مہر دانش اس وادیِ کہن میں

آج ضرورت ہے کہ ہم تمام باشندگانِ ہند، ہندوستان کی عظمت پارینہ کی بازیافت کے لیے کوشش کریں اور اس ملک کی قدیم تہذیبی، ثقافتی روایت کو زندہ کریں کہ اسی سے ہمارے ملک کی پوری دنیا میں شناخت ہے!

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط و التفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یه نهیں هوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا هوتا هے۔ ماضی میں مکتوبات بهت سے مضامین سے بهی زیاده بیش قیمت هوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندهی کی جاتی تهی۔

قارئین سے گذارش هے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندهی کریں جنهیں نظرانداز کیا جاتا رها هے۔ آپ کے خطوط همارے لیے بهت اهمیت کے حامل هوتے هیں، ان سے همیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی هے۔ (اداره)

محترمہ عائشہ ضیا نے حنیف نقوی کے تذکروں پر مبنی اپنے مقالے میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ تذکرے ادبی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

محمد معظم الدین کا مضمون بیسویں صدی کے اہم سفر ناموں کی تاریخ نشان زد کرتا ہے اور اہم سفر ناموں کے مواد و اسلوب کی بخوبی خط کشی کرتا ہے۔ اس مقالے کا مطالعہ کرتے ہوئے خواجہ میر درد کا ایک شعر یاد آیا۔

سیر کر دنیا کی غافل، زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی، تو نوجوانی پھر کہاں

محترمہ تمنا شاہین نے نذیر بنارسی کی نظم 'امن کا دیوتا' پیش کرتے ہوئے مہاتما گاندھی جی کے تحریر کردہ تذکروں کی بھی بہترین خط کشی کی ہے۔ ان کا یہ مصرع منقوشِ خاطر ہے ''آج باپو نہیں، باپو کی سمادھی ہی سہی۔'' (ص 44)

کٹک (اُڈیشا) صحافی اور ادیب و شاعر سعید رحمانی نے کرامت علی کرامت کی شاعری پر مبنی اپنے مقالے میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ کرامت کی شاعری میں سلاست، نفاست اور مناسب استعارات سے لبریز اشعار ملتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

''کڑی دھوپ مجھ کو بلاتی رہی مگر پیڑ جامن کا راہوں میں تھا۔''

جناب اسمٰعیل وفا نے بھارتی ڈاک ٹکٹوں پر اردو قلم کاروں کی تصاویر سے مزین ٹکٹوں پر مضمون تحریر کیا ہے جو ثبوت فراہم کرتا ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک : کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا شمارہ موصول ہوا۔ مدیر شیخ عقیل احمد نے تحریک آزادی میں گاندھی جی کے کردار پر تفصیل سے بحث کی اور ان کے لسانی نظریہ ہندوستانی کی صراحت کی ہے۔ ان کے نزدیک راشٹریہ بھاشا کا مطلب ہندی + اردو = ہندوستانی تھا وہ ہمیشہ ہندوستان کے تمام طبقات کے درمیان اتحاد اور یکجہتی کی تبلیغ کرتے رہے اور اس کا اثر ہندوستانی عوام پر بھی پڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر مذہب کا سچائی کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس لیے مذہبی بنیاد پر اختلاف یا تنازعے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ آج کی انسانیت سماج معاشرہ کو گاندھی جی کے نظریات و تعلیمات کی ضرورت ہے جس سے نفرت ختم ہو جائے، اور محبت خلوص ہمدردی عام ہو۔ زیر نظر شمارے میں محمد معظم الدین نے 'بیسویں صدی میں اردو کے اہم سفرنامے' میں سفرنامے کے فن و تقاضوں پر عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ نصرت جہاں نے 'نفسیاتی تنقید رد و قبول کی میزان پر' عمدہ مضمون ہے۔ غزالہ فاطمہ نے 'مرد ادیبوں کی تنقید میں تانیثی رجحان' میں چند مرد ادیبوں کی تنقید میں تانیثی رجحان کا جائزہ لیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ، سید عقیل احمد دیویندر اسر، ابوالکلام قاسمی، حقانی القاسمی، مشتاق احمد وانی، ناصر عباس نیر، اکرم کنجاہی، ریاض صدیقی، انیس ناگی، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر ندیم احمد قابل ذکر ہیں۔ عائشہ ضیا نے 'حنیف نقوی کی تذکرہ شناسی کے نمایاں پہلو' کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ آفتاب احمد منیری نے 'جدید غزل کا ایک معتبر نام: فضا ابن فیضی' میں ان کے غزل پر عمدہ گفتگو کی ہے۔ ان کے علاوہ انظر نبی ڈار، فیاض احمد، سعید رحمانی، اسمٰعیل وفا وغیرہ کے مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

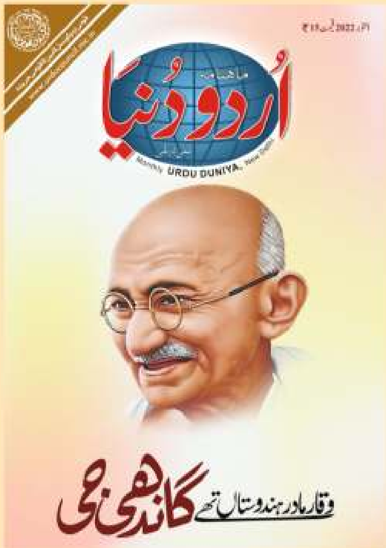

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان و ادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

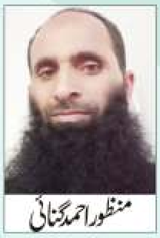

منظور احمد گنائی

زبان کو زندہ رکھنے کے لیے مقتضائے وقت اور عصری مطالبات کا التزام ضروری

اردو ایک عالمگیر زبان ہے۔جو دنیا کے مختلف کونوں میں پڑھی، بولی اور سمجھی جاتی ہے۔لیکن وقت کے تغیر وتبدل کے ساتھ ساتھ زبانیں بھی ترقی وپرداخت کے کئی مراحل طے کر لیتی ہیں۔ یہی معاملہ اردو زبان کے ساتھ بھی پیش آیا جس نے آج تک نہ جانے کتنے پڑاو عبور کیے اور مستقبل میں عبور کرتی رہے گی۔ اردو زبان نے عصری مطالبات کا بھی التزام رکھا ہے۔اردو وہ واحد زبان ہے جس نے درباروں اور محلوں سے نکل کر عام انسانی دلوں کو منور کیا۔ اردو زبان کے تئیں موجودہ صورت سے آگاہی کے لیے زمینی صورت حال کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ کسی بھی زبان کی بنیاد اور ترقی واشاعت کسی ایک قوم یا معاشرے سے جوڑنا سراسر ناانصافی ہوگی۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ برصغیر ہند وپاک میں مسلمانوں نے اس گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہوسکتاکہ ملک میں رہنے والے دیگر مذہب وملت کے لوگوں نے اس کی بقا کے لیے کوئی سعی نہیں کی۔ دنیا کے دیگر ممالک کے مدمقابل ہمارے ملک ہندوستان میں اردو کی مقبولیت سب سے زیادہ ہوئی۔ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور دانش گاہوں میں اگرچہ اردو زبان کی بقا کے لیے تحقیقی اور تخلیقی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر انجام دی جا رہی ہیں۔ مگر اس سے صرف سندی و غیر سندی تحقیق کا مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اردو کی موجودہ صورت حال کی آگاہی کے لیے ماہنامہ ’اردو دنیا‘ نے سوال نامے کی ایک کڑی شروع کی ہے جس میں اردو کی حقیقی صورت حال کا جائزہ لیا جاتا ہے۔اس سوالنامے سے اردو ادب کی ترقی کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے اور زمینی سطح پر اردو کی موجودہ صورت حال اور درپیش مسائل کا ازالہ بھی مراد لیا جاتا ہے، تاکہ زبان کی ترویج واشاعت ممکن ہوسکے۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور وفکر نہ کیا جائے تب تک اردو زبان کے تحفظ اور ترقی کے لیے ایک مربوط لائحہ عمل تیار کرنا ناممکن ہوگا۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: کسی بھی زبان کی موت تو نہیں ہوتی بلکہ عوام سے اس کا رشتہ منقطع ہونے کے سبب زبان کی اہمیت میں کمی کا احساس ہوسکتا ہے۔عوامی بول چال اور درس وتدریس میں کسی دوسری زبان کو اختیار کرنے سے وہ زبان صرف کتابوں اور لائبریریوں تک ہی محدود رہ سکتی ہے۔ ہندوستان میں اس کی بہترین مثال سابقہ دفتری زبان سنسکرت کے طور پر دی جاسکتی ہے جس کا بول بالا قریہ قریہ اور شہر شہر تھا لیکن آج اس کے قارئین کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔اس لیے بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر زبان میں وقتی تقاضوں کے ساتھ ساتھ تبدیلیوں کو ضم کرنے کی سکت موجود ہو۔اردو زبان ان سارے مراحل پر کھری اترتی ہے۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے؟

ج: کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے سب سے اہم رول ماں باپ کا ہوتا ہے۔کیونکہ بچے کی اولین درسگاہ آغوش مادر ہی ہوتی ہے۔اس لیے والدین پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ بچوں کو بچپن میں ہی اپنی مادری زبان سے متعارف اور اسے محبت کرنا سکھائیں۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر زبان کا رشتہ عوام سے ہمیشہ اُستوار رہے۔اس کے ساتھ ساتھ تنظیموں، انجمنوں، محفلوں اور سمیناروں کے انعقاد کو لازمی بنائیں۔آج کل سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اس لیے ہر زبان کو اپنے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگی اور موافقت ہونی چاہیے، وہی زبان زندہ رہ سکتی ہے جو جدید ٹکنالوجی جیسے انٹرنیٹ کے بنائے گئے حدود وقیود پر کھری اترتی ہو اور ساتھ ہی نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ عالمی سطح پر زبان کو نئی پود سے متعارف کرانے کے لیے ایک مضبوط ڈھانچہ تیار کرنا چاہیے۔ہمیں اُس زبان کی درس وتدریس کا انتظام کرنا چاہیے جہاں اس زبان سے اُنسیت رکھنے والے موجود ہوں۔ ہر اسکول اور کالج میں اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جانی چاہیے۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

ج: زبان اور تہذیب وثقافت کا رشتہ سکے کے دو رُخ ہیں۔ زبان ہی کسی تہذیب وثقافت کی نمائندگی میں بڑا رول نبھا سکتی ہے۔کیونکہ ہر تہذیب کی تاریخ وہاں کی مادری زبان میں ہی رقم کی جاتی ہے۔لہذا جب زبان ہی زوال کا شکار ہوجائے تب تہذیب وثقافت بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔تہذیب وثقافت میں کسی ملک کے رسم ورواج، تہوار و میلے، رہن سہن، آرٹ وکلچر، فنون لطیفہ اور دیگر اشیا صرف اسی زبان میں محفوظ ہوسکتی ہیں۔ زبان کے ذریعے ہی انسانی فہم وادراک، قلبی جذبات و واردات، مافی الضمیر اور شعوروفن کی کارفرمائی ممکن ہے۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: جی ہاں بالکل! کسی بھی انسانی وراثت کی اساس زبان ہی ہوتی ہے۔جب زبان کی ساکھ پر آنچ آئے تو انسانی وراثت خود بہ خود مٹ جاتی ہے۔لہٰذا میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تہذیب وثقافت اور زبان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے، ایک کا دوسرے کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: بالکل! کسی بھی تحقیقی کام کو سرانجام دینے کے لیے مواد کا وافر مقدار میں ہونا ضروری ہے۔کیونکہ مواد کی عدم دستیابی

سے خواندگی کی شرح میں کمی اور طلاب کے اندر احساس کمتری کا مادہ جنم لے سکتا ہے۔ جب کسی زبان میں سائنسی اور سماجی مواد کی کمی پائی جاتی ہے تب یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اُس زبان میں تحقیق کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ ظاہری بات ہے کہ سائنسی اور سماجی مواد کا وافر مقدار میں نہ ہونے سے زبان کی شرح خواندگی میں خود بہ خود گراوٹ آجاتی ہے۔ لہذا کسی بھی زبان میں شرح خواندگی، سائنسی اور دیگر علوم وفنون کی کمی سے زبان کی ترقی پر منفی اثرات پڑ سکتے ہیں۔

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کئی طرح کے خطرات سے گزرنا پڑے گا۔ اردو کی ترقی وبقا کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ انگریزی زبان کے ساتھ یگانگت اور اس کے تعلیمی نظام کو حد درجہ ترقی یافتہ سمجھنا۔ اسکولوں اور کالجوں یہاں تک کہ کچھ یونیورسٹیوں میں بھی اردو کے بجائے انگریزی کو عام بول چال کی زبان میں استعمال کرنا، مغربی طرز معاشرت کی پیروی، اسکولوں اور کالجوں میں اردو کے مضامین کو نصاب میں شامل نہ رکھنا، جدید سائنس اور ٹکنالوجی سے دوری برتنا، نئی فکر نئی سوچ جیسے سماج میں اردو کو دقیانوسی زبان سمجھنا، اردو زبان کو کم رتبہ دینا، روزگار کے کم مواقع دستیاب ہونا اردو زبان کو موجودہ حالات میں لاحق خطرے ہو سکتے ہیں۔

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

ج: بالکل بھی نہیں! ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اردو زبان کے لیے رومن رسم الخط کا استعمال روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے جس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ اردو مختلف زبانوں کے میل جول سے مل کر بنی ہے اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی مستعار لیے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو کی شکل بگڑ رہی ہے بلکہ اردو زبان ازل سے ہی متغیر رہی ہے اور تبدیلی ہر اختراع ہوئی چیز کے لیے لازم وملزوم ہے۔ اردو زبان دکن میں پلی اور بڑھی لیکن شمالی ہند میں اردو نے جتنی ترقی کی منزلیں طے کیں ہیں بے نظیر ہے۔ اردو ہمیشہ اپنے مصالحتی لب ولہجے میں تھی اور ان شاء اللہ آگے بھی اسی شکل وصورت میں پھلتی پھولتی رہے گی۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: ان شاء اللہ اردو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یوں تو اردو زبان بہت سی خوبیوں کی مالک اور متعدد اوصاف سے مزین ہے۔ میں اردو کا ایک ادنیٰ سا طالب علم اور مدرس ہوں۔ اردو سے میری دلی وابستگی ہے اور اس کی ترقی وترویج کے لیے میں ہمیشہ فکر مند رہتا ہوں۔ یہاں میں ایک مثال کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں اردو کو ایک مضمون کے طور پڑھایا جاتا ہے، ان ہی یونیورسٹیوں میں دارالحکومت دہلی میں قائم اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (اگنو) میں اردو کے علاوہ دیگر مضامین کو پڑھایا جاتا تھا لیکن اردو غائب تھی۔ حال ہی میں یونیورسٹی نے فیصلہ لیا کہ اب اردو کو بھی پڑھایا جائے گا جس کے لیے راقم الحروف کو اردو کی درس وتدریس کے لیے بحیثیت کونسلر منتخب کیا گیا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔ یہ اردو زبان کی شیرینی ولطافت اور ندرت پسندی ہی ہے جو ہر دل کو موہ لینے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے جس کی مثال آنکھوں کے سامنے عیاں ہے اس سے بڑھ کر اردو داں طبقے کے لیے اور کون سی مسرت ہوسکتی ہے۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

ج: انسان حیوان ناطق ہے اور انسان کی زندگی میں تبدیلی کا ظہور پذیر ہونا ایک فطری عمل ہے۔ زبان کی سطح پر جو سب سے اہم مسئلہ ادبی دنیا کو مجروح کر سکتا ہے وہ ہے املا کی غلطی۔ کچھ ہی دن پہلے میں بازار سے جا رہا تھا کہ اچانک ایک پوسٹر پر نظر پڑی جو اردو میں تحریر تھا۔ اس کو پڑھ کر میرے پاوں تلے زمین کھسک گئی کیونکہ عبارت اس طرح لکھی تھی کہ ''چلنے کا راستہ کھالی رکھے'' اس طرح کے جملے تحریر کرنا سراسر اردو کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ایسے المیے کو روکنے کے لیے ماہرین زبان کو آگے آنا چاہیے۔ اردو میں پوسٹر یا سائن بورڈ بناتے وقت کسی ماہر اردو کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ اسکولوں میں ابتدائی جماعتوں کے لیے اردو زبان پر دسترس رکھنے والے اساتذہ کا ہی انتخاب کیا جانا چاہیے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اردو اساتذہ املا اور تلفظ کی طرف خاص دھیان دیں اور ساتھ ہی توسیعی لکچروں کا انعقاد بھی سونے پہ سہاگا کا کام کر سکتا ہے۔ سمیناروں، ورکشاپوں اور سمپوزیم کو یقینی بنائے رکھنے میں کسی قسم کی لاپرواہی نہیں برتنی چاہیے۔ آج کل جدید ٹیکنالوجی میں سوشل میڈیا کے ذریعے ماہرین زبان اردو زبان کے تئیں بگاڑ کو روکنے کے لیے اہم فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

ج: جی ہاں! بالکل آپ نے درست فرمایا، آج کل زبان سے زیادہ ادبی تخلیقات پر توجہ دی جاتی ہے کیونکہ اردو زبان کی ترقی وترویج کے لیے جتنی بھی کتابیں تحریر کی گئیں ہیں ان کی تعداد قلیل ہے۔ ان گنت کتابیں ادب کی ترقی کے لیے لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔

خاص طور پر اردو فکشن کے متعلق جتنی تخلیقات بروئے کار لائی جاتی ہیں کسی اور صنف پر نہیں ملتی۔ لیکن اُن تخلیقات سے اردو زبان کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوسکتا۔ آج کل رسائل وجرائد میں چھپے مضامین ہی زیادہ

کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے سب سے اہم رول ماں باپ کا ہوتا ہے. کیونکہ بچے کی اولین درسگاہ آغوش مادرھی ہوتی ہے. اس لیے والدین پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ بچوں کو بچپن میں ہی اپنی مادری زبان سے متعارف اور اسے محبت کرنا سکھائیں. سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر زبان کا رشتہ عوام سے ہمیشہ اُستوار رہے. اس کے ساتھ ساتھ تنظیموں، انجمنوں، محفلوں اور سمیناروں کے انعقاد کو لازمی بنائیں. آج کل سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اس لیے ہر زبان کو اپنے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگی اور موافقت ہونی چاہیے، وہی زبان زندہ رہ سکتی ہے جو جدید ٹکنالوجی جیسے انٹرنیٹ کے بنائے گئے حدود و قیود پر کھری اترتی ہو اور ساتھ ہی نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ عالمی سطح پر زبان کو نئی پود سے متعارف کرانے کے لیے ایک مضبوط ڈھانچہ تیار کرنا چاہیے. ہمیں اُس زبان کی درس وتدریس کا انتظام کرنا چاہیے جہاں اس زبان سے اُنسیت رکھنے والے موجود ہوں. ہر اسکول اور کالج میں اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جانی چاہیے.

تر اردو زبان کی بقا کے لیے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سمیناروں اور ورکشاپوں سے بھی یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے بشرطیکہ اُن میں زبان کی بقا مقصود ہو۔ اردو کے ادارے اور تنظیمیں ادب کی ترقی کے لیے کام تو کرتے ہیں لیکن زبان کی پرداخت کے لیے کوئی موثر اقدام نہیں اٹھا پاتے، جس کی وجہ سے زبان کی نشر واشاعت مکمل طور پر

نہیں ہو پاتی۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: بالکل بھی نہیں! کیونکہ کلاسیکیت اور جدیدیت میں ادب کی پرکھ اور جانچ پڑتال کو کافی سمجھا جاتا ہے، زبان کا ان تحریکات ورجحانات کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ جب ایک قاری زبان کے بنیادی اصول وضوابط سے ناواقف ہے تو ان چیزوں پر بحث کرنے سے زبان کو کیسے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا پہلے زبان کے بنیادی علوم وفنون سے پوری آگاہی حاصل ہو، بعد میں ان ثانوی چیزوں پر اپنی توجہ مبذول کرے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: چونکہ میرا تعلق وادیِ کشمیر سے ہے اس حوالے سے میں بتاتا چلوں کہ یہاں کے سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں میں دسویں جماعت تک اردو کو ر سبجکٹ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ البتہ خصوصی اردو میڈیم اسکول میرے علاقے میں نہیں ہیں۔ رہی بات اردو اساتذہ کی اس حوالے سے تھوڑی سی مایوسی ہوتی ہے کیونکہ یہاں کے اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لیے ہر استاد کو اہل سمجھا جاتا ہے جو ایک مایوس کن بات ہے۔ دوسری بات سرکاری اور نجی اسکولوں میں زیادہ تر اردو پڑھانے والے اساتذہ کی تعلیمی قابلیت بہت ہی کم ہے جس سے بچوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کے پیچھے غیر سرکاری اسکولوں کے مالکان کا خود غرضانہ رویہ، جو ایک کم تعلیم یافتہ استاد کو ماہانہ تین یا چار ہزار روپے دے کر اپنا کام چلا رہے ہیں۔ کیونکہ اعلیٰ سند یافتہ اساتذہ کی ماہانہ تنخواہ دس ہزار کے قریب نہ دینے سے وہ طبقے بے روزگاری کے عالم میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ کشمیر میں ایسے خود غرضانہ رویے سے سب سے زیادہ متاثر صنف نازک کو ہونا پڑتا ہے کیونکہ ان کی دو ہزار کی ماہانہ اُجرت پر اسکولوں میں تقرری کی جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے رویے سے اردو زبان کی ترقی میں رکاوٹ ضرور آتی ہے جس سے زبان پر منفی اثرات پڑ سکتے ہیں۔ ان امور پر اردو داں طبقے کو فکر مند ہونے کی ضرورت ہے اور حکومت کو بھی ان چیزوں پر روک لگانی چاہیے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریاں ہیں اور وہاں کون کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں چھوٹی بڑی پانچ لائبریریاں ہیں جن میں اردو کتب کے ساتھ ساتھ دیگر علوم وفنون کی کتابیں بھی اچھی تعداد میں موجود ہیں۔ علاوہ بریں وادیِ کشمیر میں مقامی اخبارات کی زیادہ تعداد دو تین کو چھوڑ کر اردو زبان میں ہی ہے جن میں کشمیر عظمیٰ، سرینگر ٹائمز، تعمیل ارشاد۔ چٹان، وادی کی آواز، عقاب، مشرق، انقلاب، آفتاب وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ رسائل کی بھی اچھی خاصی تعداد جن میں اردو دنیا، آج کل، شیرازہ (سرینگر)، خواتین دنیا، ایوان اردو کے ساتھ ساتھ جدید ٹیکنالوجی میں آن لائن بھی بہت سارے رسائل وجرائد دستیاب ہوتے ہیں جن سے استفادہ لیا جا سکتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں تین انجمنیں اور ادارے ہیں جو اردو ادب کی ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں، لیکن وہ نہ ہونے کے برابر ہیں، ان سبھی اداروں کا کام ایک ہی نہج پر ہو رہا ہے وہ ہے اردو افسانوی ادب کی توسیع، اس کے علاوہ اِکا دُکا ادیب وشاعر جو منہ کا مزہ بدلنے کے لیے گاہے گاہے غزل کے اشعار تحریر کرتے ہیں۔ زیادہ تر تخلیقات ادب برائے ادب ہی ہوتی ہیں، زبان کی اشاعت وفروغ پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

ج: اس سوال سے آپ کو مایوسی ہی ملے گی کیونکہ میرے علاقے میں اردو سے جڑی دو تین شخصیات ہیں جنھیں علاقائی سطح پر تو شہرت حاصل ہوئی البتہ قومی لیول پر انھیں کوئی خاص مقام ومرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا بھی ناگزیر ہے کہ زمانہ حال میں کچھ نوجوان ادیب وشاعر اردو کی بہبودی کے لیے دن دونا رات چوگنا کام کر رہے ہیں جس سے اردو کی ترقی میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر اُن شخصیات کی وقتاً فوقتاً حوصلہ افزائی کی جائے تو آنے والے وقت میں ان کی خدمات کا اعتراف ملک اور بیرون ممالک میں ضرور کیا جائے گا۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

ج: میں اردو کا ایک طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ وادیِ کشمیر کے مختلف کالجوں میں درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا، آج کل میں اننت ناگ کے ایک کالج میں اگنو اردو کونسلر کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ میں طلبا کو سوشل میڈیا کے ذریعے اردو ادب سے وابستہ کچھ ضروری سوالات کے جواب دینے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہوں تاکہ طلبا اردو سے متعلق مکمل جانکاری حاصل کر سکیں۔ کالج کی درس و تدریس کے دوران میں داخلہ کمیٹی کا ایک ممبر بھی تھا تاکہ اردو بحیثیت سبجکٹ کے طور پر انتخاب کرنے والے طلاب کو مشاورتی کونسل کے ذریعے اردو زبان سے متعارف کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ بچے اردو میں داخلہ پائیں۔ اس کے علاوہ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ پنجاب جہاں سے میں پی ایچ ڈی کر رہا ہوں وہاں سکھ مذہب سے تعلق رکھنے والے میرے عزیز دوست مجھے اردو پڑھتے وقت سب سے پہلے یہ پوچھتے تھے کہ یہ کون سی بھاشا ہے۔ میرا جواب ہوتا کہ اردو، بس اتنا سننے کے بعد اردو زبان کی اسلوب نگارش سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ بس اتنا کہنے کے بعد وہ چپ ہو جاتے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہتے، ہمیں بھی اردو زبان سیکھنی ہے۔ میں نے اپنی سطح پر بہت سارے لوگوں کو اردو کے حروف تہجی کے بارے میں تعارف دیا ہے اور نہ جانے کتنے طلبا اردو زبان کی چاشنی سے مالا مال ہو گئے۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: اردو زبان خالص ہندوستانی زبان ہے اور اسے محبت کی زبان بھی کہا جاتا ہے۔ اردو کی فلاح و بہبود کے لیے اُنجمنوں اور اداروں کا ہونا ضروری ہے۔ ملکی سطح پر اس کے تحفظ کے لیے کوئی ٹھوس پالیسی مرتب کرنی چاہیے۔ اردو زبان کو مقتضائے وقت کے ساتھ جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ کرے۔ ملک کی مختلف دانش گاہوں میں فاصلاتی تعلیمی نظام کو رائج کریں۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی اسکولوں میں پڑھانے کے عمل کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جانے چاہیے۔ ملک کے ہر اُس حصے میں اردو میڈیم اسکول قائم کیے جانے چاہیے جہاں اردو بولنے والی آبادی زیادہ ہو، تاکہ روزگار کے زیادہ مواقع مہیا ہو سکیں۔ ملک کے مختلف اداروں سے اردو کی ترقی کے لیے جو مالی امداد دی جاتی ہے اس پر نظر بنائے رکھے کہ کیا بھیجی گئی امداد اردو کی بہبودی کے لیے خرچ کی جاتی ہے یا نہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں سمیناروں، مشاعروں، جلسے، طلبا کے لیے تحریری وتقریری مقابلے اور توسیعی لکچروں کو لازمی بنائے تاکہ طلبا وطالبات کے اندر چھپی صلاحیت ولیاقت کو منظر عام پر لانے کا ایک پلیٹ فارم تیار ہو سکے، جس سے ہر کوئی اسٹیج پر آ کر اپنی اہلیت کا ثبوت پیش کر سکے۔ اس کے علاوہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں درخواستیں قبول ہونی چاہیے۔ اردو اکیڈمی کو مزید فعال بنایا جائے۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟

ج: اردو ہمارے ملک کی وہ واحد زبان ہے جو ہمیشہ عصری تقاضوں کے ساتھ مطابقت رکھتی رہی ہے۔ اردو کا رسم الخط یوں تو فارسی وعربی سے ماخوذ ہے جو دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہیں، لیکن اردو نے جب اس رسم الخط کو اپنایا تو اس کا حسن متعدد اوصاف سے مزین ہوا۔ اردو رسم الخط کے تحفظ کی اولین ذمے داری اردو والوں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان اردو میں تعلیم دلائیں۔ مشاہیر علم ودانش کے اقوال جلی اور خوش خط تحریر کی صورت میں سرکاری ونجی اداروں میں دیواروں پر آویزاں رکھنے چاہیے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اردو رسم الخط کی بقا کے لیے طلبا کے درمیان خوش خط وتحریری پروگرام منعقد کیے جانے چاہیے۔ سیمناروں، مشاعروں اور دیگر ادبی مقابلوں کی کارروائی اردو میں قلمبند ہونی چاہیے۔ کسی دوست یار شتے دار کو شادی پر بلانے کے لیے اردو میں دعوت نامہ دیں۔ عزیز واقارب کی موت کے وقت سانحہ ارتحال کے کلمات بھی اردو میں بیان کریں۔ کمپوٹر میں اردو سافٹ ویئر کے فوائد اور اس کے استعمال سے بچوں کو متعارف کرائیں۔ موبائل فون پر سوشل میڈیا کا استعمال کرتے وقت کسی پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے صرف اردو کا استعمال کریں۔ یہی چیزیں زبان اور رسم الخط کے لیے کامیابی کی ضامن ہوسکتی ہیں۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: اس سے پہلے بھی میں عرض کر چکا ہوں کہ اردو کے فروغ میں دوسری علاقائی زبانوں کا اثر براہ راست نہیں پڑ سکتا اور نہ ہی اردو کا ارتقائی سفر رک سکتا ہے۔ میرا تعلق چونکہ وادیِ کشمیر سے ہے اور یہاں کشمیری زبان کے ہوتے ہوئے اردو نے سب سے زیادہ ترقی کے در وا کیے۔ اردو چونکہ آج کل پورے عالم پر چھائی ہوئی ہے اور اس کی گونج دنیا کے مختلف کونوں میں سنائی دیتی ہے۔ اس عالمگیر سطح پر اپنی پہچان بنانے اور ہر دلعزیز بننے والی زبان دنیا میں صرف اردو ہوسکتی ہے جسے دوسری علاقائی زبانوں کے ہوتے ہوئے ترقی کی راہ سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی اجنبی ملک یا ریاست میں جا کر دو اجنبی آپس میں ٹھیٹھ گفتگو کر سکتے ہیں جب دونوں کے مابین رابطے کی زبان ہوگی۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے اردو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کی جاتی ہے تاکہ دونوں کا مافی الضمیر واضح ہوجائے۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: جی ہاں الحمدللہ! میری والدہ کے علاوہ میرے گھر کے سبھی افراد اردو زبان وادب میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ خاص کر میرے چار بھائی اور میری شریک سفر جس نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) سے حال ہی میں اردو میں پوسٹ گریجویشن کی ڈگری حاصل کی ہے۔ گھر میں اردو کا اچھا خاصا ماحول ہے اور اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے میں گھر میں چھوٹے بچوں کو اردو کی طرف رغبت دلانے میں سعی جمیل کرتا رہتا ہوں۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: ان شاء اللہ میرے گھر میں اردو زندہ ہے اور ہمیشہ گل سر سبز کی طرح پھلتی اور پھولتی رہے گی۔

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

ج: اس حوالے سے میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ پنجاب کی سنٹرل لائبریری کا حال بیان کرنے جا رہا ہوں بشرطیکہ مکڑی کے وہ جالے میرے شعور کی گرفت میں آسکیں۔ جب میں پہلی بار لائبریری میں داخل ہوا تو دائیں بائیں دیکھ کر ایک کرسی کونے میں خالی تھی میں وہاں جا کر بیٹھ گیا اور ساتھ لائی ہوئی سیرت کی کتاب کھولی۔ میں اُن دنوں قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی کتاب 'رحمۃ للعالمین' کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جوں ہی مجھے آس پاس کے طلبا نے کسی اجنبی زبان کا مطالعہ کرتے دیکھا، تو اردو کا نام سن کر اُن کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑنے لگی۔ بعد میں وہ مجھ سے اپنا نام، ماں باپ کا نام اور گاؤں کا نام اردو میں لکھوا کر مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ وہاں کے دکاندار مجھ سے اردو زبان میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھواتے تھے۔

بہرکیف غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے ملک کی سبھی دانش گاہوں میں اردو آن لائن وآف لائن کورسز کو عمل میں لایا جانا چاہیے جو فروغ اردو کے لیے سود مند ثابت ہوں گے۔ اس کے علاوہ سمیناروں اور مشاعروں میں بغیر کسی جانب داری کے ہر ایک کو دعوت دینے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اردو زبان کی لطافت سے محظوظ ہوسکیں اور زبان سیکھنے کا مقصد بھی حاصل ہو سکے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھانے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: ہمارے علاقے اننت ناگ میں 9 کالجز اور ایک یونیورسٹی جسے ساؤتھ کیمپس کہا جاتا ہے، ہر کالج اور یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کالجز میں اردو سے وابستہ طلاب کی اچھی خاصی تعداد بھی ہے۔ رہی بات اساتذہ کی جو اردو کی درس وتدریس میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ میں خود گورنمنٹ ڈگری کالج کوکرناگ میں چار سال تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ اساتذہ کی صحیح تعداد کا تعین نہیں ہوسکتا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے کالج میں اردو پڑھانے والوں کی تعداد 3 تھی۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

ج: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں اور اداروں سے اردو کی اشاعت وترویج کے لیے بہت سارے اقدام اُٹھائے جا سکتے ہیں۔ جن میں سب سے پہلے اردو طلبا کے لیے مفت تعلیم کا انتظام کروا سکتے ہیں، جس میں کتابیں، وردی وغیرہ بھی دی جا سکتی ہے، کالجوں میں پسماندہ اور دور دراز سے آنے والے بچوں کے لیے ہوسٹل وغیرہ کی سہولیت دستیاب ہو۔ اردو کی ترویج واشاعت کے لیے ٹی وی چینلز کا اہتمام کیا جا سکتا ہے جس سے طلبا گھر بیٹھے اردو کے متعلق پروگرام دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ٹی وی چینلز پر ہفتے میں ایک دن اردو زبان کے متعلق خصوصی گفتگو کا عمل بھی شروع کر سکتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں سمیناروں، جلسوں اور دیگر تربیتی پروگراموں کا انعقاد بھی کیا جا سکتا ہے۔ امتحان میں سب سے نمایاں کارکردگی دکھانے والوں کے لیے نقدی امداد یعنی وظیفے کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ دور دراز گاؤں یعنی شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب بچوں کے لیے اردو اسکول قائم کر سکتے ہیں۔ لائبریریوں میں اردو کتابوں کے ساتھ اردو اخبارات اور رسائل وجرائد کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے دور میں اسکولوں اور کالجوں میں مفت انٹرنیٹ کی سہولیات بھی دستیاب ہوں۔

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ج: جی ہاں! بالکل ہے اُن اسکولوں میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ہمارے ضلع اننت ناگ میں سینٹرل اور نوودے ودیالیہ کے علاوہ ایک آرمی گڈ ول اسکول، دہلی پبلک اسکول بھی ہے جہاں اردو کی معقول تعلیم بچوں کو دی جاتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں کوئی ایسا اسکول نہیں ہے جہاں اردو کی درس وتدریس نہیں ہوتی ہے۔

■

Manzoor Ahmad Ganie
R/o: Hussan Pora Bagh
Bijbehara - 192124
Distt.: Anantnag (J&K)
Mob.: 6005903959
Email.: mganie283@gmail.com

ڈراما انارکلی میں ڈرامائی کنایہ

م ان سعید

ڈرامائی کنایہ اسٹیج ڈراموں کا ایک فنی حربہ ہے جس سے ڈراما نگار ڈرامے کی پیش کش کے دوران آئندہ پیش آنے والے واقعات کے تعلق سے ناظرین کے دلوں میں تجسس، اشتیاق اور امید و بیم کے جذبات کو متحرک رکھنے اور ڈرامے میں دلچسپی جگائے رکھنے کا کام لیتا ہے۔ ڈرامائی کنایہ اپنی سرشت میں ڈرامے میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کا ایک ایسا معنی خیز اشارہ ہوتا ہے جو انجام تک پہنچتے پہنچتے اپنے بھرپور معنی کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔ ڈرامائی کنایہ بالعموم کسی کردار کی زبان سے قدرے رواداری میں اس طرح ادا ہوتا ہے کہ اس لمحے میں اس کی پوری اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن ایک ذہین ناظر کے دل میں ایک ہلکی سی کھٹک چھوڑ جاتا ہے۔ کبھی کبھی ڈرامائی کنایہ ادا کرنے والا کردار آپ بھی اپنے مکالمے کی پوری حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اکثر یوں بھی ہوا ہے کہ ڈرامائی کنایہ کسی کردار کی گہری سوچ کے بطن سے برآمد ہوتا ہے اور آئندہ واقعات کی معیّن سمت کا بادنما ثابت ہوتا ہے۔ حالانکہ ڈرامائی کنایہ ڈرامے کے آئندہ واقعات کی مبہم پیشن گوئی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ پیشن گوئی شعوری طور پر کی گئی ہو۔ اکثر صورتوں میں یہ پیشن گوئی اس ہنرمندی سے کی جاتی ہے کہ ڈرامائی کنایہ ادا کرنے والے کردار بھی اس کے حقیقی مفہوم سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اس کی دانست میں اس اشارے کے بدیہی معنی ہوتے ہیں لیکن ایک ذہین قاری یا ناظر اس کے مطلوبہ معنی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ ڈرامائی کنایے کو جو شخص سمجھ جائے، اسے کنایے کی تعبیر دیکھنے کا اشتیاق، ڈرامے کے انجام تک ڈرامے سے پیوست کیے رکھتا ہے اور جو نہ سمجھے اس کے لیے بھی یہ جزوی طور پر ناقابلِ فہم اشارہ ایک ایسا اسرار بن جاتا ہے جس کو ڈرامے کے انجام میں آشکار دیکھنے پر اس کا تجسس بڑھتا جاتا ہے۔

ڈرامائی کنایہ ڈرامہ نگاری میں کسی مطلق حیثیت کا حامل نہیں ہوتا لیکن کسی ڈراما کی ڈرامائیت کو فزوں تر کرنے کا سبب ضرور بن جاتا ہے۔ درحقیقت ایک ڈراما نگار اس فنی حربے کا استعمال وہیں کرتا ہے جہاں وہ نہ صرف اپنے ڈرامے کا فنی مرتبہ بلند کرنا چاہتا ہے بلکہ ناظر کے تجسس و اشتیاق کو ڈرامے کے انجام تک برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اکثر ڈرامائی کنائے غزل کے کسی مقبول شعر کی طرح یادداشت میں محفوظ ہو جاتے ہیں اور ضرب المثل کی طرح بروقت کسی صورتِ حال پر منطبق کرنے میں کام آ جاتے ہیں۔

شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں بالعموم اور ڈراما میکبتھ میں خصوصاً ڈرامائی کنایے کا بے حد برمحل اور پُرمعنی استعمال کیا ہے۔ چڑیلوں کی زبان سے ادا ہونے والا مکالمہ fair is foul and foul is fair، کے علاوہ ڈنسنین کے جنگل کا حرکت میں آنا یا فطری ولادت کے حامل شخص کا میکبتھ کو ہلاک کرنے کی قدرت نہ رکھنا وغیرہ وہ ڈرامائی کنایے ہیں جو ادا ہوتے ہیں تو کچھ بے موقع اور ناقابلِ فہم سے معلوم ہوتے ہیں اور جب ان کی کارفرمائی شروع ہوتی ہے تو اچانک یادداشت پر ابھر آتے ہیں اور کیف آور ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بھرپور معنویت کا جلوہ دکھا جاتے ہیں۔

ایک اعتبار سے ڈرامے میں ڈرامائی کنایے کی وہی حیثیت ہے جو غزل میں صنعتِ ایہام کی ہے یعنی اس میں ایک معنیِ قریب ہوتے ہیں اور ایک معنیِ بعید۔ ڈراما نگار کا اصل مقصود معنیِ بعید ہے۔ جب یہ معنیِ بعید ڈرامے کے کسی موڑ پر اچانک ظہور کرتے ہیں تو ناظر کے حافظے میں محفوظ وہ موقع چمک اٹھتا ہے جب وہ کنایہ پہلی بار ادا کیا گیا تھا۔ ایک ناظر اس کنایے کے مضمرات کے واشگاف ہوتے ہی اس کا اصل مفہوم سمجھ جاتا ہے اور یہ انکشاف اسے ایک خاص جمالیاتی مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔ ڈرامے کا ذہین ناظر بھی اس کی پہلی ادائیگی میں کسی قدر اس کی اہمیت کو تاڑ کر قیاس آرائی کرتا رہتا ہے کہ آئندہ واقعات کون سا رخ اختیار کر سکتے ہیں۔

ڈرامائی کنایے کے محلِ استعمال کے کوئی متعین قاعدے نہیں ہیں۔ اس لیے اس کا اظہار کنایے کو ادا کرنے والے کردار کی اس سے واقفیت یا لاعلمی دونوں ہی صورتوں میں ممکن ہے۔ لیکن اس ڈرامائی کنایے کا معیار بلند ہے جس کا اظہار کردار کی لاعلمی میں ہوا ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ واقف ہے تو اس ڈرامائی کنایے کو بروئے کار لانے والے آئندہ واقعات کا برملا اعلان کر رہا ہوگا۔ اس سے ڈرامے میں تجسس کا پہلو متاثر ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ناواقف ہے تو واقعات کا ایک موڑ کسی قدر سمجھ میں آ جائے گا لیکن اس موڑ تک پہنچانے والے مراحل سے واقفیت نہیں ہوگی۔ ایسی صورت میں مشتاق ناظر کا تجسس اور گہرا ہو جائے گا۔

ڈرامائی کنایہ ڈرامے میں اسی وقت آ سکتا ہے جب تصادم ہو چکا ہو۔ بالعموم ڈرامے کی بنیاد کسی نہ کسی نزاع پر ہی رکھی جاتی ہے جو نقطۂ عروج یا کلائمکس پر ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اس سے قبل اس کی شکلیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ جب تک کرداروں کے مفادات کا ٹکراؤ نہ ہو، ڈرامائی کنایے کے لیے گنجائش نہیں نکلتی، یعنی ڈرامائی کنایہ تصادم کا مرہونِ منّت ہوتا ہے۔ تصادم کے نتیجے میں کرداروں کا ردِ عمل ڈرامائی کنایے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ڈرامائی کنایے کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ اس کا اظہار مرکزی کردار ہی کریں۔ اسے ایسے ضمنی کردار بھی ادا کر سکتے ہیں جن کی اہمیت ڈرامے کے واقعات اور کشمکش میں قابلِ ذکر نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بھی کلیہ نہیں ہے۔ ڈراما نگار موقع و مناسبت دیکھ کر واقعات کے کسی موڑ پر ڈرامائی کنایہ ادا کر سکتا ہے۔

ڈرامائی کنایے کے اظہار کے لیے ڈرامے میں کسی خاص مقام کی تخصیص نہیں ہے۔ ڈرامے کے پھیلے ہوئے کینوس میں ڈرامائی کنایے کے لیے نشیب و فراز کو مدِ نظر رکھ کر کہیں بھی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ بلکہ زیادہ درست طور پر اس کے لیے گنجائش نکل آتی ہے۔ اس لیے کہ ڈرامائی کنایے کے حامل مکالمے کے لیے بے ساختہ اور فطری ہونا لازم ہے۔ یہ اسی وقت مؤثر ہو سکتا ہے جب یہ محسوس ہو کہ ڈرامائی کنایہ بروقت وارد ہو گیا ہے۔ عام طور پر اس فطری پن کے لیے اس کی حیثیت بات میں سے بات نکل

آنے کی ہوتی ہے۔ایسے ڈرامائی کنایے میں 'آمد' کا احساس ہوتا ہے 'آورد' کا نہیں۔

دوسری شکل کسی کردار کی جذباتی کشمکش کے اظہار کی صورت میں پائی جاتی ہے۔وہ اپنی کشمکش کا اظہار حالیہ واقعات کے ردِعمل کے طور پر کررہا ہوتا ہے، لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس کا اطلاق اس کے مستقبل پر بھی حرف بہ حرف مگر دوسری شکل میں صادق آجائے۔ یہ ڈرامائی کنایہ ذہین سے ذہین ناظر یا قاری کی بھی رہنمائی نہیں کر سکتا، لیکن جب ڈراما انجام پر پہنچ جائے تو قاری کا ذہن چونک کر پیچھے کی طرف لپکتا ہے اور اس کنایے کو گرفت میں لے لیتا ہے۔یعنی اس کنایہ کی حیثیت رجعی ہوتی ہے۔ کنایہ کا بنیادی مقصد پیشن گوئی ہے جو قاری کے ذہن میں آئندہ واقعات کا ایک ہیولا سا پیدا کردے۔ لیکن اس مخصوص صورت میں ڈرامائی کنایے کو سمجھنے کے لیے ڈرامے کے کسی موڑ کا مرہونِ منت ہونا پڑتا ہے اور انجام معلوم ہوجانے کے بعد ذہن، ماضی میں مراجعت کر کے اس اشارے کو اچانک پہچان لیتا ہے۔

مختصراً ڈرامائی کنایے کو یک ایسا 'قصراہ' (short cut) کہا جاسکتا ہے جو ناظر کو ڈرامے کے آئندہ واقعات کا کسی قدر ادراک کر لینے کے قابل بنا دیتا ہے۔

اردو کے مشہور ڈرامے انارکلی میں ڈرامائی کنایے کی کارفرمائی کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔امتیاز علی تاج نے جب ڈراما انارکلی لکھا تو وہ مغربی ڈراموں کی فنی روایات سے کماحقہٗ آگاہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے ڈراما انارکلی میں عالمی ڈراموں کے فنی تقاضوں کو برتنے کی کامیاب کوشش کی۔لیکن تاج کے حینِ حیات انارکلی کے اسٹیج ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ تاج نے انارکلی کے دیباچے میں صاف لکھا ہے کہ''اس کی موجودہ صورت میں تھیٹروں نے اسے قبول نہ کیا۔جو مشورے ترمیم کے لیے انھوں نے پیش کیے، انھیں قبول کرنا مجھے گوارا نہ ہوا۔'' اس کی صاف وجہ یہی نظر آتی ہے کہ ڈرامے کے مناظر میں انھوں نے ساز وسامان کی جو تفصیل پیش کی ہے، اسے منظر بہ منظر پردہ اٹھنے اور گرنے کے وقفے میں تبدیل کرنا ممکنات میں نہیں تھا۔ انارکلی کے مکالموں کی نستعلیق زبان اور اس کی ادبیت بھی غالباً عوامی اسٹیج کے لیے حوصلہ شکن تھی۔لیکن انارکلی اسٹیج کے لیے لکھا گیا ہو یا مطالعے کے لیے، فنی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا دونوں صورتوں میں ناگزیر تھا۔اسی لیے امتیاز علی تاج نے انارکلی میں ڈرامائی کنایوں کا خاص اہتمام کیا ہے جو ڈرامے کی فنی توقیر میں اضافے کا باعث بن گئے ہیں۔

انارکلی میں موقع بہ موقع ڈرامے کا فنی رتبہ بلند کرنے کے لیے بہت سے ڈرامائی کنایوں کا استعمال ہوا ہے۔یہ ڈرامائی کنایے ڈرامائی تاثر کو گہرا کرنے میں بہت کامیاب ہیں۔انھیں کی وجہ سے ڈرامے میں تجسس کا عنصر وافر مقدار میں ملتا ہے جو ڈرامے کے ربط اور تسلسل میں کمی آنے نہیں دیتا اور دلچسپی کو جگائے رکھتا ہے۔

ڈراما انارکلی کا پہلا ڈرامائی کنایہ پہلے ہی منظر میں دلارام کی زبانی ادا ہوا ہے۔دلارام کی غیر حاضری میں انارکلی اکبر کی منظورِ نظر کنیز بن گئی ہے جو دلارام کے لیے گہرے صدمے کا باعث ہے۔حالات نے انارکلی اور دلارام کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا ہے اور یہی تصادم کی اوّلین وجہ بن جاتی ہے۔دلارام اور اس کی سہیلیاں اس سنگین صورتِ حال پر سرگوشیوں میں مصروف ہیں اور جب عنبر اس سے پوچھتی ہے کہ''دم خم باقی ہے کہ دب رہوگی؟''تو دلارام براہِ راست جواب دینے کے بجائے کہتی ہے۔

1 ''ناگن کی دم پر کوئی پاؤں رکھ دے تو وہ کیا کیا کرتی ہے؟''

یہ ڈرامائی کنایہ قاری یا ناظر کو چوکس کردیتا ہے۔وہ متجسس ہوجاتا ہے کہ دلارام آخر کون سا قدم اٹھائے گی جو نہ صرف غیر متوقع ہوگا بلکہ کسی قدر خوف میں مبتلا کرنے والا بھی ہوگا۔یہ اشتیاق اسے دلارام کی حرکات وسکنات کو خاص توجہ سے دیکھتے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔اسی ڈرامائی کنایے سے انارکلی میں تصادم کا ماحول بھی قائم ہوتا ہے۔ ڈرامے کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے یہ بڑا کارگر فنی حربہ ثابت ہوتا ہے۔

دلارام کو سلیم اور انارکلی کے عشق کی خبر ہو چکی ہے اور چاندنی رات میں باغ میں ان کی ملاقات کی اطلاع بھی مل گئی ہے۔ایک موقع شناس عورت کی طرح وہ اس موقع کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کے منصوبے بناتی ہے۔وہ چاہتی ہے کہ اس ملاقات کے موقع پر خود کو ظاہر کر کے انارکلی کو گویا متنبہ کردے کہ وہ دلارام کے راستے سے ہٹ جائے کیوں کہ وہی دلارام کے ستارے کے زوال کی ذمے دار ہے۔دلارام کو پورا یقین ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو مات دے سکتی ہے۔اس کے باوجود معاملہ ولی عہد شہزادے کا ہے۔ بساط الٹ بھی سکتی ہے۔ اس لیے وہ تذبذب کے عالم میں کہتی ہے کہ

2 ''آج رات دو تارے ٹکرائیں گے... کیا خبر کون سا ٹوٹے!''

اپنی تمام تر منصوبہ بندی کے باوجود اسے پورا یقین نہیں ہے کہ اس کے اور انارکلی کے ستارے آج رات ٹکرائیں تو کون سا ستارہ ٹوٹے گا۔اسی لیے وہ کچھ توقف کے بعد کہتی ہے... ''کیا خبر کون سا ٹوٹے۔''دلارام کے تذبذب سے بات واضح ہوتی ہے کہ اس نے حالات کو ابھی ایسا موڑ نہیں دیا ہے کہ واقعات پر اسے پورا اختیار حاصل ہوجائے۔ابھی وہ خالی ہاتھ ہے لیکن پانے کی تدبیر کررہی ہے۔

اس منزل پر قاری چوکنا ہوجاتا ہے۔اسے یقین ہوجاتا ہے کہ دالارام ملاقات کے موقع پر کچھ کرے گی ضرور۔مگر کیا کرے گی یہ چیز اسے مضطرب کیے رکھتی ہے۔اسے خبر نہیں کہ تارا واقعی کون سا ٹوٹے گا۔یہ مختصر سا فقرہ ناظر کی دل چسپی اور تجسس کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

انارکلی اور سلیم کی ملاقات کے دوران دلارام دخل انداز ہوجاتی ہے۔وہ جانتی ہے لوہے پر اسی وقت ضرب لگانی چاہیے، جب وہ نرم ہو ورنہ اس کی ہر ضرب بے نتیجہ ہی نہیں نقصان رساں بھی ہوسکتی ہے۔اس لیے وہ بے دھڑک مداخلت کردیتی ہے۔سلیم فوراً چھپ جاتا ہے لیکن دلارام انارکلی کو سراسیمگی کے عالم میں پکڑ لیتی ہے۔دونوں کی بات چیت کے دوران وہ انارکلی سے واضح لہجے میں کہتی ہے کہ:

3 ''میں جانتی ہوں۔اس راز کی قیمت بھی جانتی ہوں، وہ بازار بھی جانتی ہوں جہاں یہ فروخت ہوسکتا ہے۔ہاں میں اس کی قیمت بھی مقرر کرچکی ہوں''

اب وہ طے کرچکی ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔اسے یقین ہوگیا ہے کہ اس سے ٹکرانے والا تارہ ٹوٹ چکا ہے۔ سلیم کے ولی عہد ہونے کے باوجود انارکلی کی قسمت کی باگ دلارام کے ہاتھ میں آچکی ہے۔انارکلی کا انجام دلارام ہی کی مرضی پر منحصر ہوگا۔

اس کنایے میں دلارام کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ اہم اور گہرے معنی لیے ہوئے ہے۔ وہ واضح اعلان کردیتی ہے کہ اسے اس راز کی قیمت معلوم ہوچکی ہے۔ اس کے بعد وہ قیمت مقرر بھی کرچکی ہے۔شاید دلارام اس وقت تک اپنے ذہن میں انارکلی کی موت کو روشن شکل میں یقین کے ساتھ دیکھ چکی تھی، جبھی وہ قیمت مقرر کیے جانے کا اعلان اس قدر پر اعتماد لہجے میں کررہی ہے۔ راز کو بیچنا اس کے اختیار کی بات ہے اور اسے اس بازار کی بھی خبر ہے جہاں یہ بیچا جاسکتا ہے۔فقط موقع کا انتظار ہے۔آخر کار وہ لاہور کے شیش محل میں اسے اکبرِ اعظم کے ہاتھوں بیچ دیتی ہے کہ اس راز کی سب سے بڑی قیمت وہی دے سکتا تھا یعنی انارکلی کی موت۔

انارکلی سے ملاقات کا راز فاش ہوجانے کے بعد سلیم دلارام کو طلب کرکے اس سے اس راز کی قیمت جاننا چاہتا ہے۔دلارام کسی مادّی فائدے کی طالب نہیں، سلیم کی محبت چاہتی ہے۔سلیم اس کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے اور

اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر وہ کبھی انارکلی سے سلیم کی محبت کا راز فاش کرنے کی کوشش کرے گی تو اسی پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ وہ سلیم سے محبت کرتی تھی اور ناکامی نے اسے انتقام لینے پر آمادہ کردیا۔

اس موقعے پر بختیار ظاہر ہوکر اعلان کرتا ہے کہ اگر کبھی ایسا موقع آجائے تو وہ گواہی دے گا کہ دلارام نے سلیم سے اظہارِ محبت کیا تھا۔ یہ موڑ دلارام کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ گھبرا جاتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسا گواہ موجود نہیں جو سلیم اور انارکلی کی محبت کی شہادت دے سکے۔

یعنی اس بساط میں وہ سلیم سے مات کھا جاتی ہے۔ سلیم مطمئن ہوکر بختیار سے کہتا ہے کہ ''تم نے مجھے ہر خطرے سے، محفوظ کردیا۔'' لیکن دوراندیش بختیار دلارام کی فطرت سے بہتر طور پر واقف ہے۔ اسی لیے وہ سلیم کو خبردار کرتا ہے کہ

4 ''ایک چال کا جواب دے دینے سے بازی کا فیصلہ نہیں ہوجاتا۔ حریف اور چال سوچ لے گا۔''

یہ کنایہ بے حد معنی خیز ہے۔ سلیم شاہانہ خودفریبی کے باعث اپنی حریف دلارام سے غافل ہوجاتا ہے۔ اس تغافل سے فائدہ اٹھا کر دلارام واقعی نئی منصوبہ بندی کرلیتی ہے اور انارکلی کو موت کے حوالے کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ اس ڈرامائی کنایے کے بعد ناظر دلارام کی حرکات وسکنات پر خاص توجہ دینے لگتا ہے۔

5 ''اس محل میں میں زندہ نہ بچوں گی۔ اس کی دیواریں ہر وقت میری طرف بڑھتی آرہی ہیں۔ کسی روز ٹکرائیں گی اور مجھے پیس ڈالیں گی۔''

یہ ڈرامائی کنایہ انارکلی کا غالباً سب سے بہترین کنایہ ہے۔ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے شاید انارکلی کے ذہن میں ان دیواروں کا تصوّر بھی نہ ہوگا جن میں زندہ دفن کردی گئی۔ انارکلی جس صورتِ حال سے دوچار ہے اس کا اظہار وہ استعاراتی پیرائے میں کررہی ہے۔ لیکن یہ استعارہ زندہ حقیقت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ یہ دیواریں مفادات کی دیواریں بھی ہوسکتی ہیں جن کے تصادم میں انارکلی پس کر رہ گئی۔ اکبر کا مفاد، دلارام کا مفاد، سلیم کا مفاد، ثریا کا مفاد، رانی کا مفاد، انارکلی کی ماں کا مفاد، داروغۂ زنداں کا مفاد، یہ تمام مفادات کسی نہ کسی تقریب سے انارکلی سے ٹکرا کر اس کی زندگی کے تمام راستے مسدود کردیتے ہیں۔ انارکلی ان اندھی دیواروں کے درمیان واقعی پس کر رہ جاتی ہے۔

سلیم سے ٹھکرائے جانے کے بعد دلارام انارکلی سے مل کر محبت کی شکست کا جھوٹا اعتراف کرچکی ہے اور اپنی محبت سے گویا تائب ہوکر انارکلی کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرلیتی ہے۔ وہ انارکلی پر واضح کردیتی ہے کہ وہ اس کی محبت کے راستے سے ہٹ چکی ہے اور انارکلی متاثر ہوکر اس کی نام نہاد محرومی میں شریک ہوجاتی ہے۔ لیکن ثریا دلارام کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ ہے اور اس کی عیّاری کو خوب سمجھ رہی ہے۔ وہ انارکلی کے ہمدردانہ رویے سے پریشان ہے اور آخرکار ضبط کا دامن چھوڑ کر دلارام سے صاف کہہ دیتی ہے کہ وہ اس کی چالبازیوں کو خوب جانتی ہے۔ وہ اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ

6 ''اگر تم شعلہ ہو تو میں بجلی ہوں۔ اگر مجھے شبہ بھی ہوا کہ تم کوئی چال چل رہی ہو، کسی ادھیڑ بن میں لگی ہو تو تم جانتی ہو مجھے کیا کچھ معلوم ہے۔ یہ بجلی تمھیں پھونک کر راکھ کردے گی۔''

یہ ڈرامائی کنایہ بالکل واضح اور کھلا ہوا ہے۔ انجام کار ثریا ہی کی ترغیب سے سلیم دلارام کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

7 ''جشن ہی کے روز دو تارے ... وہی دو تارے... مگر ایک دمکتا اور جگمگاتا ہوا اور دوسرا ٹوٹ کر بجھا ہوا... اور کون جانے...''

دلارام یہ ڈرامائی کنایہ شیش محل کے جشن کا انتظام سپرد کیے جانے پر ادا کرتی ہے۔ اس کنایے کے تیور بتا رہے ہیں کہ دلارام کے ارادے خوف ناک ہیں اور اسے پورا یقین ہے کہ یہی کچھ ہوکر رہے گا۔ جن تاروں کی پُر اسرار چال اس کے لیے مبہم تھی، یہاں واضح ہوجاتی ہے اور وہ پورے یقین سے کہتی ہے کہ ''ایک دمکتا اور جگمگاتا ہوا... اور دوسرا ٹوٹ کر بجھا ہوا۔'' لیکن اس کنایے میں ''ٹوٹ کر بجھا ہوا'' تو واضح ہے۔ مگر دمکتا اور جگمگاتا ہوا تارا کون ہوسکتا ہے یہ صاف نہیں ہے۔ چونکہ دلارام کا تصادم انارکلی سے زیادہ ہے اس لیے پہلا تارا دلارام ہی ہوسکتی ہے لیکن اسے صرف دمکتا ہوا ہونا چاہیے تھا۔ اس میں جگ مگاہٹ کا کوئی جواز نہیں پیدا ہوتا کیونکہ انارکلی کی موت کے بعد دلارام بھی بہرحال لپیٹ میں آجاتی۔

لاہور کے شیش محل میں جشنِ نوروز کی تیاریاں دلارام کے سپرد ہیں۔ وہ اس موقع کا بہترین فائدہ اٹھانا چاہتی ہے اور فیصلہ کن گھڑی کے لیے اسکیم تیار کرچکی ہے۔ متوقع واقعات کے اندیشے اسے خوف ناک حد تک سنجیدہ بنا چکے ہیں۔ اس جشن میں انارکلی رقص پیش کرنے والی ہے۔ جشن جاری ہے اور باہر آتش بازی ہورہی ہے لیکن وہ اپنے منصوبے کو قطعیت دینے میں منہمک ہے۔ وہ آئینوں کو ایسے زاویوں سے ترتیب دے رہی ہے کہ اکبر ان میں سلیم اور انارکلی کے اشاروں کو صاف صاف دیکھ سکے۔ آئینوں کی ترتیب کے موقع پر جب مروارید دلارام سے کہتی ہے کہ ''یہاں کیا کررہی ہو؟ چلو آتش بازی کا تماشہ دیکھیں'' تو دلارام بڑے سکون سے کہتی ہے۔

8 ''اس سے بہتر آتش بازی کچھ دیر بعد یہاں ہوگی۔''

دلارام کی نظر میں سلیم اور انارکلی کی بے محابا جسارت کا نظارہ کرنے کے بعد اکبر کے متوقع اشتعال کی آتش بازی باہر کی طفلانہ آتش بازی سے کہیں زیادہ دھماکہ خیز ہوگی۔ دلارام بڑے اعتماد سے کہتی ہے کہ ''اس سے بہتر آتش بازی کچھ دیر بعد یہاں ہوگی۔'' چونکہ ڈرامے کا ناظر دلارام کے ارادوں سے ناواقفِ محض ہے، اس لیے اس کا تجسّس جاگ اٹھتا ہے اور وہ دلارام کی پیشن گوئی کو بارآور ہوتے ہوئے دیکھنے کے لیے ہمہ تن متوجہ ہوجاتا ہے۔

9 ''ہندوستان کا نیا چاند ایک چکور کو چاہتا ہے۔''

یہ ڈرامائی کنایہ انارکلی کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ اس میں جو اشارہ مضمر ہے وہ صاف ہے۔ کم از کم اس فقرے میں انارکلی اس امر کا ثبوت دیتی ہے کہ وہ حقائق کا ادراک کرچکی ہے۔ اسے متوقع انجام کی خبر ہے۔ محبت میں پوری طرح وارفتہ ہوجانے سے پہلے وہ تھوڑا بہت ہوش مندی سے بھی کام لیتی ہے۔ لیکن جب اس پر محبت غالب آجاتی ہے تو ''میں نے جان بوجھ کر زہر کا پیالہ پیا۔ اس کا مزہ زندگی سے بھی میٹھا تھا۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟'' کہہ کر گویا عقل کی کثافت سے اپنی محبت کو پاک کردیتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ادراک حقیقت کرچکی ہے اور جانتی ہے کہ چاند کبھی اتر کر چکور سے مل نہیں سکتا۔ انجام معلوم!

ڈراما انارکلی کے ڈرامائی کنایے اس کے فنی مرتبے کو بلند کرنے کا باعث بن گئے ہیں۔ انارکلی کے ڈرامائی کنایوں کی اہمیت ہشت پہلو ہے۔ وہ ڈرامے میں اشتیاق وتجسس کی فضا جگائے رکھنے میں کامیاب ہیں۔ ان سے انارکلی کے ہموار واقعات میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ان کے کنایاتی پہلو کی وجہ سے ڈرامے کے بعض مکالموں میں تہ داری آگئی ہے جس سے وہ ڈرامے کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے ضامن بن گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کنائے کھل جانے کے بعد ناظر یا قاری کو ایک کیف آور جمالیاتی تسکین بہم پہنچانے کا مؤثر ذریعہ بن گئے ہیں۔

■

Prof. Meem Noon Sayeed
L/13, Sector 14, Near Water Tank
Jeevan Bima Nagar
Bangalore-560075 (Karnataka)
Ph:9845281751,
Email: profnooruddin@gmail.com

ساحر لدھیانوی کی شاعری میں پیکر تراشی

عرشیہ جبین

ساحر لدھیانوی اردو شعر و ادب میں اپنی ترقی پسند فکر کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ وہ ایک معروف گیت کار بھی رہے ہیں۔ انھوں نے ہندی فلموں کو بے شمار یادگار گیت دیے ہیں۔ ان کی شاعری میں اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں مزدوروں اور کسانوں کے جہاں غم خوار نظر آتے ہیں۔ وہ رومانی جذبات و احساسات کے شاعر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی شاعری میں اپنے تجربات و مشاہدات اور قلبی واردات کا بیان انھوں نے اپنے انوکھے انداز اور خوبصورت تشبیہات، استعارات اور صنعتوں کے استعمال سے کر کے حسین پیکر تراشے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ان کی ساحری زندگی کے حقیقی تجربات اور اس عہد کے سیاسی و سماجی مسائل کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔

ساحر کی شاعری میں شعری پیکر کی تلاش سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ پیکر کسے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر شہپر رسول پیکر کی تعریف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’پیکر ایک ایسی لسانی اور ذہنی تصویر ہے جس کے ذریعے شاعر اپنے نازک، نادر اور نایاب شعری تجربات کا اظہار کرتا ہے اور ان کو نکھارنے، سنوارنے، نیز روشن کرنے کا کام کرتا ہے۔ پیکر ایک ایسا الہامی نزول ہے جس کا زیادہ تر حصہ لاشعوری ہوتا ہے اور اس کا ورود اس لمحے یا اس کیفیت میں ہوتا ہے جب جذبات بام عروج پر ہوتے ہیں۔ یعنی شاعر کے پیدا و پنہاں جمالیاتی تخلیقی اور تجربوں کا عطر پیکر کہلاتا ہے۔‘‘

(ڈاکٹر شہپر رسول، اردو غزل میں پیکر تراشی: آزادی کے بعد، دہلی، 1999، ص 30)

اس تعریف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پیکر دراصل شاعر کے جذبات اور تجربات کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ پیکر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مرئی پیکر اور دوسرے غیر مرئی پیکر۔ مرئی پیکر سے مراد وہ پیکر جو نظر آتے ہیں مثلاً چراغ، بادل، آسمان،، افق، تلوار، شجر، زنجیر، چاند، سورج وغیرہ اور غیر مرئی پیکر سے مراد ایسے پیکر جو دکھائی نہیں دیتے۔ مثلاً عشق، عقل، روح، جنوں اور آرزو وغیرہ۔ ساحر کے یہاں مرئی اور غیر مرئی دونوں پیکر ملتے ہیں۔ دونوں کے ذریعے ساحر اپنے ذاتی جذبات و احساسات اور اپنے عہد کے حالات و تجربات کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ ہم ان پیکروں کے ذریعے اس مخصوص ماحول میں خود کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ساحر کے ہاں فضا، افق، چاند، بادل، پربت، زنجیر جیسے مرئی پیکر کی مثالیں ملتی ہیں جس کے خوبصورت استعمال سے شاعر نے اس عہد کے سیاسی قوانین، ظلم و ستم اور قتل و غارت گری کی بڑی عمدہ تصویر کشی کی ہے وہیں دوسری طرف مرئی پیکر کے ذریعے ساحر کے رومانی جذبات و احساسات کی حسین تصویریں بھی ہمارے سامنے رقص کرتی محسوس ہوتی ہیں چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے
افق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی

چاند مدھم ہے، آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

افق کے دریچے سے کرنوں نے جھانکا
فضا تن گئی راستے مسکرائے

دور وادی میں دودھیا بادل
جھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں

دل میں ناکام حسرتیں لے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں

غیر مرئی پیکر ہمارے ذہن کے پردے پر بنتے ہیں جنھیں ہم دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مثلاً خدا، جنت، جہنم، قیامت، میدان حشر اور روح وغیرہ۔ ساحر کے یہاں غیر مرئی پیکر کی مثالیں دیکھیے۔

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابن آدم نے
خدا گنوا کے جنوں آزما کے کیا پایا

سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روح تقدیس و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

انسانی جذبات و محسوسات کی تصویریں بھی ہمارے ذہن میں پیکر تخلیق کرتی ہیں۔ جس کا نہ تو مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُسے چھوا جاسکتا ہے مگر ضرورت پڑنے پر اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً، آرزو، امید، غم، خوشی، مستی، ہوا، نشہ وغیرہ۔ ساحر کے یہاں ایسے پیکر بھی ملتے ہیں۔ جن سے انھوں نے اپنے جذبات و احساسات کی حسین دنیا آباد کی ہے مثلاً یہ مثالیں دیکھیے۔

اے آرزو کے دھندلے خوابو جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پکارنے

سینے کے ویراں گوشوں میں اک ٹیس سی کروٹ لیتی ہے
ناکام امنگیں روتی ہیں، امید سہارے دیتی ہے

ان مرئی و غیر مرئی پیکر کے علاوہ ساحر کے یہاں ایسے پیکر بھی تخلیق ہوئے ہیں جو ہمارے احساس اور ادراک کو متاثر کرتے ہیں اور ان کا تعلق ہمارے حواس خمسہ سے ہوتا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری حسی اور ادراکی پیکر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’شعری پیکر کی سہل ترین تعریف یہ ہے کہ تجربے کے سیاق و سباق میں نقوش یا کیفیات کا مصور بیان ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے اور یہ کہنا بڑی حد تک درست بھی ہے کہ شعری پیکر جذبات اور احساسات کی باقیات کی تصویر کشی ہے یعنی جذبات، احساسات اور ارتعاشات ذہنی و روحانی کو رنگ آواز، یا خوشبو کے پیکر سے مربوط کیے بغیر انھیں اظہار کی گرفت میں لانا ممکن نہیں۔ شعری پیکر کا استعمال محض کمال فن کی دلیل نہیں بلکہ حقیقت کے

عرفان کا ایک بہت ہی لطیف اور موثر وسیلہ بھی ہے... شعری پیکر صرف مفرد الفاظ یا تراکیب کے دروبست سے ایک محرکانہ فضا ہی کو وجود میں نہیں لاتا بلکہ اس گنجینہ معنی کا طلسم بھی کھلتا ہے اور فنکار کی زندگی سے متعلق اپنے بنیادی رویے اور اپنے نظام اقدار کو بھی بسا اوقات پڑھنے والے تک پہنچاتا ہے۔ گویا شعری پیکر نظم یا غزل کے تاروپود میں ایک کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔''

(بحوالہ میر کی غزل میں پیکر تراشی از ڈاکٹر ابوالکلام عارف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2016، ص 48)

اس تعریف کے مطابق جب ہم ساحر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ساحر نے شاعری میں اپنی ذاتی زندگی کے تجربات و مشاہدات کی ایسی دلفریب تصویریں پیش کی ہیں کہ ان کے تجربات ان کے اپنے ہوتے ہوئے قاری ان احساسات سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ خصوصاً انھوں نے اپنے حواس خمسہ کے ذریعے ذہن کے پردے پر بننے والی تصویر یا امیج کو خوبصورت الفاظ اور عمدہ شعری محاسن کے ذریعے شعر کے قالب میں ڈھال کر دلکش شعری پیکر تخلیق کیے ہیں جن میں گنجینہ معنی کا طلسم کھل کر سامنے آتا ہے۔

ساحر کے یہاں حواس خمسہ سے متعلق تمام پیکر ملتے ہیں۔ مثلاً بصری، سمعی، شمومی، مذوقی اور لمسی۔ بصری پیکر سے مراد وہ پیکر ہیں جو کسی رنگ، شکل اور حرکت کے ذریعے ہماری بصارت کو متوجہ کرتے ہوں۔ ساحر کے کلام میں یہ پیکر بڑی خوبی سے ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے داخلی جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے اور کبھی خارجی تجربات و تصورات کے بیان کے لیے رنگ و نور اور اس کے تلازمات کا استعمال بڑی عمدگی سے کیا ہے اور ان رنگین پیکروں کے ذریعے اپنی امیدوں اور آرزوؤں کی بستی آباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے۔

اب رنگین رخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے
حجاب آلود نظروں میں ذرا بے باکیاں بھر دے

پھول چپکے سے چرالیں گے لبوں کی سرخی
یہ جواں حسن فضاؤں میں رہے گا صدیوں

صبح کے نور پہ تعزیر لگانے کے لیے
شب کی سنگین سیاہی نے وفا مانگی ہے

کہاں کا مہرِ منور کہاں کی تنویریں
کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی

جانے کب نکھرے سیہ پوش فضا کا جوبن
جانے کب جاگے ستم خوردہ بشر کی تقدیر

بصری پیکر کسی شکل سے متعلق بھی ہوتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی نے اپنے کلام میں ایسے بہت سے پیکر تخلیق کیے ہیں۔ جیسے اوس، شبنم، غبار، پھول، زمیں، موج، شاخ وغیرہ جن کی کوئی شکل ہے۔ اور ان متشکل پیکروں کے ذریعے قدرت کے حسن کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس طرح ہیں۔

جہاں جہاں تری نظروں کی اوس ٹپکی تھی
وہاں وہاں سے ابھی بھی غبار اٹھتا ہے
جہاں جہاں ترے جلووں کے پھول بکھرے تھے
وہاں وہاں دلِ وحشی پکار اٹھتا ہے

کہو کہ اب کوئی قاتل اگر اِدھر آیا
تو ہر قدم پہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی
ہر ایک موجِ ہوا رُخ بدل کے جھپٹے گی
ہر ایک شاخ رگِ سنگ ہوتی جائے گی

مذکورہ اشعار میں نظروں کی اوس، جلووں کے پھول، دلِ وحشی، موجِ ہوا، رگِ سنگ وغیرہ تراکیب کے ذریعے ایک نئی تصویر ابھرتی ہے جو ساحر کے مخصوص طرز فکر اور طرز احساس کا پتہ دیتی ہے۔

بصری پیکر میں لفظوں کے متحرک پیکر بھی آتے ہیں۔ ساحرلدھیانوی کی شاعری میں ان کے جذبات و احساسات کی بڑی متحرک تصویریں ملتی ہیں جو ساحر کے داخلی و خارجی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے۔

ہم کو تقدیر سے بے وجہ شکایت کیوں ہو
اسی تقدیر نے چاہت کی خوشی بھی دی تھی

آج اگر کانپتی پلکوں کو دیے ہیں آنسو
کل تھرکتے ہونٹوں کو ہنسی بھی دی تھی

اِدھر بھی خاک اڑی اُدھر بھی زخم پڑے
جدھر سے ہو کے بہاروں کے کارواں نکلے

اس طرف سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے
آج تک سلگتے ہیں زخم رہ گزاروں کے

ناز صدیقی نے ساحر کے یہاں بصری پیکروں سے متعلق رائے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ساحر کے زیادہ تر پیکر حسی بصارت کو متوجہ کرتے ہیں۔ جو اُس عہد کے سماجی اور طبقاتی تضاد کے اظہار کے لیے استعاروں کی صورت میں استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتی ہیں:

''ایک سرسری اندازے کے مطابق ساحر کے کلام میں زیادہ تر پیکر حسی بصارت کو متوجہ کرتے ہیں ان کے کلام میں رنگوں اور شکلوں کے پیکر بہت کم ہیں۔ اکثر شعرا نے سماج اور طبقاتی تضاد اور مخالف اخلاقی قدروں کے اظہار کے لیے زیادہ تر انھیں استعاروں سے کام لیا ہے۔ بصری پیکروں کے بعد لمسی اور سماعی پیکر ملتے ہیں۔''

(بحوالہ ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ، مخمور سعیدی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1981، ص 110)

ساحر کے کلام میں شمومی پیکر بھی ملتے ہیں لیکن اس کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے شمومی پیکروں میں خاص طور پر محبوب کے حسین جلووں اور محبوب کے بدن کی خوشبو کا ذکر کر کے اپنی شاعری میں جمالیاتی اور رومانی فضا تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے۔

گھس کے رہ جائے گی جھونکوں میں بدن کی خوشبو
زلف کا عکس گھٹاؤں میں رہے گا صدیوں

قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطر گزرا

ساحر کے کلام میں ہمیں لمسی پیکر کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ لمسی پیکر کبھی کسی چیز کی نرمی و سختی کو ظاہر کرتے ہیں کبھی کسی شئے کی گرمی یا سردی کا احساس دلاتے ہیں۔ ساحر نے تشبیہ، استعارہ اور صنائع کے استعمال سے لمسی پیکر تخلیق کیے ہیں جو ان کے عشقیہ جذبات، محبوب سے دوری، تنہائی اور ملنے کی آرزو کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً

تپتے دل پر یوں گرتی ہے
تیری نظر سے پیار کی شبنم
جلتے ہوئے جنگل پر جیسے
برکھا برسے رک رک تھم تھم

رات کی سرد خموشی میں ہر اک جھونکے سے
تیرے انفاس ترے جسم کی آنچ آتی ہے

ڈھونڈتی رہتی ہیں تخیل کی بانہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

ساحر کی شاعری میں سمعی پیکر بھی ملتے ہیں۔ ساحر نے اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات سے پیدا شدہ صورتحال کی تصویر کشی اپنے سمعی پیکر میں بڑی عمدگی سے کی ہے۔ عالمی جنگ کے تناظر میں جو ڈر و خوف اور وحشت ناک مناظر سامنے آرہے تھے، جن سے ہر دل کانپ جاتا تھا۔ ایسے دردناک مناظر کی تصویر کشی انھوں نے اپنے سمعی پیکروں

کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے جن سے اس عہد کے خوفناک مناظر کی تصویریں ہماری نظروں میں گھوم جاتی ہیں۔

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
بارود کی بوجھل بو لے کر پچھم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اٹھی ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

دیواروں کا جنگل جس کا آبادی ہے نام
باہر سے چپ چپ لگتا ہے اندر ہے کہرام
دیواروں کے اس جنگل میں بھٹک رہے انسان
اپنے اپنے الجھے دامن جھٹک رہے انسان

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رخ پر
ندی کے ساز پہ ملاح گیت گاتا ہے

'پرچھائیاں' ساحر لدھیانوی کی مشہور نظم ہے۔ جس میں شاعر کے جذبات و احساسات کی تصویریں شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ سردار جعفری نے اس نظم کے حوالے سے ساحر کے کلام میں نقاشی اور رنگ بھرنے کی اس خوبی کی ستائش طرح کی ہے جس سے محاکاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس محاکاتی کیفیت کو پیدا کرنے کے لیے ساحر نے لفظوں کے استعمال میں بھی بڑی خوش مذاقی دکھائی ہے۔ اس نے بعض مقامات پر نقاشی اور رنگ کا کام کیا ہے۔ الفاظ جو چند حروف کی اجتماعی شکلیں ہیں... اور خطوط میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور کاغذ کے صفحے پر ایک منظر کھینچ دیتے ہیں۔ ان کی صوتی کیفیت میں ٹکراؤ اور جھنکار کی بجائے ایک خاموش اور بے آواز روانی ہے۔ جیسے صاف اور چکنی سطح پر آہستہ آہستہ پانی بہہ رہا ہو۔''

(دیباچہ پرچھائیاں بحوالہ کلیات ساحر لدھیانوی، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ص 166)

ساحر کے کلام میں مذوقی پیکر کی مثالیں بھی ملتی ہیں لیکن یہ پیکر بہت کم ہیں۔ شاعر کے عہد کے مایوس کن سماجی حالات کی وجہ سے ان کی ذاتی زندگی میں جو تلخی اور غم آ گیا ہے، اس کو دور کرنے کے لیے شاعر اپنے محبوب کو تسلی دیتا نظر آتا ہے اور ان تلخیوں اور وحشت ناکیوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے محبوب سے قربت حاصل کرنے کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ شاعر کی دلی کیفیات و احساسات کی یہ سچی تصویریں ان کے مذوقی پیکر میں بڑی خوبی سے ڈھل گئی ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

لب پہ شکوہ نہ لا، اشک پی لے
جس طرح بھی ہو کچھ دیر جی لے
اب اکھڑنے کو ہے غم کا ڈیرہ
کس کے روکے رکا ہے سویرا

جہاں جہاں ترے جلووں کے پھول بکھرے تھے
وہاں وہاں دل وحشی پکار اٹھتا ہے

پکارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی!
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا

یادداشتی پیکر بھی ساحر کے کلام میں ایک نئے اور انوکھے انداز میں آئے ہیں۔ ساحر کے یہاں ماضی کی خوشگوار یادیں حال کی پریشانیوں کے ساتھ مل کر تکلیف دہ صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ محبوب کی یاد آوری کے عمل سے گزر کر اس ماضی کو حال سے اس طرح مربوط کر دیتے ہیں کہ وہ ماضی کے دردناک لمحات کے کرب میں حل ہو کر اور بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ ہجر، درد، رنج دلی، روحانی اذیت اور تنہائی کا کرب، ان یادداشتی پیکروں میں ڈھل کر شاعر کے جذبات و احساسات کی خوبصورت تصویریں تخلیق کرتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے۔

تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

وہ رہ گزر جو مرے دل کی طرح سونی ہے
نہ جانے تم کو کہاں لے کے جانے والی ہے
تمھیں خرید رہے ہیں ضمیر کے قاتل
افق پہ خونِ تمنائے دل کی لالی ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

ذہن میں حُسن کی ٹھنڈک کا اثر جاگتا ہے
آنچ دیتی ہوئی برسات کی یاد آتی ہے

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

ساحر کے کلام میں مخلوط پیکر کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ زمانے کی المناکی، درد و کرب، محرومی اور اذیت کوشی کا گہرا رنگ ان کے مخلوط پیکروں میں علامتی برتاؤ کے ساتھ نمایاں ہوا ہے۔ ساحر کا حسیاتی ادراک مادی دنیا کے آب و رنگ سے نمو پاتا ہے۔ وہ اپنے تاثرات اور احساسات کو اپنے عہد سے اخذ کر کے مناسب لفظوں میں ڈھال کر پیکر تراشی کا حق ادا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں بصری پیکر کی بہتات ہے لیکن یہ بصری پیکر سمعی، لمسی اور سمعی پیکروں میں ڈھل گئے ہیں۔ یعنی ایک سے زیادہ حواس کو ساحر نے ان مخلوط پیکروں میں ڈھال کر بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ ایک مثال دیکھیے جس میں بصری، لمسی، سماعی و حرکی اور مذوقی ایک دوسرے سے مل کر مخلوط پیکر بن گئے ہیں۔

قمقموں کی زہر اگلتی روشنی
سنگدل پر ہول دیواروں کے سائے
آہنی بت، دیو پیکر اجنبی!
چیختی چنگھاڑتی خونیں سرائے

ایک اور مثال دیکھیے جس میں بصری ادراکی، مذوقی اور حرکی پیکر مخلوط پیکر میں ڈھل گئے ہیں۔ جیسے۔

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی وہ ہلکی سی لکیر
میرے تخیل میں رہ رہ کے جھلک اٹھتی ہے
یوں اچانک ترے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اٹھتی ہے

ان مثالوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساحر نے اپنے کلام میں اپنے تجربات، مشاہدات، ذہنی تصورات اور نفسیاتی کیفیات کے ذریعے مختلف حواس کو یکجا کر کے پیکروں کی ایک خوبصورت دنیا آباد کی ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات کو ان حسی پیکروں کے قالب میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ان کے مخصوص لہجے کی انفرادیت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ ان کی شاعری داخلی اور خارجی تجربات، مشاہدات اور جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی اور اپنے اطراف و اکناف کی زندگی کے غم، افسردگی، حزن و ملال، سیاسی ناہمواری، معاشی بدحالی، سماجی پستی اور تہذیبی قدروں کی شکست و ریخت کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لیے خوبصورت پیکروں کا سہارا لیا ہے جس میں ان کے جذبے کا خلوص، احساسِ لطافت اور تجربات کی صداقت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ غرض ساحر نے اپنے داخلی اور خارجی حالات کی صداقت کو اپنے مخصوص اور موثر لہجے میں بڑی سچائی، سادگی، بے ساختگی اور فنی چابکدستی سے مصوری و نقاشی کر کے پیکر تراشی کا حق ادا کیا ہے اور یہی ان کے فن کا کمال ہے۔

■

Dr. Arshia Jabeen
Associate Professor, Dept of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad- 500046 (Telangana)
Mob.: 9989860874

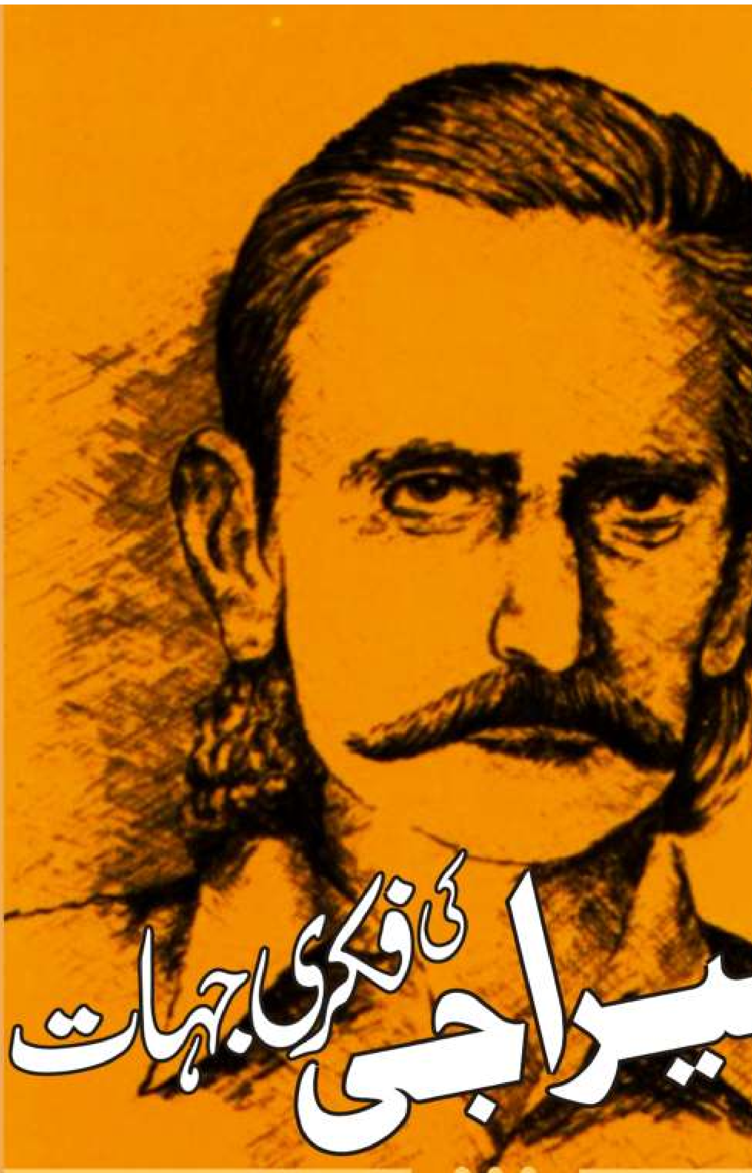

میراجی کی فکری جہات

شاہ عالم

میراجی کا شمار اردو نظم میں داخلیت کے سب سے بڑے علم بردار کے طور پر ہوتا ہے۔میراجی نے جس رنگ کی شاعری کو رواج دیا، وہ اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے بہت مختلف تھی۔میرا جی کے یہاں موضوعات،ہیئت اور اسلوب کے تجربے چونکانے والے تھے۔ ان کی خلاقانہ صلاحیت نے اردو نظم میں اظہار کے نئے دریچے وا کیے۔ نئے اسالیب اور نئے موضوعات کی تلاش سے نظم کا دائرہ وسیع تر ہوا۔

انیسویں صدی میں حالی اور آزاد کی کاوشوں سے اردو نظم میں غیر معمولی تبدیلی واقع ہوئی۔ حالی اور آزاد کی کوششوں سے اردو نظم میں نئے موضوعات، ہیئت اور اسلوب کے نئے دریچے وا ہوئے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں گرچہ اردو نظم میں موضوعات، ہیئت اور اسلوب کی سطح پر تبدیلی کی کوشش نظر آتی ہے، لیکن ادبی منظر نامے پر ان تجربوں کو مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ اثر مارہروی، مولانا وحیدالدین سلیم، عظمت اللہ خاں اور مولانا تاجور نجیب آبادی وغیرہ نظم کے موضوعات، ہیئت اور اسلوب کی سطح پر تبدیلی کے لیے سرگرم نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں عظمت اللہ خاں کی آواز سب سے بلند تھی۔ عظمت اللہ خاں جس طرز کی شاعری کو فروغ دینا چاہتے تھے وہ موضوعات، آہنگ اور لب و لہجے کے اعتبار سے مروجہ شاعری سے بہت مختلف تھی۔ ان حضرات کے یہاں وسعتِ فکر اور تجربات کا دائرہ بہت محدود تھا جس کا اس عہد کے ادبی منظر نامے پر زیادہ اثر نہیں ہوا۔

1936 میں ترقی پسند تحریک اور 1939 میں حلقۂ ارباب ذوق کے زیر اثر نظم میں فکری اور فنی سطح پر غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی۔ حلقہ ارباب ذوق کے شعرا نئے موضوعات کے ساتھ نئی ہیئت اور نئے اسالیب کی تلاش میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات کی کوئی قید نہیں۔ لیکن حلقے کا رجحان انفرادی زندگی اور داخلی مسائل کی طرف ہی رہا ہے۔ اس سے وابستہ شاعروں نے ہیئت کے تجربے، نئے اسالیب اور علامت کو شاعری میں عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آزاد نظم کو فروغ دینے اور مقبول عام بنانے میں حلقے کے شعرا نے اہم رول ادا کیا۔ میراجی کا تعلق حلقۂ ارباب ذوق سے تھا۔ میراجی کا شمار اردو نظم میں داخلیت کے سب سے بڑے علم بردار کے طور پر ہوتا ہے۔ میراجی نے جس رنگ کی شاعری کو رواج دیا، وہ اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے بہت مختلف تھی۔ میراجی کے یہاں موضوعات، ہیئت اور اسلوب کے تجربے چونکانے والے تھے۔ ان کی خلاقانہ صلاحیت نے اردو نظم میں اظہار کے نئے دریچے وا کیے۔ نئے اسالیب اور نئے موضوعات کی تلاش سے نظم کا دائرہ وسیع تر ہوا۔

میراجی کے یہاں روایتی اور مروجہ شاعری سے انحراف کی لے بہت تیز رہی ہے، ان کی جدت پسندی اور ہیئت واسلوب کے تجربوں سے بحث ومباحثے کا ایک دور شروع ہوا۔ میراجی نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے اپنے ادبی نقطہ نظر کی وضاحت کی اور اس کا جواز بھی پیش کیا۔ انھوں نے جس طرز کی شاعری کو رواج دینے کی کوشش کی اس کے لیے روایتی اسالیب اور اظہار کے بنے بنائے سانچے ناکافی معلوم ہوئے۔ بلا شبہ میرا جی کے یہاں ہیئت اور اسلوب کے تجربے کا رجحان نظر آتا ہے، لیکن ان کا مقصد محض نئی ہیئت واسلوب کو رائج کرنا نہیں تھا بلکہ نئے موضوعات اور نئی طرز فکر کے اظہار کے لیے نئے پیمانے وضع کرنا تھا، جس سے اظہار کی راہیں روشن ہوں۔ میراجی تجربہ برائے تجربہ کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میراجی نے پابند، معریٰ اور آزاد نظم کی ہیئت کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ بقول ن م راشد:

''میراجی ان شاعروں میں تھے جنھوں نے محض تجربے کی خاطر یا ماضی سے کسی شعوری علاحدگی کے باعث یا محض جدید نظر آنے کے لیے رسمی عروضی ترکیبوں کو ترک نہیں کیا تھا بلکہ جن کے مواد کا تقاضا تھا کہ وہ کامل طور پر نئے ڈھانچے پر استوار ہو'' (ن م راشد: لا=انسان، ص46)

اس حوالے سے میراجی کے دو اقتباس دیکھیے جن سے ان کے ادبی نقطہ نظر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے:

''خیال ہی میری نظر میں بنیادی شے ہے اس میں اگر کوئی نئی بات نہیں اس میں اگر دو قدم آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں تو اظہار کی کوشش بے مصرف اور بیکار ہے۔

(میراجی: اس نظم میں، ص10)

''بہت سے لوگ مجھے صرف آزاد نظم کا پرستار سمجھتے

ہیں مگر آزاد نظم کو میں موضوع یا فنی ضرورت کے ہی لحاظ سے جائز کہتا ہوں۔'' (میراجی: میراجی کی نظمیں (دیباچہ)، ص15)

ظاہر ہے میراجی کا اصرار فکر وفن کے ارتباط پر تھا۔ان کے نزدیک خیال کے لیے جب تک مناسب ذریعۂ اظہار نہ اختیار کیا جائے کلام موثر اور دیرپا نہ ہوگا۔جدید شاعروں میں اپنے شعری رویوں کی وضاحت اور اپنی شاعری کا جواز پیش کرنے کی ضرورت میراجی ہی نہیں بلکہ ان کے ہمعصروں میں راشد، فیض، اخترالایمان اور بعض دوسرے شاعروں کو بھی پیش آئی۔ان شعرا کی شاعری مروجہ شاعری کے مزاج سے اگر اتنی الگ نہ ہوتی تو شاید انھیں اس کی ضرورت بھی پیش نہ آتی۔میراجی کے ساتھ ایک مشکل یہ تھی کہ ان کی شاعری کی تفہیم میں ان کی شخصیت ایک مسئلہ بنی رہی۔میراجی کی شاعری میں اچھوتے تجربات، داخلی زندگی کی طرف میلان، ذاتی علامتوں اور ابہام کے سبب ان کی نظموں کی تہہ تک رسائی آسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میراجی کی شاعری کے متعلق یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ ان کی شاعری اپنے عہد کے زندہ مسائل سے دوٹوک واسطہ نہیں رکھتی۔دراصل میراجی کے یہاں زندگی سے وابستہ مسائل کا اظہار مختلف انداز میں نظر آتا ہے۔میراجی اپنے عہد کے مسائل کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے واقعات وحادثات سے میراجی کی گہری دلچسپی تھی۔میراجی کے مضامین سے ان کا اپنے عہد اور سماج کے زندہ مسائل سے وابستگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔میراجی اپنی شاعری کے سروکار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مشاہدے کے لحاظ سے اگرچہ بہ نسبت مجموعی زندگی کے ہر پہلو کی طرف میرے تجسس نے مجھے راغب کیا لیکن موجودہ صدی کی بین الاقوامی کش مکش (سیاسی سماجی اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر دیا ہے وہ بالخصوص میرا مرکزِ نظر رہا ہے۔اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشاں خیالی کو جنسی رنگ دے دیا۔'' (میراجی: میراجی کی نظمیں (دیباچہ، ص20)

اپنے عہد کے مسائل سے گہرا رشتہ رکھنے کے باوجود ان کی شاعری میں سماج کے مسائل کا واضح اظہار نہیں ملتا، جیسا کہ ان کے دوسرے ہم عصروں کے یہاں نظر آتا ہے۔دراصل میراجی نے زندگی کا ادراک عام طرز سے ہٹ کر کیا۔میراجی نے زندگی سے وابستہ مسائل کو سیدھے سادے انداز میں بیان نہیں کیا۔ خارجی حالات، داخلی زندگی پر جس قدر اثر انداز ہوتے ہیں اور داخلی زندگی جس کیفیت سے دوچار ہوتی ہے، میراجی نے اس صورت حال کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔

دراصل میراجی کی طرزِ زندگی دوسروں سے بہت مختلف تھی۔ ان کی پوری زندگی ناآسودگیوں سے عبارت تھی۔محبت میں ناکامی، جنسی ناآسودگی، معاشی مسائل، میراجی کی زندگی سے ہمیشہ دامن گیر رہے۔میراجی سماجی قوانین، طور طریقے، عادات واطوار کے پابند نہیں تھے۔ خود میراجی کو اس بات کا احساس تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کو سماجی طور طریقوں کے مطابق گزارنے کی شاید کوشش بھی نہیں کی، بلکہ بعض سماجی قوانین کے معاملے میں جنھیں وہ غیر ضروری سمجھتے تھے ان کے خلاف باغیانہ رویہ اختیار کیا۔اس سلسلے میں سب سے زیادہ شدید ردِعمل جنس کے معاملے میں اختیار کیا۔میراجی کی نظر میں جنس قدرت کی سب سے بڑی نعمت اور راحت ہے، اس لیے جنس پر تہذیب وتمدن کی پابندی انہیں گوارا نہ تھی، چنانچہ ردِعمل کے طور پر ہر عمل کو جنس کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ ان کی نظموں میں جنسی جذبے کا اظہار بغاوت کے طور پر بھی ہے ان کے یہ اقتباسات دیکھیے:

''جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب وتمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے اس لیے ردِعمل کے طور پر دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور جو میرا آدرش ہے۔'' (میراجی: میراجی کی نظمیں 15-14)

''اس بات کو جانے دیجیے کہ بقائے نسل جو ایک خالص جنسی معاملہ ہے اسے بھی بعض مذاہب میں عبادت کا رتبہ دیا جاتا ہے اس پر مجھے اعتراض نہیں اور نہ اس سے بحث ہے کہنا صرف اس قدر ہے کہ جدید سائنسی علوم کی روشنی میں جب ہمیں یہ بتایا جارہا ہے کہ ذہن انسانی میں ہر فعل کی تحریک کا باعث جنسی جذبہ ہے اور مذہبی احساس اور تجربہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم روایات سے غیر جانب دار ہو کر صحیح بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں محض خوش عقیدہ انسان بن کر ہی نہ رہ جائیں۔''

(میراجی: مشرق ومغرب کے نغمے، لاہور، 1999، ص 451)

میراجی ایک طرف مغربی مفکر فرائڈ کے نظریے سے متاثر تھے تو دوسری طرف عہد قدیم کے شعرا 'چنڈی داس' اور 'ودیاپتی' سے اثر قبول کیا۔ چنڈی داس اور ودیاپتی دونوں شعرا ویشنومت کے بہت بڑے پیرو تھے۔ میراجی ویشنومت میں اعتقاد رکھتے تھے۔چنڈی داس اس عقیدے کا حامی تھا۔ودیاپتی اپنی شاعری میں رادھا اور کرشن کی محبت ان کے احساسات وجذبات اور ان کے پریم پرسنگ کو بیان کیا ہے۔ یہاں جنسی ملاپ کی عکاسی بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ فطرت کے مظاہر میں ان کی گوناگوں تصویر کشی بھی کی ہے۔

میراجی نے جنس کو جس انداز میں اپنی شاعری میں برتا اس کے لیے انھیں سب سے زیادہ ہدف ملامت بنایا گیا۔دراصل میراجی سے پہلے اردو شاعری میں جنس کے موضوع کو اس انداز سے دیکھنے اور اسے شاعری کا موضوع بنانے کی مثال نہیں ملتی۔میراجی جنس کو اپنا آدرش اور دنیا کی سب سے بڑی راحت سمجھنے کے ساتھ جنسی معاملات میں مکمل آزادی کے خواہاں تھے۔ان کے یہاں جسم کا قرب اور لذت کوشی کا شدید اور عریاں اظہار ان کی بعض نظموں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

میراجی کی شاعری میں وقت کی سرگوشیوں کی آواز صاف سنی جاسکتی ہے۔میراجی نے وقت کو ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ حیات وکائنات کے ہنگامے اس کے زیرِ نگیں وجود میں آتے ہیں اور فنا بھی ہوتے ہیں۔عروج وزوال کی کہانی، تخریبی اور تعمیری سرگرمیاں اس کے دم سے ہیں۔زندگی کا سکھ دکھ، سرد گرم سب کچھ اسی کا حصہ ہے۔وقت کے حصار سے کوئی شے باہر نہیں۔اس کی بالادستی ہر چیز پر قائم ہے۔یہ مثال دیکھیے۔

گزرتے لمحوں کے آتشیں پاؤں اس جگہ پے بہ پے رواں
کہیں مٹاتے کہیں مٹانے کے واسطے نقشِ نو بناتے
حیاتِ رفتہ حیاتِ آئندہ سے ملے گی یہ کون جانے
ہوا کے جھونکے ادھر جو آئیں تو ان سے کہنا
کہ جیسے وہ کائنات کا عکسِ بے کراں ہے

(عدم کا خلا)

میراجی کو اس اعتبار سے سیاسی اور سماجی شاعر تو نہیں کہہ سکتے جیسا کہ اس عہد کے بیشتر شاعر نظر آتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ میراجی کو بھی اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال سے گہرا سروکار تھا۔دراصل میراجی کے یہاں زندگی اور اس کے مسائل کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ انھوں نے کسی سیاسی یا سماجی نظریے کے تحت شاعری نہیں کی، اسی لیے ان کے یہاں اس کا واضح اظہار نہیں ملتا، بلکہ ان مسائل کے سبب پیدا شدہ الجھنوں کا اظہار ان کی نظموں میں دیکھا جاسکتا ہے۔بقول میراجی:

''میں اپنے ملک کے موجودہ سماج کا ایک جیتا جاگتا فرد بھی ہوں میری خواہشات اسی سماج کے تابع ہیں میرا دل پرانی فضا میں سانس لیتا ہے مگر میری آنکھیں

اپنے آس پاس دیکھتی ہیں اور اس مشاہدہ کا نقش بھی میری نظموں میں ہر جگہ موجود ہے“

(میراجی: ہندستان کی غربت کا مسئلہ ادبی دنیا، لاہور، فروری 1939)

”ہم نے کبھی بڑی منڈی ہونے پر اظہار تفاخر نہیں کیا کہ ہم اپنی دولت کو ضائع کرنے لیے یہ بے مصرف امتیاز حاصل کریں۔ برطانیہ اگر یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ اس کے ماتحت ملک اپنی غلامی اور غربت پر اظہار مسرت کریں تو وہ دوسروں کی طرف توجہ کرے ہندستان اس سے باز آیا“

(میراجی: ہندستان کی غربت کا مسئلہ ادبی دنیا، لاہور، فروری 1939)

ان اقتباسات سے میراجی کی عصری آگہی اور اس عہد کے زندہ مسائل سے گہرے سروکار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی نظموں میں اس نوع کے خیالات کا برملا اظہار نہیں ملتا، بلکہ خارجی واقعات اور مسائل داخلی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ انھوں نے ’کلرک کا نغمۂ محبت‘ نظم کے علاوہ کسی اور نظم میں طبقاتی اور اقتصادی ناانصافیوں کا ذکر کھل کر نہیں کیا ہے۔ لیکن ان کی نظموں میں زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں کا نوحہ ضرور سنا جا سکتا ہے۔

میراجی کی نظموں میں فطرت سے قرب کا رجحان بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں اور گیتوں میں ہندستانی فضا یہاں کی مٹی کی خوشبو، یہاں کے موسم، پھل پھول ندیاں پہاڑ دیوی دیوتا، غرضیکہ ہندستانی مزاج اور فطرت سے والہانہ لگاؤ نمایاں ہے۔ ہندو دیو مالا اور ویشنومت کے ربط سے قدیم ہندستان کی پراکرتک زندگی کا عکس بھی ابھرتا ہے۔ میراجی کی نظموں اور گیتوں میں فطرت کے آغوش میں پرورش پانے والی زندگی اور انھیں مناظر میں زندگی کے پروان چڑھنے کی روش کا پتہ چلتا ہے۔ اس مقام پر نہایت پرسکون، پاکیزہ اور سیدھی سادی زندگی کی فضا خلق ہوتی ہے۔ جہاں موسم کے بدلنے سے انسانی خواہشات بھی بدلتی ہیں۔ میراجی نے پرکرت کی نرملتا اور کوملتا میں انسانی جذبات واحساسات کی موثر ترجمانی کی ہے۔ فطرت کی سادگی کے ساتھ میراجی کے یہاں ’انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چندر ماں‘ کی سی سادگی اور بھولا پن جھلکتا ہے۔

ندی دھیمے دھیمے سروں میں گاتی ہے
ان تھک چپکے چپکے بہتی جاتی ہے
آو چندا! کاہن نیلے منڈل کے!
چمکو کرشن کنھیا اونچے جنگل میں
سات ستاروں کی ہر گوپی کو لاو
پھولوں میں کرنوں سے شبنم برساو

(ایک شام کی کہانی)

میراجی نے فطرت کی سادگی اور معصومیت سے اپنے جذبوں کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میراجی نے زندگی کے تضادات کو اپنی ذات کی حوالے سے دیکھا۔ زندگی کے مسائل کو مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا، بلکہ ان مسائل کے اثرات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ انھوں نے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی نظموں میں سیاسی اور سماجی نظام سے بیزاری یا ان کے خلاف بغاوت کی صدا بلند نہیں کی، بلکہ زندگی کے تضادات اس کے سکھ دکھ کو خاموشی سے قبول کرنے کو ترجیح دی۔ اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود زندگی سے بیزاری نہیں، بلکہ امید کی کرن نظر آتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی محرومیوں اور ناآسودگیوں میں ہی لذت کی تلاش کی۔ ان کے یہاں آشا اور نراشا کا ایک سنگم نظر آتا ہے۔ نظم ’درشن‘ کا یہ حصہ دیکھیے۔

پربت کو اک نیلا بھید بنایا کس نے؟ دوری نے
چاند ستاروں سے دل کو بھرمایا کس نے؟ دوری نے
نئی اچھوتی انجانی لہروں کا ساگر نیارا ہے
دور کہیں بستی سے بن میں سونا مندر پیارا ہے
قدم قدم پر جیون میں دوری نے روپ نکھارا ہے
تب تک ناو سہائے دل کو جب تک دور کنارا ہے
دور بھی رہ کر دھن بھی امر ہے چاہے جوڈھب ہو جیون کا
سکھ دکھ دونوں ہوا کے جھونکے کوئی سبب ہو جیون کا

....

دور جو ہے وہ رہے دور ہی پاس بلانا ٹھیک نہیں
آپ قدم آگے لے جا کر اس کو مٹانا ٹھیک نہیں
پاس اور دور کا بھید انوکھا دور کی مہک سہانی ہے
ہاتھ بڑھائے من کی موج تو پل میں ختم کہانی ہے

(درشن)

زبان وبیان کے لحاظ سے میراجی کے یہاں استعارات، علامتیں اور ابہام کی گہری پرت قائم ہے۔ اردو نظم میں جو روش عام تھی اس میں علامت کا استعمال بہت کم تھا۔ میراجی کے یہاں علامتوں کا استعمال بہت نمایاں ہے۔ ان کی ذاتی علامتوں اور ابہام کے سبب ان کی نظمیں پراسرار کیفیت لیے ہوئے ہیں۔ میراجی نے اپنی محرومیوں اور اپنی خواہشات کے اظہار کے لیے علامتی اور مبہم انداز اختیار کیا، چونکہ میراجی کا رجحان قدیم ہندوستان کی تہذیبی وتمدنی زندگی اور قدرتی مناظر سے گہرے لگاؤ کے سبب ان کی علامتیں اسی سے ماخوذ ہیں۔ جنگل، دھرتی، سمندر، چشمہ، رات، کرن وغیرہ علامتیں ان کی نظموں میں کثرت سے ملتی ہیں۔ انھوں نے ان علامتوں کے ذریعے قدیم دور کی تہذیبی زندگی کی بازیافت کی ہے۔ ان کے مجموعی مزاج پر ہندستانی دیو مالا کا اثر نمایاں ہے۔

موضوعات اور زبان وبیان کے لحاظ سے میراجی کی شاعری اپنے معاصرین کی شاعری سے منفرد دکھائی دیتی ہے۔ میراجی کی فکر اور طرزِ اظہار دونوں میں نیا پن ہے۔ میراجی نے اپنے تجربات ومشاہدات کو جس انداز میں پیش کیا وہ ہماری شعری روایت میں عام نہ تھا۔ جدید اردو نظم کو ایک مستحکم بنیاد اور نئی سمت ورفتار عطا کرنے میں میراجی کا کارنامہ بہت اہم ہے۔ میراجی کے ہاتھوں نئے موضوعات کے لیے دریچے وا ہوئے اور ہیئت واسلوب کی سطح پر اظہار کے امکان روشن ہوئے۔

میراجی کے یہاں پراسرار علامتیں اور استعارات ابہام کی گہری پرت جنسی موضوعات اور نظم آزاد کے استعمال سے ان کی شناخت ایک باغی شاعر کی قائم ہوئی۔ اردو نظم میں جو روش عام تھی اس میں ابہام اور علامت کا استعمال بہت معمولی تھا۔ میراجی ابہام اور علامت کے استعمال میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ہندی لفظیات ابہام اور علامت کے استعمال سے ان کے اسالیب کی انفرادیت قائم ہے۔ ان کی بیشتر نظموں میں مبہم انداز بیان اور علامتوں کا استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔

میراجی چونکہ ویشنو بھگتی سے ذہنی ربط رکھتے تھے اور ان کا رجحان قدیم ہندستان کی تہذیبی وتمدنی زندگی کی طرف زیادہ رہا ہے اور فطرت سے گہرا قرب رکھنے کے سبب ان کی علامتیں اور استعارے اسی سے ماخوذ ہیں۔ جنگل، دھرتی، سمندر، چشمہ، چاند، رات، کرن وغیرہ علامتیں ان کی نظموں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ ملبوس، محل مرمریں قصر آئنہ گو رادھا کرشن جیسی علامتیں بھی موجود ہیں۔ ان علامتوں کے ذریعے قدیم دور کی تہذیب کی بازیافت کی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جدید اردو نظم کو نئی جہت عطا کرنے میں میراجی کا کارنامہ بہت اہم ہے۔ میراجی نے جو تجربات کیے خواہ وہ موضوعات کی سطح پر ہوں یا ہیئت واسلوب کی سطح پر ان سے اردو نظم کا دامن وسیع ہوا۔ اخلاقی تصورات سے قطع نظر میراجی کی شاعری عہد حاضر کے انسان کی ذہنی، جذباتی اور جنسی الجھنوں تک پہنچنے کی کامیاب کوشش ہے۔ زبان وبیان کا جو پیرایہ میراجی نے اپنایا اس سے نظم میں اظہار کے امکانات روشن ہوئے۔

■

Dr. Shah Alam
Associate Professor Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.: 9868669498

مجاہدالاسلام

اردو کے دخیل الفاظ اور رشید حسن خاں

اقبال نے ایک شعر میں کہا ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

زبانوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ مسلسل تغیر وتبدل کے مرحلے سے گزرتی رہتی ہے۔لیکن یہ کیفیت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ اپنے آپ کواس کے لیے تیار رکھتی ہے۔چونکہ زبانیں کسی بھی معاشرے، قوم یا پھر جتھے کی تعبیر اور اس کی نمائندگی کا ذریعہ ہوتی ہیں،تو معاشرہ جیسے جیسے کروٹ بدلتا ہے زبانوں میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔شروع شروع میں انسان کی زندگی قبائلی تھی تو وہاں پر زندگی کی راہیں بھی محدود ہوتی تھیں۔ایک دوسرے سے کٹے ہونے کی وجہ سے ان کے الفاظ وتعبیرات بھی محدود تھے۔لیکن جیسے جیسے انسان متمدن ہوا تو اس کی ضرورتیں بڑھیں، اس کے خیالات میں وسعت آئی اور اس طرح سے زبانوں میں بھی وسعت وپھیلاؤ آتا گیا۔اس کی واقعاتی مثال آکسفورڈ ڈکشنری ہے جہاں پر ہر سال یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ آکسفورڈ ڈکشنری اپنا نیا اڈیشن شائع کرنے جارہی ہے اور اس میں اتنے جدید الفاظ شامل کیے جارہے ہیں اور یہ الفاظ اب انگریزی کے ہوگئے ہیں۔اس واقعاتی مثال کو اس طرح سے بھی ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کچھ دنوں قبل 'ماشاء اللہ' اور 'ان شاء اللہ' جیسے الفاظ کا بڑا شہرہ ہوا کہ یہ کلمات اب جرمن لغت کا حصہ تسلیم کرلیے گئے ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زبانیں تبدیلیوں کو قبول کرنے کی وجہ سے آگے بڑھتی ہیں۔جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے ،حالات تبدیل ہوتے ہیں اور اس کی محدودیت ختم ہوکر وسعتوں سے ہم کنار ہوتی ہیں ، زبانیں بھی آگے بڑھتی ہیں اور اس میں وسعت آتی ہے۔کھانے کے مینیو میں چاؤمین، پاستہ، فرنچ فرائز کا اضافہ ایک طرح سے زبان کے ذخیرے میں بھی اضافہ ہے۔اسی طرح سے جب انٹرنیٹ عام ہوا تو بہت سی سہولتوں سے ہمارا واسطہ پڑا جس میں خاص طور سے 'فیس بک' 'واٹس ایپ' ڈاؤنلوڈ، اپلوڈ، لاگ ان، پروفائل اور سبسکرائب جیسے الفاظ ہیں، یہ چیزیں ایک طرح سے کسی بھی زبان کے لغت میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اگر کوئی زبان اور اس کے بولنے والے ان تبدیلیوں کے لیے اپنے دروازے وانہیں کرتے ہیں تو ان کا حال بھی پراکرت، پالی ومگدھی جیسی زبانوں کا ہی ہوگا، جو وقت کے گزرنے کے ساتھ قصہ پارینہ بن کر رہ گئیں۔اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ وجود میں آنے والے الفاظ کو زبانیں بھی اپنے وجود کا حصہ بنائیں۔ تبھی وہ ہم آہنگی بنائے رکھ کر مسلسل آگے بڑھ سکتی ہیں۔

زبان میں 'دخیل' الفاظ کی اہمیت و افادیت مسلم ہوجانے کے بعد اس اہم پہلو پر بھی غور وفکر ضروری ہے کہ جس زبان میں یہ الفاظ داخل ہورہے ہیں، اُس زبان میں اس کی حیثیت کیا ہوگی؟ یعنی کیا وہ اسی لہجے،اسی مخرج اور اسی املے کے ساتھ مدخل زبان کا حصہ بنیں گے جو ان کا خود اپنی اصل زبان میں خاصہ رہا ہے یا پھر ان کے ساتھ مدخل زبان اپنے اصول وضوابط کے مطابق معاملہ کرے گی۔تو اس سلسلے میں علمائے السنہ کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ایک چھوٹا سا گروہ جس میں خاص طور سے عربی

کے کچھ اسکالرز جن میں پروفیسر غازی علم الدین، خواجہ غلام ربانی مجال، ڈاکٹر ایس ایم شیر محمد زمان وغیرہ شامل ہیں ان کا خیال ہے کہ اپنی زبان میں ان کی جو حیثیت و حقیقت رہی ہے، وہی مُدخَل زبان میں بھی قائم رہے گی۔ یعنی وہ لفظ جو اپنی اصل زبان میں جس مخرج والے کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے، وہی حیثیت اس کی یہاں بھی قائم رہے گی۔ جب کہ ایک دوسرا گروہ جس میں خاص طور سے رشید حسن خاں اور ماضی قریب کی بھی کچھ شخصیات سامنے آئی ہیں، جن کا خیال ہے کہ اس 'بدیشی' لفظ کے ساتھ مُدخَل زبان اپنے مطابق معاملہ کرے گی۔

رشید حسن کا خاں نے ایک بلند پایہ محقق، نقاد اور مدون کے طور پر اپنی شناخت بنائی تھی۔ ان کا نام تحقیق و تدوین کے میدان میں قاضی عبدالودود، حافظ محمود خاں شیرانی اور عبدالستار صدیقی وغیرہ کے ساتھ لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ رشید حسن خان نے داستان' باغ و بہار'، 'فسانہ عجائب' مثنوی' گلزار نسیم' وغیرہ جیسی کئی کتابوں کی تدوین وتہذیب کی، وہیں انھوں نے اس فن کے اصول وضوابط اور اس کے متعلقات پر بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، املائے غالب، تدوین۔ تحقیق۔ روایت، تفہیم، تلاش و تعبیر، زبان اور قواعد، عبارت کیسے لکھیں وغیرہ کو اردو ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اپنی ان تحریروں میں انھوں نے جا بہ جا اردو میں دوسری زبانوں کے دخیل الفاظ کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ہر سماج کا اپنا مجموعی اصول اور نظام ہوتا ہے اس کی نفسیات اور اس کا ایک علاحدہ ذوق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اردو ایک مستقل زبان ہے، اس میں جو دوسری زبانوں کے الفاظ داخل ہوں گے، اس کے ساتھ اردو اپنے ہی لحاظ اور قواعد سے برتاؤ کرے گی۔ رشید حسن خاں اس ذیل میں امیش بہادر شریواستوافگار اناوی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مشکور جیسے الفاظ اب اردو زبان کے لفظ ہیں۔ ان کو اردو میں چلن کے مطابق ماننا لازم ہے۔ جب عربی لکھیں گے، تب عربی قواعد کی پابندی کی جائے گی۔ الفاظ کا احوال افراد جیسا ہوتا ہے۔ فرد جب ہجرت کر کے کسی نئے ملک میں جا بستا ہے تو اس پر اس نئے ملک کے قوانین کا نفاذ ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے ملک میں تو ایسا نہیں تھا۔''

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول): مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی، 2011 ص 283)

رشید حسن خاں کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ چاہے کسی بھی زبان کا ہو، اس زبان میں اس کے ساتھ جو بھی معاملے رہے ہوں، مُدخَل زبان میں اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ یہاں خود اس زبان کے مذاق اور قواعد کے لحاظ سے اس الفاظ کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔ خواجہ حیدر علی آتش کا ایک واقعہ مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے ایک مشاعرے میں ایک شعر پڑھا۔

دخترِ رزمری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

کسی نے ٹوکتے ہوئے کہا صحیح لفظ تو بیگُم ہے۔ آتش نے کہا جب ہم ترکستان جائیں گے تو بیگُم کہیں گے، یہاں تو بیگم ہی چلے گا۔

اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ آتش بھی دخیل الفاظ کے معاملے میں مدخل زبان کے اعتبار سے معاملہ کرنے کو نہ صرف فصیح سمجھتے تھے بلکہ اسے ضروری بھی خیال کرتے تھے۔ اسی طرح ہمارے یہاں 'مشکور' بولنے پر بعض لوگوں کا کافی سخت اعتراض ہوتا ہے اور وہ اسے عربی الاصل ہونے کی وجہ سے بھونڈی غلطی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ لفظ اردو میں اسی طرح قدیم زمانے سے ہی مستعمل ہوتا آیا ہے۔ مثال کے طور پر میر نے کہا ہے۔

رنگ رنگ الطمعہ ہیں بذل پھر اس درجہ وفور
کیا خداوندی ہے اللہ خدائی مشکور

(کلیات میر، جلد دوم منقبت در مدح حضرت علی)

اسی طرح کیف مرادآبادی نے کہا ہے۔

رسائی سعیِ نامشکور ہو جائے تو کیا ہوگا
قدم رکھتے ہی منزل دور ہو جائے تو کیا ہوگا

مشکور لفظ کے استعمال کی اس تاریخی حیثیت کے باوجود اسے غلط سمجھنا اور متشکر یا شکر گزار بولنے پر ہی اصرار کرنا اردو کے مزاج و مذاق سے نہ صرف جنگ آرائی کے مترادف ہے بلکہ اس کے تاریخی استعمالات پر سوالیہ نشان لگانے کے بھی برابر ہے۔ اس رویے کو ظاہر ہے درست نہیں سمجھا جا سکتا۔ مشکور، متشکر اور شکر گزار یہ بھی لفظ اردو میں درست تسلیم کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی بات پر بحث کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے ڈاکٹر رئیس نعمانی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''تلفظ کا مسئلہ وہ نہیں جو آپ کے ذہن میں ہے۔ یہاں تغیرات کا مسئلہ ہے جو عربی فارسی کے الفاظ میں یہاں کے لسانی اور طبعی تقاضوں کے تحت رونما ہوئے ہیں اور ایسے تغیرات ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ خود مختار زبان کی پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے سانچوں میں ڈھال لیتی ہے، تلفظ کے لحاظ سے بھی اور ساخت یا شکل وصورت کے اعتبار سے بھی۔ مثلاً تنقید سے عربی والے نہیں مگر اردو والے آشنا ہیں۔ اب ایک صاحب باب تفعیل کی ترازو پر اسے تولنا چاہیں تو ظاہر ہے کہ یہ مہمل کام ہوگا یا تشکیل اور لئیق کو صراح و قاموس میں تلاشنا چاہیں اور نہ ملیں تو غلط کہہ دیں یا مقصد بولنے پر اصرار کریں اور مقصَد کو غیر معتبر سمجھیں یا مثلاً 'متشکر' بولنے پر اصرار کریں اور اس معنی میں مشکور کو غلط سمجھیں یا مرفن کو نکال باہر کرنا چاہیں وغیرہ... اصل مسئلہ یہ کہ اردو الفاظ کو عربی یا فارسی کے قواعد کی روشنی میں نہیں دیکھا جا سکتا، اگر کوئی شخص یہ حرکت کرتا ہے تو اس کا صاف طور پر مطلب یہ ہوگا کہ وہ علم لسان سے کم آشنا ہے اور زبانوں کے اصول ارتقا سے ناواقف ہے اور صحت مند نقطہ نظر سے محروم ہے۔ احمد اور اکبر دونوں بہ فتح اول ہیں، مگر احمد میں فتح کا وہ تلفظ رونما نہیں ہوتا جو اکبر میں ہوتا ہے، بات یہ کہ یہ اردو کا لسانی رجحان ہے ح یا ہ سے پہلے حرفِ مفتوح آئے تو اس صورت میں اس زبر کے تلفظ میں اور یہی پن پیدا ہو جاتا ہے اور اشمام کسرہ والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جیسے: محل، سہنا، بہنا، اب ایک صاحب احمد کو قرائت کے ساتھ بالکل عربی کے طریقے پر اسی طرح بولیں جس طرح اکبر کو بولتے ہیں اور فتح کا ترچھا پن، زبر کے سیدھے پن سے ہی بدل جائے تو یہ حرکت فصاحت زبان کے قطعاً خلاف ہوگی اور بجا طور پر یہ سمجھنا چاہیے کہ ان صاحب کو اردو نہیں آتی یا یہ تازہ وارد ہیں۔ وغیرہ۔''

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول): مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی 2011، ص 445)

رشید حسن خاں کے نزدیک عربی وفارسی الفاظ کے تغیرات کے احترام کے باوجود اردو کے مذاق ومزاج کو فوقیت دینا لازمی تھا، اس لیے وہ تنقید، تشکیل، تشلیل، لئیق اور مشکور جیسے الفاظ کو اردو میں مروجہ تلفظ وساخت کے لحاظ سے ہی استعمال کرنے کو درست سمجھتے تھے۔ ان اختلافات کی وجوہات پر ان کی نظر گہری تھی۔ اسی لیے وہ زبان کی بنیاد اور رموز سے بھی واقف تھے اور اس کی تبلیغ سے انھیں گریز بھی نہیں تھا۔ فرحت صاحب کے نام ایک خط میں ان اختلافات کی وجوہات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیکھیے بھائی! علم اللسان ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہر زبان کے اپنے قانون ہوتے ہیں اور دوسری زبانوں کے جو لفظ کسی زبان میں داخل ہوتے ہیں یا اس کا جز ہوتے ہیں، وہ اس زبان کے ضابطوں کے سانچے میں ڈھل کر جزو زبان بنتے ہیں۔ ایسے الفاظ کے لیے اصل زبان سے

سند نہیں لائی جاتی، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس زبان میں وہ کس طرح مستعمل ہیں۔ عربی فاتح زبان کی حیثیت سے ایران میں داخل ہوئی تھی، مگر فارسی اور عربی دو بالکل مختلف خاندانوں کی زبانیں ہیں، عربی سامی خاندان کی زبان اور فارسی انڈو ایران خاندان کی، اس لیے دونوں زبانوں میں آہنگ اور تلفظ اور لہجے کے بنیادی اختلاف ہیں، اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ عربی کے بے شمار لفظ فارسی زبان کی خراد پر چڑھ کر اور ترش تر شا کر شامل زبان ہوئے۔ کسی فارسی والے نے یہ نہیں کہا کہ یہ تو عربی کا لفظ ہے، اسے عربی زبان کی طرح ہی استعمال کرو۔ یہی نہیں عربی طریقہ اشتقاق کے قیاس پر بہت سے الفاظ فارسی دانوں نے بنا لیے، مثلاً زلف سے مزلّف، زیب سے مزیّب، نقد سے تنقید، شکل سے تشکیل وغیرہ۔ اب آپ عربی کے لغات میں ڈھونڈیں تو 'تنقید' آپ کو نہیں ملے گا، کیسے ملے، وہاں تو نقد اور انتقاد اصل لفظ ہیں، باب تفعیل سے تنقیدی بنا لیا گیا۔ زلف تو سراسر فارسی لفظ ہے، اس لیے عربی قاعدے کے مطابق اسے مفعول مزلّف بنا لیا گیا۔ 'قرآن' بروزن مفعول ہے مگر فارسی کے اساتذہ نے بیسوں جگہ 'قُران' بروزن فعول نظم کیا ہے۔ ایسے لفظوں کو مفرس کہا جاتا ہے اور مفرس لفظ اردو میں بلا تکلف مستعمل ہوتے ہیں۔ 'قران' بھی استعمال میں آتا رہا ہے۔'' (ایضاً، ص 756)

اسی خط میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''یہ دلچسپ بات ہے کہ اردو میں جو عربی کے عالم گزرے ہیں، مثلاً مولانا شبلی، مولانا حالی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، ان سب کا کہنا یہی ہے کہ اردو ایک مستقل زبان ہے، اس کے اپنے قاعدے قانون ہیں، جس قدر لفظ اس میں مستعمل ہیں۔ خواہ عربی فارسی میں وہ دوسری طرح مستعمل ہوں یا سرے سے موجود ہی نہ ہوں یا عربی فارسی لفظوں کے قیاس پر بن گئے ہوں..... تمازت ایک لفظ ہے، یہ آپ کو عربی میں نہیں ملے گا، نہ فارسی میں۔ بدلا، تبادلہ، تبدیلی، ان میں سے کوئی بھی لفظ آپ کو عربی میں نہیں ملے گا۔ غلطی، زیادتی، نورچشمی جیسے لفظ میں صرف اردو میں ملیں گے۔ آراضی، باغات، زمیندار فوجداری جیسے بیسیوں لفظ ہیں اور یہ سب آپ کو اردو ہی ملیں گے۔ عادی آپ کو عربی میں ملے گا وہاں اس معنی میں معتاد ہے۔ شکریہ آپ کو نہ فارسی میں ملے گا نہ عربی میں۔'' (ایضاً، ص 756)

لسانی اعتبار سے عربی کے سامی خاندان کی زبان اور فارسی کو ہند ایرانی خاندان کی زبان کی صراحت کر کے رشید حسن خاں نے ان زبانوں کے مابین اختلافات کو ان زبانوں کے اندر محدود کر دیا اور یہ بھی کہا کہ اس اختلاف کے باوجود فارسی نے بہت سے عربی الاصل الفاظ کو اپنے مزاج و منہاج کے مطابق قبول کیا ہے۔ اس میں کسی کو تردد بھی نہیں تھا۔ یہیں سے یہ نکتہ بھی نکلتا ہے کہ اردو بھی ایک ہند آریائی خاندان کی زبان ہے، جس نے نہ صرف اپنے ہم رشتہ ہند آریائی زبانوں کے اثرات قبول کیے بلکہ دیگر سامی، ہند ایرانی و ہند یوروپی زبانوں کے اثرات بھی قبول کیے۔ اب ایسے میں اگر بقیہ زبانوں کے الفاظ کو اس کے اصل کے اعتبار سے اردو میں رائج کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اردو کی اپنی شناخت مٹ جائے گی، بلکہ زبان کے اندر ایک طرح کا فساد بھی جنم لے لے گا۔ رشید حسن خاں نے ڈاکٹر ٹی آر رینا کو لکھے ایک خط میں ان کو کچھ اس انداز سے مخاطب کیا ہے جو قارئین کی دلچسپی سے ہرگز خالی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

''لفظوں کا حال اشخاص جیسا ہوتا ہے، ویسی ہی شخصیت، ویسی ہی صفات اور ویسی ہی صلاحیتیں۔ جب ایک زبان سے دوسرے میں الفاظ منتقل ہوتے ہیں (اور یہ عمل مسلسل ہے، جاری رہتا ہے) تو ان کا احوال ان مہاجرین جیسا ہوتا ہے جو نقل وطن کر کے کسی اور ملک میں آباد ہو جاتے ہیں۔ ان مہاجرین پر قاعدے قانون تو اسی نئے ملک کے جاری ہوتے ہیں، مگر اس کی شکل صورت نہیں بدلتی، صرف طور طریقے بدلتے ہیں، اسی طرح ایسے مہاجر لفظوں کا تلفظ بدلتا ہے، معنی بھی بدل سکتے ہیں، ان میں اضافہ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، مگر ان کی صورت، یعنی املا اسی طرح نہیں بدلتا۔ اگر بعض تبدیلیاں ہوتی ہیں تو وہ ضمنی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ عربی سے جو لفظ آئے وہ اپنے حرف تہجی کو، یعنی اپنے املا کو ساتھ لے کر آئے، ث، ص، ض، ظ، ع، غ ایسی ہی آوازیں ہیں اس لیے وہ نہیں بدلیں، بدل بھی نہیں سکتیں۔ اب یوں دیکھو کہ ہندی کی ہکارہ آوازیں اردو میں آ گئیں۔ مگر اردو میں رھ، مھ، نھ، اس کی اپنی ہکارہ آوازیں ہیں، جو ہندی میں نہیں، ہندی والا کلہاڑی لکھے گا، مگر اردو میں کلھاڑی ہے۔ بات وہی کہ لھ کی آواز اردو میں ہے ہندی میں نہیں۔''

رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول): مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی 2011 ص 297)

یہاں پر رشید حسن خاں نے ہندی کی ہکاری آوازوں والے الفاظ کی مثال سے اپنی بات کو اچھی طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری زبان کے اثرات کو اس درجے میں قبول کرنے کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اردو نے نہ صرف ہندی کی ہکاری آوازوں کو قبول کیا ہے بلکہ رشید حسن خاں کے مطابق اس میں رھ، مھ، نھ اور لھ جیسی آوازوں کا اپنی ضرورت کے حساب سے اضافہ بھی کیا ہے۔ ایسے میں اردو پر کسی غیر زبان کے لفظ کو من و عن قبول کر لینے کو ایک طرح کا جبر ہی مانا جائے گا۔ چنانچہ وہ احتشام حسین ندوی کو لکھتے ہیں:

''عربی کے الفاظ و تراکیب اسی طرح صحیح ہیں جس طرح وہ اردو میں رائج ہیں۔ عربی یا فارسی میں ان کی صورت کیا ہے، یہ الگ بحث ہے۔ اردو کے ماہرین لسان اور ماہرین لسانیات کا اس پر اتفاق ہے کہ جو لفظ اردو میں آیا، وہ اردو کا ہو گیا۔ اب اس کی صحیح صورت وہی ہے جس طرح وہ اردو میں مستعمل ہے۔''

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد دوم): مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی، 2015 ص 62)

اردو میں دخیل الفاظ کو لے کر یہ باتیں کوئی ایسی بھی نہیں ہیں کہ جسے پہلی بار رشید حسن خاں کہہ رہے ہوں بلکہ ان سے بہت پہلے یہ بات علامہ شبلی نے اپنے مضمون 'املا اور صحت الفاظ' میں اور علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے مضمون 'تمہید' میں لکھ رکھی ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی دخیل لفظ کے معنی، تلفظ، جنس یا املا ہماری زبان میں وہ نہ ہوں جو اس زبان میں تھے جہاں سے وہ ہماری زبان میں آیا ہے۔ لیکن جب وہ ہماری ضرورت کے حساب سے ہماری زبان کا لفظ بن گیا ہے تو اسے ہم اپنے قواعد کے مطابق ہی برتیں گے۔ اس لیے اردو میں یہ تقریباً تسلیم شدہ اصول کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ جب کوئی لفظ ہماری زبان میں آ گیا ہے تو وہ لفظ اب ہمارا ہو گیا اور ہمیں اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھنا چاہیے جو اپنی زبان کے اصل الفاظ کے ساتھ ہم روا رکھتے ہیں، اس میں کسی قیل و قال کی گنجائش نہیں نکالنی چاہیے۔ جب ہم نے اسے اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق اپنے رنگ میں ڈھال لیا ہے اور اس پر اپنے قواعد جاری کر دیے ہیں تو پھر اسے بدیشی طرز پر استعمال کرنا اور اس پر اصرار ایک مضحکہ خیز امر ہے۔ ہر زبان اپنے نظام اور ذوق کے مطابق کسی بھی زبان کے الفاظ کو قبول کرنے میں آزاد ہوتی ہے، اس لیے اردو زبان نے بھی اپنے مزاج کے لحاظ سے دیگر زبان کے لفظوں کو اپنے لحاظ سے تراش خراش کر لیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اس تعلق سے مزید کسی بحث کو طول نہ دیا جائے۔

■

Dr. Mujahid Ul Islam
504/122, Tagore Marg, Near Shabab Market
Daliganj, Lucknow - 226020 (UP)
Mob.: 9628845713

محمد وحید الدین

داستانوں کے مافوق الفطری تصورات کا ٹکنالوجی میں اطلاق

کہانی سننا اور سنانا انسان کی فطرت میں شامل ہے شاید یہی وجہ ہے کہ انسان سماجی زندگی گزارنا پسند کرتا ہے تاکہ وہ اپنے روزمرہ کے واقعات، حادثات واپنی کارکردگی کو دوسروں کے سامنے پیش کرسکے اور اپنے کارناموں کی داد وتحسین حاصل کرسکے۔ دراصل یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں سے ایک کہانی جنم لیتی ہے۔ جیسے جیسے انسان تہذیبی ارتقا کے مدارج طے کرتا رہا ویسے ویسے یہ شوق بھی پروان چڑھتا گیا۔ آج سے ڈیڑھ سو دو سو سال قبل کے انسان کے پاس وقت کی فراوانی تھی اور وقت کو کاٹنے کا بہترین مشغلہ کہانی سننا ہی ہوا کرتا تھا۔ 'داستان سے افسانہ تک' میں وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

''کہانی انسان کے ان کارناموں کی روداد ہے جس میں اس نے اپنے ماحول کی کسی متصادم قوت کے مقابل آکر اس پر فتح حاصل کی ہے، کہانی انسان کے احساسِ برتری کی تسکین کا ذریعہ ہے، کہانی حقائق کی دنیا سے دور، تخیل تصور اور رومان کے ایک جہانِ تازہ کی تصویر ہے۔'' (داستان سے افسانہ تک، وقار عظیم، ص 6)

نثری اصناف کی سب سے قدیم صنف داستان ہے۔ داستانوں میں حقیقی زندگی کو چھوڑ کر زندگی کے باقی تمام لوازمات موجود ہوتے ہیں۔ ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں زندگی بسر کرے جہاں اس کو کسی قسم کے مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انسان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ وہ بے فکری سے ہواؤں میں جھولا جھولے اور ساری دنیا میں اس کا راج پاٹ ہو یا یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ دنیا اس کی مٹھی میں ہو۔ ایسی چیزیں صرف خواب وتصورات میں ہی ممکن ہوسکتی ہیں لیکن انسان کو ان تصورات میں لے جانے کا کام قدیم دور میں داستان گو کیا کرتے تھے اور جب داستانیں لکھنے کا رواج ہوا تو ان کو پڑھ کر لوگ ان کرداروں میں کھو جایا کرتے تھے۔ اس لیے مرزا غالب نے داستان کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

''داستان طرازی من جملہ فنونِ سخن ہے۔ سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے۔''

فرانس کے صنعتی انقلاب اور جدید ٹکنالوجی کی دریافت ان عقل سے پرے عناصر پر سے عوام کے یقین کو کم کرنے لگے اور انسان حقیقی زندگی گزارنے کی طرف مائل ہونے لگا۔ لیکن اب جدید ٹکنالوجی نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ کہانیوں کے وہ عناصر جو کہ عقل سے پرے دکھائی دیتے تھے ان کو حقیقت کے روپ میں ڈھالنے لگی اور جو چیزیں کسی زمانے میں ناممکن دکھائی دیتی تھیں جدید ٹکنالوجی نے اس کو ممکن کر دکھایا ہے۔ مثلاً 'کھل جا سم سم' کہنے پر دروازہ کا کھل جانا قدیم دور میں ایک حقیقت سے بعید تصور تھا لیکن آج ٹکنالوجی نے اس کو ممکن بنا دیا ہے۔ اس مضمون میں راقم ایسے ہی چند مافوق الفطری تصورات کے متعلق بات کرے گا جو کہ قدیم داستانوں میں پیش کیے گئے تھے جس کو ٹکنالوجی نے حقیقت میں تبدیل کردیا ہے یا اس کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔

کھل جا سم سم

الف لیلہ یا ہزار داستان کی کہانیاں آج سے کئی سو برس پہلے لکھی گئی تھیں لیکن اس کی مقبولیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ضرور اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس داستان میں بے شمار دلچسپ کہانیاں موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے چند کہانیوں کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ان ہی میں سے ایک 'علی بابا چالیس چور' کی کہانی ہے۔ اس کہانی کے مطابق۔

''شہر بغداد میں ایک سوداگر کے لڑکے قاسم اور علی بابا رہتے تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد دونوں بھائی الگ الگ رہنے لگے۔ قاسم اپنی محنت سے کامیاب تاجر بن کر اپنی زندگی ہنسی خوشی گزار رہا تھا۔ جبکہ علی بابا اپنی کاہلی اور فضول خرچی کی وجہ سے خالی ہاتھ ہوگیا تھا۔ جب حالات بہت خراب ہوگئے تو وہ لکڑیاں فروخت کرکے اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات پوری کرنے لگا۔ وہ روزانہ جنگل جا کر گدھوں پر لکڑیاں لادتا اور اس کو فروخت کرتا تھا۔ ایک روز وہ جنگل میں لکڑیوں کی تلاش میں وہ بہت دور نکل گیا۔ جہاں

ایک طرف گھنا جنگل اور دوسری جانب ایک چھوٹی پہاڑی تھی۔ علی بابا لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ سامنے سے اسے چند گھوڑا سوار دکھائی دیے۔ اس کو شک ہوا کہ کہیں یہ ڈاکو تو نہیں ہیں۔ اس نے اپنے گدھوں کو پہاڑی کے پیچھے چھپا لیا اور خود جھاڑ پر چڑھ گیا۔ اس کا شک درست نکلا وہ ڈاکو ہی تھے اور یہ اپنے ساتھ لوٹا ہوا مال لا رہے تھے۔ یہ تمام ڈاکو ایک غار کے قریب اتر گئے اور ان میں سے ایک ڈاکو نے آگے بڑھ کر کہا 'کھل جا سم سم' دروازہ فوراً کھل گیا اور تمام ڈاکو اندر چلے گئے اور دروازہ ازخود بند ہو گیا۔ علی بابا درخت پر سے یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکو غار میں سے نکل کر چلے گئے۔ اس کے بعد علی بابا جھاڑ پر سے اتر کر 'کھل جا سم سم' کو دہرایا اور غار میں داخل ہوا جہاں بے شمار اشرفیاں اور قیمتی اشیا بکھری پڑی تھیں۔ وہ غار میں سے اشرفیاں گدھوں پر لاد کر اپنے گھر کو لوٹ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کافی دولت مند ہو گیا۔

سنسر کی مدد سے ازخود کھلنے والا دروازہ

اس کہانی میں استعمال کیا گیا لفظ 'کھل جا سم سم' ہی کہانی کی دلچسپی کو دوبالا کرتا ہے۔ بادی النظر میں یہ عمل مافوق الفطری تصور ہی لگتا ہے۔ جس زمانے کی یہ کہانی ہے اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ 'کھل جا سم سم' کے الفاظ ادا کرنے پر غار کا دروازہ کھل جائے گا۔ لیکن جدید ٹکنالوجی نے اس کو حقیقت سے بہت قریب لا دیا ہے۔

اس طریقہ کار کا ہم روزمرہ کی زندگی میں مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کسی بڑے کمرشیل کمپلکس، ائیرپورٹ وغیرہ جاتے ہیں تو دروازے کے قریب پہنچتے ہی دروازہ ازخود کھل جاتا ہے اور ہم اندر داخل ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد دروازہ ازخود بند بھی ہو جاتا ہے۔ یہ عمل اس میں لگے ہوئے ایک چھوٹے سے sensor کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ اگر اس sensor میں 'کھل جا سم سم' کے الفاظ شامل کردیے جائیں تو عین ممکن ہے کہ دروازہ کھل جا سم سم کہنے پر کھل اور بند ہوسکتا ہے۔

الہ دین اور چراغ

الف لیلہ میں ہی ایک اور کہانی الہ دین کا چراغ ہے جس کی کہانی اس طرح ہے۔ چین کے دارالسلطنت پیکن میں ایک درزی مصطفےٰ کا بیٹا الہ دین رہتا تھا۔ غربت کی وجہ سے وہ مدرسہ نہیں جاسکتا تھا اس لیے اس کی تعلیم بھی نہیں ہوسکی۔ وہ دن رات گلیوں میں آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول رہتا تھا۔ لیکن الہ دین بہت ذہین اور ضدی لڑکا تھا۔ اپنی ضد پر اڑ جاتا تو وہ کسی کی نہیں سنتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گلی میں کھیل کود کر رہا تھا کہ ایک افریقی جادوگر نے اس سے مل کر کہا کہ وہ اُس کا چاچا ہے۔ یہ جادوگر اصل میں پیکن کے تہہ خانے میں موجود پرانا چراغ حاصل کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس چراغ کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں ایک طاقتور جن تھا اور جس کسی کے پاس بھی یہ چراغ رہے گا یہ جن اس کے تابع رہے گا۔ چراغ کے مالک کی طرف سے جو بھی حکم دیا جائے اسے بجا لاتا ہے۔ مگر اس تہہ خانے کے اندر ہر کوئی نہیں جاسکتا تھا۔ اس میں داخل ہونے کے لیے کچھ خوبیوں کا ہونا ضروری تھا۔ خوبیاں یہ تھیں کہ تہہ خانے میں جانے والے کی عمر 18 سال سے کم ہو، یتیم ہو، ضدی ہو اور باپ دادا پیشے سے درزی ہوں۔ انہی خوبیوں کے حامل شخص سے اس تہہ خانے کا داہنے کا پتھر ہٹتا تھا۔ یہ تمام خوبیاں الہ دین میں موجود تھیں۔ اس لیے جادوگر الہ دین کا استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ایک روز جادوگر الہ دین کو تہہ خانے میں جانے کے لیے راضی کرلیا اور اس کو بتایا کہ تہہ خانے میں تین برآمدوں کے بعد ایک باغ ہے اور اس باغ میں ایک شہ نشین بنا ہوا ہے اور اس کے طاق میں ایک چراغ جل رہا ہے۔ اُس چراغ کو لے کر آنا ہے، الہ دین وہاں پہنچ کر چراغ اپنی جیب میں ڈالا اور واپس تہہ خانے کے دہانے پر پہنچ گیا۔ جادوگر اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور الہ دین سے کہنے لگا کہ تم اب پیکن کے امیر ترین شخص بن جاؤ گے۔ اس کے بعد تہہ خانے سے باہر نکالنے کو لے کر دونوں میں بحث وتکرار شروع ہوگئی۔ جادوگر چاہتا تھا کہ الہ دین اس کو چراغ پہلے دے اور بعد میں تہہ خانے سے باہر آئے اور الہ دین پہلے تہہ خانے سے نکلنا چاہتا تھا اور اس کے بعد ہی یہ چراغ جادوگر کو حوالے کرنا چاہتا تھا۔ یہ اپنی ضد پر اڑ گیا اور چراغ حوالے نہیں کیا۔ جادوگر مارے غصہ کے تہہ خانے کا دہانہ بند کرکے چلا گیا۔ کسی طرح الہ دین اس غار سے نکل کر اپنے گھر پہنچ گیا اور ساری روداد اپنی ماں کو سنادی۔ الہ دین کی ماں ایک مرتبہ اس چراغ کو چمکانے کی خاطر راکھ سے رگڑ رہی تھی کہ ایک دیو قامت جن نمودار ہوا اور کہنے لگا کہ جو حکم ہوگا اس کی تعمیل کروں گا۔ ماں تو بیہوش ہوگئی لیکن الہ دین سمجھ گیا کہ وہ جادوئی چراغ ہے اور اس میں موجود جن اس کا موکل ہے۔ الہ دین اس جن سے بہت کام لے کر پیکن کا امیر ترین انسان بن گیا اور پیکن کے بادشاہ کی لڑکی سے شادی بھی رچالی۔

روبوٹ

یہ کہانی بھی ایک طلسمی کہانی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن جن کے ذریعے جو کام لیے جاتے ہیں وہ اس کہانی کی دلچسپی کو بڑھاتے ہیں۔ اب اس تصور کو ہم روبوٹ کی تکنیک میں دیکھتے ہیں۔ روبوٹ اور جن دونوں حکم کے منتظر ہوتے ہیں۔ روبوٹ' طلسماتی جن کی طرح بڑے بڑے کام انجام نہیں دے سکتا۔ لیکن گھریلو کاموں کو بہ خوبی انجام دے سکتا ہے۔ آج کل بازار میں کئی روبوٹ دستیاب ہیں جو کہ انسانوں کے مختلف کام انجام دے سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں ہمیں روبوٹوں کے مختلف نمونے اور کارکردگیاں دیکھنے کو ملیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ٹکنالوجی اس کہانی سے متاثر ہوکر تیار کی گئی ہو۔

مشینی گھوڑا

ہزار داستان میں ایک کہانی مشینی گھوڑے کی بھی ہے۔ اس کے مطابق ایران کا ایک بادشاہ عید نوروز کی تقاریب کافی جوش وخروش کے ساتھ مناتا تھا اور اس میں بہ نفس نفیس حصہ لیتا تھا۔ ان تقاریب میں دنیا بھر کے فن کار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور بادشاہ سے انعام و اکرام حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح کی ایک تقریب نوروز میں ہندوستانی فن کار نے ایک لکڑی کا گھوڑا پیش کیا۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ اس گھوڑے میں کیا خاص بات ہے۔ ہندوستانی فن کار نے بتایا کہ یہ گھوڑا مشینی ہے۔ انسان اس پر سوار ہوکر آسمان پر اڑسکتا ہے اور نیچے آسکتا ہے۔ بادشاہ حیران ہوا اور تجربہ پیش کرنے کو کہا۔ ہندوستانی کاریگر نے گھوڑے پر سوار ہوکر ایک گیئر ڈالا اور ہوا میں اڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ کچھ وقفے کے بعد صحیح وسلامت زمین پر واپس بھی آگیا۔ یہ منظر دیکھ کر بادشاہ متعجب اور عوام ششدر رہ گئی۔ بادشاہ نے فن کار سے کہا کہ یہ عجائبات عالم میں سے ایک ہے اور میں اس کو لینے کے لیے تیار ہوں۔ ہندوستانی کاریگر بتاتا ہے کہ اس گھوڑے میں کئی گیئر لگے ہوئے ہیں، جس سے گھوڑے کو اڑایا جاسکتا ہے اور نیچے لایا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی رفتار پر بھی قابو رکھا جاسکتا ہے۔

ہوائی جہاز کے گیئر

جدید ٹکنالوجی میں اس کا استعمال

اگر جدید ٹکنالوجی میں اس تصور کو تلاش کریں تو اس کے مماثل ہمیں ہوائی جہاز ملتا ہے۔ بین السطور میں مذکور ہوا کو ہندوستانی فنکار نے بتایا کہ اس میں کئی گیئر ہوتے ہیں جس سے رفتار پر قابو پایا جاسکتا ہے اور گھوڑے کو نیچے اوپر کیا جاسکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہوائی جہاز کو اڑانے، اتارنے اور رفتار پر قابو پانے کے لیے بھی کئی گیئر لگے ہوتے ہیں۔ رائٹ برادران نے 1903 میں ہوائی جہاز کو ایجاد کیا تھا۔ جبکہ الف لیلہ کی کہانیاں اس سے کئی برس قبل لکھی جاچکی تھیں۔ ہوائی جہاز کی تیاری میں رائٹ برادران نے اڑنے والے مشینی گھوڑے سے متاثر ہوکر ہوائی جہاز تیار کیا ہوگا۔

اڑنے والا غالیچہ یا قالین

داستان الف لیلہ میں ایک کہانی 'پری بانو اور شہزادہ احمد' کی ہے۔ کہانی کے مطابق ہندوستان کے کسی حصے میں ایک نیک دل بادشاہ رہتا تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے۔ حسین، علی اور احمد' بادشاہ ان تینوں سے یکساں محبت کرتا تھا۔ ان لڑکوں کی ایک چچازاد بہن نور النہار تھی۔ یہ لڑکی بے حد حسین وجمیل تھی۔ تینوں بھائی اس سے محبت کرتے تھے اور ہر ایک کی خواہش تھی کہ ان کی شادی نور سے ہو۔ بادشاہ کو جب اس بات کی خبر ہوئی کہ اس کے تینوں لڑکے نور سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو یہ بہت متفکر ہوا اور غور کرنے لگا کہ کس طرح اس معاملے کا منصفانہ حل نکالا جاسکتا ہے۔ اس کو ایک ترکیب سوجھی اور تینوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ تم لوگ سفر پر جاؤ اور میرے لیے تحفے لاؤ جس کا تحفہ سب سے عمدہ ہوگا میں اس کی شادی نور النہار سے کردوں گا۔ تینوں راضی ہوگئے اور اپنے اپنے سفر پر نکل گئے۔ ان شہزادوں میں بڑا حسین تھا۔ اس کو بش گڑھ دیکھنے کا بہت شوق تھا سو وہ اس طرف نکل گیا۔ جبکہ دوسرا شہزادہ علیؔ شیراز پہنچا اور تیسرا شہزادہ سمرقند پہنچا۔ تینوں شہزادوں نے اپنے باپ کے لیے منفرد ومختلف تحائف خریدے اور اپنی منزل کی طرف لوٹ گئے۔ حسین نے بش گڑھ سے ایک غالیچہ (قالین) خریدا۔ حسین بازار کی ایک دوکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک تاجر غالیچہ یا قالین لے کر آیا اور دوکان دار کو دکھا کر کہنے لگا کہ یہ غالیچہ 40 ہزار اشرفی میں برائے فروخت ہے۔ حسین اس کی اتنی اونچی قیمت سن کر متعجب ہوا اور تاجر سے پوچھنے لگا کہ اس میں ایسی کیا خوبی ہے کہ تم اتنی قیمت مانگ رہے ہو۔ تاجر نے کہا کہ یہ بہت ہی عجب چیز ہے اس پر بیٹھ کر جہاں کا حکم دیجیے فوراً یہ غالیچہ اس جگہ پہنچا دے گا۔ شہزادہ حسین یہ سن کر بہت خوش ہوا اور سوچنے لگا کہ والد کے لیے اس سے بہتر کوئی اور تحفہ نہیں ہوسکتا ہے۔ اس نے قالین کو منہ مانگا دام دے کر خرید لیا اور کئی دن تک اس پر سیر و سیاحت کرنے کے بعد اپنے ملک کے قریب پہنچ کر اپنے دوسرے بھائیوں کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے دوسرے دو بھائی اپنے اپنے مقام سے نایاب چیزیں لے کر وہاں پہنچے۔ علی نے ایک دوربین خریدا اس کی خوبی یہ تھی کہ جس چیز کی دیکھنے کی خواہش ہو اس میں دیکھنے سے ہزاروں میل دور ہونے پر بھی یہ آئینے کے سامنے آجاتا ہے تیسرے بھائی نے ایک مصنوعی سیب خریدا۔ اس سیب کی خصوصیت یہ تھی کہ قریب المرگ بیمار کو سنگھا دیا جائے تو وہ تندرست ہوجاتا ہے۔ جب تینوں بھائی ایک جگہ جمع ہوجاتے ہیں تو وہ اپنے اپنے تحفے ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں۔ تینوں کے تحفے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ایک روز انھیں نور النہار کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ علی نے اپنی دوربین سے نور کا حال دیکھا اور کہنے لگا کہ وہ سخت بیمار ہے اور سب اس کے گرد پریشان بیٹھے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر تینوں بھائی پریشان ہوگئے اور حسین کے غالیچے پر بیٹھ کر نور النہار کے دروازہ پر پہنچ گئے یہ منظر دیکھ کر بادشاہ ششدر رہ گیا۔ احمد نے اپنا مصنوعی سیب نکال کر نور النہار کو سنگھایا اس کو فوری ہوش آگیا۔ یہ تمام تحائف دیکھ کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔

Arcabore

یہ تمام تحائف طلسماتی ہیں لیکن اس کہانی میں استعمال ہونے والا غالیچہ اور دوربین توجہ کے مرکز ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اب طلسماتی نہیں رہیں جدید ٹکنالوجی نے اس کو حقیقت میں ڈھال دیا ہے۔ ہر شخص کا یہ خواب ضرور ہوتا ہے کہ وہ کھلی فضاؤں میں ہواؤں کے ذریعے اڑے جھومے لیکن یہ خواب صرف خواب ہی ہوا کرتے تھے لیکن Arcaspace نامی کمپنی نے ہوا میں اڑنے والا Arca board ہاور بورڈ تیار کیا ہے۔ ایک

اور کمپنی Zapata نے Fly board تیار کیا ہے۔ آر کا بورڈ 110 کیلوگرام وزن اٹھا کر ہوا میں گھوم سکتا ہے اور فلائی بورڈ انسان کو لے کر آسمان کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔ آر کا بورڈ 'قالین جیسی مماثلت رکھتا ہے۔ اگر اس تکنیک کو مزید ترقی دی جائے تو یقیناً یہ بورڈ قالین جیسی جسامت اور رفتار حاصل کر سکتا ہے۔ ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ تکنیک اور تصور یقیناً انھیں قدیم داستانوں سے حاصل کی گئی ہے۔ اسی کہانی میں ایک طلسماتی دوربین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ خواہش کے مطابق ہم جس کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ آئینہ کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کی بہترین مثالgoogle سرچ انجن کی ہوسکتی ہے۔ گوگل کے سرچ انجن میں اپنی خواہش کے مطابق جو کچھ دیکھنا چاہتے ہیں اس کو ٹائپ کر کے سرچ کرنے پر وہ تصویر کی شکل میں یا پھر ویڈیو کی شکل میں اسکرین پر نمودار ہو جاتا ہے۔

جمشید کا پیالہ

ایران میں ایک مشہور بادشاہ گزرا ہے جس کا نام جمشید تھا اس کا دور حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے آٹھ سو سال قبل کا ہے۔ جام جم یا جام جمشید کی کہانی ایران کی مشہور دیومالائی کہانیوں میں سے ایک ہے۔ یہ کہانی ایران کے پہلے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے بادشاہ جمشید سے متعلق ہے۔ سب سے پہلے اس کا ذکر ایران کے مشہور شاعر فردوسی نے اپنی شہرۂ آفاق نظم 'شاہنامہ' میں کیا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جمشید ایران کا چوتھا بادشاہ تھا۔ انھوں نے ایران پر تین سو سال سے زائد عرصے تک حکومت کی تھی۔ وہ دنیاوی اور روحانی طاقت کے مالک تھے۔ فردوسی نے لکھا ہے کہ اس کے دور میں بے شمار ایجادات ہوئی تھیں مثلاً ہتھیار، تعمیراتی اینٹیں، سلک اور اون کے کپڑے، زیورات، قیمتی پتھر، معدنیات، خوشبو، شراب، جہاز رانی وغیرہ۔ فردوسی نے بتایا ہے کہ جمشید کی شہرت کا اصل سبب اس کا پیالہ تھا۔ اس کے پیالے کے کئی نام ہیں جیسے جام جم، جام جمشید، جام جہاں نما، وغیرہ۔ اس پیالے کی خاصیت یہ تھی کہ جمشید اس کو گردش دے کر ساری دنیا کے حالات کا پتہ چلا لیتا تھا۔ اس پیالے میں وہ ساری دنیا کا نظارہ کرتا تھا۔ آج اگر اس پیالے کا تصور بھی ذہن میں لایا جائے تو ایک انہونی بات لگتی ہے کہ کیسے کوئی شخص دنیا بھر کی معلومات ایک پیالے کی مدد سے دیکھ سکتا ہے۔

لیکن آج جدید ٹکنالوجی کے دور میں آئی پیڈ اور انٹرنیٹ نے اس کو ممکن کر دکھایا ہے۔ آئی پیڈ یا کمپیوٹر میں انٹرنیٹ کی مدد سے دنیا جہاں کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ کی مدد سے آئی پیڈ پر کیا کچھ نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ ساری دنیا کی خبر گیری چند لمحوں میں کر سکتے ہیں۔ کسی بھی خوبصورت ملک کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ گھر بیٹھے جدید علوم سے آگہی حاصل کر سکتے ہیں۔ دور بیٹھے لوگوں سے بالمشافہ ملاقات کر سکتے ہیں۔ اسمارٹ فون کی ایجاد نے تو اب ہر انسان کے ہاتھ میں جام جم تھما دیا ہے۔ یہ دور حاضر کا جام وہ سب کچھ بتا دیتا ہے جو انسان کچھ برسوں قبل تک سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ہم شکل اختیار کرنا

ملا وجہی نے 17 ویں صدی کی ابتدا میں داستان سب رس لکھی۔ اس داستان میں بھی کئی مافوق الفطری واقعات ملتے ہیں۔ جیسے انگوٹھی کی مدد سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہنا، بال جلا کر کسی کو بھی بلانا اور ساتھ ہی ساتھ سحر سے مسحور کر دینے والے کئی واقعات ملتے ہیں۔ سحر سے مزین ایک واقعہ اس میں پیش کیا گیا ہے۔ داستان سب رس کا پورا قصہ حسن و دل کے عشق اور آب حیات کی تلاش پر مبنی ہے۔ شہر سیستان کا بادشاہ عقل تھا اور اس کا بیٹا دل جبکہ حسن شہر دیدار کے بادشاہ عشق کی بیٹی تھی۔ عقل اور عشق کے درمیان کچھ بدگمانیوں کی وجہ سے دونوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے۔ جنگ میں عقل بادشاہ کو شکست ہوتی ہے اور دل کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ حکم صادر کر دیا جاتا ہے کہ اس کو طوق پہنا کر قید خانے میں مقید کر دیا جائے۔ حسن، دل کے دیدار کے لیے بہت بیقرار رہتی ہے۔ حسن دل کو اپنی ساحر سہیلی کی مدد سے قید خانے سے نکال کر ایک کنویں میں چھپا دیتی ہے۔ اس کے بعد حسن ہر شام دل سے تنہائی میں ملاقات کرتی ہے اور دونوں میں راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اور تنہائی کے مزے لوٹتے تھے۔ حسن کے ساتھ غیر نامی لڑکی بھی ہر وقت ساتھ رہتی تھی لیکن جب وہ دل سے ملاقات کے لیے جاتی تو وہ اپنے ساتھ اسے نہیں رکھتی تھی اس لیے اس کو شک ہونے لگا۔ ایک دن وہ حسن کا تعاقب کرتے ہوئے اس رازدارانہ مقام تک پہنچ جاتی ہے جہاں حسن، دل سے ملاقات کرتی ہے اور تنہائی میں مزے لوٹتی ہے۔ یہ منظر اور دل کی خوبصورتی دیکھ کر غیر بھی اس پر فریفتہ ہو گئی اور اس کے دل میں بھی دل کے ساتھ ملاقات کر کے مزے لوٹنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ایک دن حسن کہیں شہر کے باہر گئی اور آنے میں اس کو تاخیر ہو گئی۔ حسن کی غیر موجودگی کو غیر بہت ہی مناسب وقت جان کر سحر کی مدد سے حسن کی شکل اختیار کر لی۔ اس راز درانہ مقام پر پہنچ کر دل سے ملاقات کے مزے لوٹنے لگتی ہے۔ اسی دوران دونوں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر سے دل کو حسن قید میں بند کر دیتی ہے۔ بعد میں غیرؔ اقرار کرتی ہے کہ اس نے ہی حسن کا بھیس بدل کر دل سے ملاقات کی تھی۔

Coloning

یہ واقعہ مکمل طور پر سحر پر ہی مبنی ہے، غیر نے سحر کے ذریعے ہی اپنے آپ کو حسن کا ہم شکل بنا لیا تھا۔ جدید ٹکنالوجی اس تصور کے بھی بہت قریب پہنچ چکی ہے۔ آج دنیا میں سب سے زیادہ بحث کلوننگ (Coloning) پر ہو رہی ہے۔ کلوننگ کا طریقہ پیدائش سے قبل کا ہے۔ لیکن اس کے ذریعے ہم شکل پیدا کیے جاتے ہیں۔ مختلف سائنس داں اس پر مسلسل تجربے کر رہے ہیں۔ اس میں مزید چونکا دینے والے نتائج آ سکتے ہیں۔ کلوننگ کا یہ طریقہ سحر کے ذریعے شکل اختیار کرنے کے عمل سے متاثر دکھائی دیتا ہے۔

یہ بات صد فیصد درست ہے کہ سائنس اور فکشن دو متضاد تصورات ہیں' سائنس حقیقی عناصر سے بحث کرتی ہے جبکہ فکشن خیالی و تصوراتی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جب تک سائنس کو کوئی تصور نہیں ملتا وہ اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی۔

قدیم داستانوں میں اور کئی ایسے قصے کہانیاں ہو سکتی ہیں جو کہ کسی وقت میں فرسودہ اور مافوق الفطری رہے ہوں گے۔ لیکن جدید ٹکنالوجی نے ان تصورات کو ممکن کر دکھایا ہے۔ اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

■

Mohd Waheeduddin
Asst. Prof. Urdu
Indira Priyadarshini Govt. Degree College Nampally,
Hyderabad- 500001 (Telangana)
Mob.: 9885059195

برج پریمی

چند تاثرات

پریمی رومانی

ڈاکٹر برج پریمی اردو کے معروف نقاد اور محقق تھے۔ ادبیات کے موضوع پر ان کی دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ادب کے علاوہ وہ کشمیریات سے بھی گھرا لگاؤ رکھتے تھے۔ انھوں نے کشمیر کی تاریخ، ثقافت اور ادب کے بیش بہا پھلوؤں کو اردو قارنین تک پھنچانے کا گراں قدر کارنامہ انجام دیا ھے۔ ان کے قابل قدر علمی اور ادبی کارناموں کے پیش نظر جموں وکشمیر کلچرل اکادمی، یوپی اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی اور آل انڈیا ھندی اردو سنگم نے انھیں وقتاً فوقتاً گراں قدر اعزازات سے نوازا۔

ریاست جموں وکشمیر صدیوں سے علم وادب کا گہوارا رہی ہے۔اس میں ایسے ان گنت افسانہ نگار، شاعر، ادیب، دانشوراور صحافی پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی گوناگوں تخلیقات سے اردو زبان وادب کو مالا مال کیا۔ وہ علم وادب میں ایسے نقش پا چھوڑ گئے ہیں کہ ان کے ذکر کے بغیر اردو کی کوئی بھی ادبی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ان تخلیق کاروں نے اردو زبان وادب کی خدمت گزاری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ اقبال، چکبست، دیا شنکر نسیم، شرر، تربھون ناتھ ہجر، آغا حشر کاشمیری، آنند نرائن ملا، راما نند ساگر قدرت اللہ شہاب، چراغ حسن حسرت، سعادت حسن منٹو کے ساتھ ساتھ کشمیر میں رہ کر جن کشمیری قلم کاروں نے اس زبان کی آبیاری کی ان میں پریم ناتھ پردیسی، لالہ ملک راج صراف، طالب کاشمیری، کشن سمیلپوری، شہہ زور کاشمیری، مرزا کمال الدین شیدا، میر غلام رسول نازکی، حامدی کاشمیری، حکیم منظور، عابد مناوری محمد یوسف ٹینگ، اکبر حیدری وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ایسے ہی قلم کاروں میں ڈاکٹر برج پریمی کا نام بھی نمایاں طور پر لیا جاتا ہے، جنھوں نے اپنی گوناگوں تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اردو زبان وادب کی بے پناہ خدمت کی اور نہ صرف ریاست میں ہی اپنا نام روشن کیا بلکہ ریاست سے باہر بھی اپنی چھاپ ڈال دی۔ڈاکٹر برج پریمی راقم السطور کے والد بزرگوار تھے۔ان کا اصلی نام برج کشن ایمہ ہے۔ وہ 24 ستمبر 1935 کو درابی یار حبہ کدل سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ان کے والد پنڈت شام لال ایمہ اپنے عہد کے ایک معروف قلمکار ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی کارکن بھی تھے۔ وہ اردو اور فارسی کا شستہ مذاق رکھتے تھے برج پریمی کے ذوق سلیم کونکھارنے میں ان کا گہرا ہاتھ رہا ہے۔14 سال کی عمر میں برج پریمی والد کے سائے سے محروم ہوگئے۔ان کے بے وقت انتقال کے بعد مشہور افسانہ نگار پنڈت پریم ناتھ پردیسی (مرحوم) نے ان کے ذوق ادب کی تہذیب کی۔لیکن یہ رشتہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ بلکہ انھوں نے اپنے مطالعے اور مشاہدے کو ہی اپنا رہنما بنایا۔

ڈاکٹر برج پریمی بنیادی طور پر ایک کہانی کار تھے۔ وہ برسوں تک کئی ادبی انجمنوں کے ساتھ وابستہ رہے۔ 1976 میں انھوں نے سعادت حسن منٹو۔حیات اور کارنامے کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا جس پر انھیں کشمیر یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ برصغیر ہندو پاک کے نامور ناقدین گرامی کے مطابق یہ تحقیقی مقالہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ تصور کیا جاتا ہے

ڈاکٹر برج پریمی اردو کے معروف نقاد اور محقق تھے۔ادبیات کے موضوع پر ان کی دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ادب کے علاوہ وہ کشمیریات سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔انھوں نے کشمیر کی تاریخ، ثقافت اور ادب کے بیش بہا پہلوؤں کو اردو قارئین تک پہنچانے کا گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ان کے قابل قدر علمی اور ادبی کارناموں کے پیش نظر جموں وکشمیر کلچرل اکادمی، یوپی اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی اور آل انڈیا ہندی اردو سنگم نے انھیں وقتاً فوقتاً گراں قدر اعزازات سے نوازا۔

وہ کشمیر کے عاشق تھے اور کشمیر کے کلچر، تہذیب وتمدن اور ادب کے گوناگوں موضوعات پر کافی کام کرچکے تھے اور اس طرح سے انھوں نے کشمیر کی تاریخ وتمدن، کلچر اور ثقافت کے بعض گمنام گوشوں کو منور کیا، اسی لیے وہ کشمیر شناس کے نام سے بھی جانے اور پہچانے

جاتے ہیں۔ خود مادر کشمیر کی نقاب کشائی اس طرح سے کرتے ہیں:

''کشمیر میری جنم بھومی ہے، میری ماں ہے
اس کے ہر ذرہ خاک سے مجھے عشق ہے
اس کے نیلے امبر کے نیچے، اس کے سرسراتے ہوئے آنچل میں
کتنے رنگ ہیں کتنی خوشبو ہے، کتنی روشنی ہے
یہ من کو موہ لینے والا حسن حیرت زا ہے
میں نے اس رنگ اس نور اور اس خوشبو کے لمس کے مٹھی بھر
احساس کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے
لیکن اس کی حدت کے آگے میرے لفظ پگھل گئے ہیں''

ان کی کشمیر شناسی کا ثبوت نہ صرف اس اقتباس سے ملتا ہے بلکہ ان کی کئی تحریروں میں اس کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ افسوس کہ وہ جموں میں 2 اپریل 1990 میں اچانک انتقال کر گئے۔ کشمیر کے معروف شاعر محمد ایوب بیتاب اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''پریمی کو کشمیر کے ذرے ذرے سے عشق تھا۔ جو ان کی نگارشات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ نامساعد حالات کی وجہ سے پریمی کو کشمیر چھوڑنا پڑا جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ وطن کی جدائی اس کے دل ناتواں سے برداشت نہ ہو سکی اور وہ اندر ہی اندر سے بکھر کے رہ گیا مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اس کی بے وقت موت کی وجہ فراق کشمیر تھی''

(برج پریمی: شخصیت اور فن، مرتب: ڈاکٹر پریمی رومانی ص 44، سنہ اشاعت 2003، رچنا پبلی کیشنز: جموں (توی)

ڈاکٹر برج پریمی نہ صرف ایک محقق و نقاد تھے بلکہ وہ اعلا پائے کے ادیب، انشا پرداز، خاکہ نگار منٹو شناس اور کشمیر شناس کے نام سے بھی جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ ان کا پہلا افسانہ 'آقا' 1949 میں سری نگر کشمیر سے شائع ہونے والے اخبار روز نامہ امرجیوتی، میں شائع ہوا۔ والد محترم نے بے شمار افسانے لکھے جن میں، ننھی کہانیاں، میرا گنوار دوست، ناکام محبت، جھلکیاں، لہریں اور کنارہ، یہ بھی ایک کہانی ہے، ولر کے کنارے پر، شرنارتھی، اس کی موت، فرض، ماں سبل جب سوکھ گیا، میرے بچے کی سالگرہ، سپنوں کی شام، پھٹی پھٹی آنکھیں، یہ گیت یا مزار، ٹیسیں درد کی لمحوں کی راکھ، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ افسانے ہندوستان کے معروف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی بعض کہانیاں ماہنامہ بیسویں صدی میں شائع ہوئیں۔ 'سپنوں کی شام' ان کی ایک نمائندہ کہانی ہے۔ جو ماہنامہ بیسویں صدی کے مئی 1957 کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کہانی انھوں نے حلقہ ارباب ذوق کے زیر اہتمام منعقدہ ایک ادبی اجتماع میں پیش کی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا بھی کسی واقف کار کے پاس رہائش پذیر تھے اور سری نگر کی ادبی محفلوں سے لطف اندوز ہوتے تھے، انھوں نے اس کہانی کی زبان کی کافی داد دی اور اس کو ایک اہم کہانی قرار دیا۔ برج پریمی کی ایک اور کہانی، میرے بچے کی سالگرہ ہے جو انھوں نے 1958 میں تخلیق کی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، والد کی اس کہانی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب 'کشمیر میں اردو' میں لکھتے ہیں:

سپنوں کی شام فضا اور موقف کے اعتبار سے پریمی کا اچھا افسانہ ہے۔ اس میں شہر کی نکھری ہوئی فضا ملتی ہے۔ یہ اوموپورہ کے ایک سکول ٹیچر کی کہانی ہے جو اپنے صاحب خانہ کی لڑکی ساجھی اور اس کی سہیلی نوری کو رات میں الاؤ کے قریب بیٹھا کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ ایک دن ساجھی جب پہاڑ کے ڈھلوان پر سے اتر رہی تھی۔ بارش میں بھیگ کر مٹی کا ایک بڑا تودہ چٹان سمیت گرنے کو تھا۔ ماسٹر خدائی فوجدار کی طرح وہاں پہنچ گیا اور ساجھی کو موت سے نجات دلائی، اس کے بعد سے ساجھی کو اپنے نجات دہندہ سے انس ہو جاتا ہے'' (کشمیر میں اردو تیسرا حصہ، ص 198)

میرے بچے کی سالگرہ، لہریں اور کنارہ، لمحوں کی راکھ، خوابوں کے دریچے وغیرہ والد صاحب کے نمائندہ افسانے ہیں، جن میں انسان کا درد و کرب، اس کی بے چینی اور کسمپرسی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عام انسانوں کی غربت اور افلاس سے پیدا ہونے والے مسائل صاف طور پر انسان کے ماتھے پر جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی کا دوسرا پڑاو ان کی تحقیق و تنقید ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ والد صاحب اگرچہ شروع سے ہی تنقیدی اور تحقیقی ذہن لے کر آئے تھے لیکن پروفیسر سروری صاحب کی صحبت میں رہ کر انھیں ادب کے اس میدان سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس لیے انھوں نے بعد کے دور میں افسانے بہت کم لکھے۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے اور خاص و عام میں مقبول ہو گئے۔

پریمی کو کشمیر کے ذرے ذرے سے عشق تھا۔ جو ان کی نگارشات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ نامساعد حالات کی وجہ سے پریمی کو کشمیر چھوڑنا پڑا جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ وطن کی جدائی اس کے دل ناتواں سے برداشت نہ ہو سکی اور وہ اندر ہی اندر سے بکھر کے رہ گیا مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اس کی بے وقت موت کی وجہ فراق کشمیر تھی۔

'حرف جستجو' کے نام سے ان کا اولین تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ 1982 میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں ان کے 14 مقالات شامل ہیں۔ جن میں پریم چند، سعادت حسن منٹو، دو زاویے تکون کے، منٹو اور کرشن چندر، اردو کے چند قد آور افسانہ نگار، اور مختصر افسانہ اور خواتین جیسے تحقیقی مقالات شامل ہیں، پروفیسر شکیل الرحمٰن اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر برج پریمی چھوٹی بڑی اصطلاحوں سے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، ان کی تنقید لفاظی پسند نہیں کرتی۔ وہ جملے باز نہیں دور کی کوڑی لانے کی کوشش نہیں کرتے بوجھل ترکیبوں میں بات نہیں کرتے بلکہ مختصر اور آسان جملوں میں اپنے خیالات پیش کرتے ہیں اور یہی بڑی بات ہے''

(حرف جستجو از ڈاکٹر برج پریمی ص 8 دیپ پبلی کیشنز: سری نگر، سنہ اشاعت 1986)

اس کتاب کو بھی سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی۔

کشمیر کے کلچر، تہذیب، تمدن اور یہاں کی ثقافتی سرگرمیوں پر ڈاکٹر برج پریمی کے بہت سے معنی خیز مقالات ہندو پاک کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالات بعد میں ان کے دو مجموعوں 'کشمیر کے مضامین' اور 'جلوۂ صد رنگ' میں کتابی صورت میں منظر عام پر آ گئے۔ جن کی کافی پذیرائی ہوئی۔ کشمیری اور اردو زبان کے معروف محقق اور نقاد محمد یوسف ٹینگ جلوۂ صد رنگ پر اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''میں پھر پریمی کی اس کتاب کی کشمیریات سے متعلق عام قاری کے لیے اہمیت پر زور دینا چاہتا ہوں۔ مجھے فوق کے بعد اردو میں اس قسم کی ایک اور کتاب کا علم ہے اور وہ ہے مظفر آباد کے ڈاکٹر صابر آفاقی کی تصنیف جلوۂ کشمیر کا... پریمی کا طرز بیان

دلکش ہے اوراس نے کشمیر کی تواریخ کے ہزار ہا صفحات کو چھان کر چند کپسول (Capsul) قسم کی معلومات اس طرح ابھاری ہیں کہ کشمیر اور اس کے لوگوں کے تواریخی اور تمدنی سفر کے نت نئے گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب اپنی مقبولیت سے اپنا جواز ثابت کرے گی۔''

والد صاحب کا ایک اورادبی کارنامہ سعادت حسن منٹو پر ایک مکمل اور مبسوط کتاب ہے۔ یہ دراصل ان کا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی ہے۔ جو 1986 میں پہلی بار اشاعت پذیر ہوا۔ اس تحقیقی مقالے پر انھیں یو پی اور مغربی بنگال اردو اکادمیوں کی طرف سے گراں قدر اعزازات سے نوازا گیا۔ منٹو ان کا محبوب فنکار تھا۔ یہ موضوع انھوں نے اس لیے بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا، کیونکہ ان کے مطابق منٹو کشمیر کے خلاق ذہن کی پیداوار تھے۔ وہ کشمیری پنڈتوں کی سارسوات برہمن شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ والد مرحوم نے منٹویات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے اس موضوع کو اپنے تحقیقی مقالے کا محور بنایا۔ انھوں نے منٹو خاندان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری حاصل کرنے کے لیے صفیہ منٹو کے ساتھ ساتھ معاصرین منٹو سے خط و کتابت کی اور اس موضوع پر دلجمعی کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ لیکن اس کام کو پایہ تکمیل تک لانے کے لیے انھیں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اس وقت تک منٹو کے بارے میں کوئی مستند کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ رسائل و جرائد کے بعض خاص نمبرات پاکستان میں شائع ہو چکے تھے لیکن اس زمانے میں ہند و پاک کے سیاسی تعلقات کشیدہ تھے اور پاکستان سے منٹو کی کتابیں حاصل کرنا بہت ہی دشوار گزار مرحلہ تھا۔

منٹو کو رجعت پسند، سنکی، پاگل، اور لطیفہ باز قرار دیا گیا تھا۔ جدیدی انھیں ترقی پسند قرار دیتے تھے اور ترقی پسند انھیں رجعت پسند سمجھ کر نظر انداز کرتے تھے اور انھیں اپنانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ برج پریمی منٹو کے اولین نقاد اور محقق ہیں جنھوں نے انھیں صحیح تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس بات کی تصدیق برصغیر ہند و پاک کے معتبر نقادوں اور منٹو کے معاصرین نے کیا اور برج پریمی کی اس کتاب کی دل کھول کر داد دی۔ چند آرا پیش خدمت ہیں:

پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی): ڈاکٹر برج پریمی اردو کے ان معلمین میں سے ہیں جو خاموشی سے علمی کام کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے سعادت حسن منٹو کا مطالعہ نہایت دِلسوزی سے کیا ہے۔

کالی داس گپتا رضا (بمبئی): کتاب ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ منٹو پر مواد آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ مگر آپ نے کافی محنت کی ہے۔ آپ نے اتنا کچھ یکجا کر دیا ہے کہ اس سے ہر نیا کام کرنے والا مستفید ہو سکتا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں): آپ نے منٹو مرحوم کے بارے میں ایک انسائیکلو پیڈیا تیار کر دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ منٹو پر کام کرنے والا کوئی طالب علم، کوئی اہلِ قلم اس صحیفے کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

وارث علوی: منٹو کی زندگی اور کارناموں پر پہلی تحقیقی اور جامع کتاب ڈاکٹر برج پریمی نے لکھی۔ اس میں انھوں نے منٹو کی وجہ تسمیہ کا سراغ ان کی ہمنی اصل میں لگایا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافے کے ساتھ 2013 میں شائع ہوا۔

1987 میں برج پریمی کا ایک اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'ذوق نظر' اشاعت پذیر ہوا اس میں ان کے گیارہ مقالات شامل ہیں جن میں اردو کہانی کے بدلتے ہوئے رنگ، پریم ناتھ پردیسی۔ شخص اور فنکار، منٹو فکر و فن کے چند پہلو، منٹو اور شراب، سردار جعفری اور قومی یکجہتی، پریم ناتھ پردیسی کی شاعری، کشمیر میں اردو تنقید، عبدالقادر سروری، نندلال کول طالب، سعادت حسن منٹو اور ہندوستانی فلم وغیرہ جیسے مقالات شامل ہیں۔ اس مجموعے کے پیش لفظ میں وہ خود رقمطراز ہیں:

''مجھے پیشہ ور ناقد اور محقق ہونے کا دعویٰ نہیں۔ البتہ فن، ادب، ثقافت اور آرٹ کے مختلف شعبوں سے گہری دلچسپی ہے۔ ان کے بارے میں غور و فکر کرتا رہتا ہوں اور اپنا ردعمل اپنی تحریروں میں پیش کرتا ہوں۔''

''کشمیر کے مضامین ان کا ایک اور تنقیدی و تحقیقی کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر پریمی صاحب اپنے مادر وطن سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ اس کے کلچر، تہذیب و تمدن اور ادب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے پر مصر تھے۔ ان کے مطابق ''کشمیر کے حسن اس کی رعنائی، اس کی مٹی کو خوشبو، اس کے عرفان کے کتنے لازوال گوشے ہیں جن کو ہماری بے اعتنائی کے دبیز پردوں نے چھپا لیا ہے۔'' کشمیر کے مضامین میں وہ ان گمنام گوشوں کو نئے سرے سے دریافت کرتے ہیں جو ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئے ہیں۔ اس مجموعے کی بھی اردو دنیا میں کافی پذیرائی ہوئی ہے۔

'چند تحریریں' برج پریمی کا ایک اور مجموعہ 1988 میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ مجموعہ ان کی گوناگوں تخلیقات کا نمونہ ہے۔ اس مجموعے کو انھوں نے سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں تحقیق و تنقید، مختصر سفر نامہ، انشائیے، دیومالا سے، ترجمہ، فلم اور نثری مرثیے شامل ہیں۔ چند تحریروں کے بعض خاص مقالات میں تحریک آزادی اور اردو ادب، اردو فکشن اور قومی وحدت، قومی وحدت اور اردو شاعری، منٹو اور شراب، ان کے انشائیوں میں ''باتیں توہمات کی، قدیم اخلاقی قدریں اور جدید سماجی تقاضے، دیو مالا کے زمرے میں آنے والی تخلیقات میں کتھا کہانی (مہابھارت سے) کتھا کہانی (رامائن سے) فلم کے گوشے میں آنے والے مقالات ہماری فلموں میں ہندوستانیت، ہندوستانی فلم میں خواجہ احمد عباس کا حصہ، اوپیندر ناتھ اشک اور ہندوستانی فلم وغیرہ شامل ہیں۔ جو تنقید، تحقیق، ادب اور فلم کے شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اس مجموعے کی بھی خاصی پذیرائی ہوئی اور سنجیدہ ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔

مقالے کے اختتام پر میں اردو کے ایک منفرد انداز کے افسانہ نگار، خاکہ نگار اور ناول نگار مرحوم کشمیری لال ذاکر کا ایک اقتباس درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انھوں نے کشمیری پنڈتوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر برج پریمی کے کشمیر سے ہجرت کرنے کی کرب ناک داستان کا منظر پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کشمیری پنڈت کی وادی سے ہجرت ایسا المیہ ہے جس پر وادی کے چشمے اور جھیلیں، چنار اور سفیدے کے اونچے اونچے درخت مدتوں تک آنسو بہاتے رہیں گے۔ برج پریمی بھی اس سانحے کا شکار ہوا۔ اپنا سب کچھ لٹا کر، اپنے کنبے کے ہمراہ بری حالت میں جموں پہنچا۔ لیکن کشمیر تو برج پریمی کی جان تھی۔ اس ہجرت نے آخر اس کی جان لے لی۔ پریمی رومانی کے مطابق وہ جموں پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ہجرت کے ناقابل برداشت صدمے کے بوجھ سے دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے اور اپنے سارے خاندان کو ناگفتہ بہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اکیلا چھوڑ گئے''

(سہ ماہی عالمی میراث، گوشہ پدم شری کشمیری لال ذاکر جلد 14، شمارہ 4، جنوری 2022 تا اپریل 2022، مدیر ڈاکٹر سبھاش چندر، ایم ص 45)

■

Dr. Premi Romani
1806-D, Asawari Nanded City
Sinhgad Road
Pune- 411011 (Maharashtra)
Mob.: 7889930656

محمود بیگ ساز برہانپوری

مسعود بیگ تشنہ

مرزا محمود بیگ ساز برہانپوری شہر برہانپور (مدھیہ پردیش) کی بیسویں صدی کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک شخصیت ہیں۔ یہ وہی شہر ہے، جو پارچہ بافی، کپڑا ملوں، سائزنگ ملوں، جننگ ملوں، کپاس، کیلا اور گنا کی پیداوار اور منڈی کے لیے جانا جاتا ہے۔ یہ وہی شہر ہے، کسی زمانے میں جہاں کے ریشم کا کپڑا ڈھاکہ کے ریشم سے بھی مہین ہوتا تھا۔ اسی ریشم کی صنعت سازی کے لیے مشہور ایک محلے کا نام بھی اسی لیے 'حریر پورہ' پڑا۔ اسی محلے حریر پورہ میں ساز برہانپوری کے جد امجد نے بود و باش اختیار کی۔ عشق و محبت، روحانیت اور علم و ادب کا گہوارہ رہے اسی تاریخی شہر میں ساز برہانپوری نے یکم جولائی 1922 کو جنم لیا۔ پندرہ سال کی عمر سے شاعری کرنے لگے اور اپنا تخلص ساز رکھا، محبت کا ساز بجایا اور محبت، بھائی چارہ اور پاس داری کا ایسا راگ چھیڑا کہ سارے عالم میں ساز برہانپوری مشہور ہوئے۔

ساز برہانپوری ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے شعر و ادب، سیاست، سماجی خدمات، عوامی زندگی، صحافت اور تعلیمی میدان میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ موریس کالج، ناگپور سے اسکولی تعلیم کے بعد بی اے آنرز کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ تشریف لے گئے جہاں شکیل بدایونی ان سے سینئر طالب علم موجود تھے جو بعد میں مشہور فلمی نغمہ نگار بنے۔ دونوں اپنی اپنی وجوہات سے علی گڑھ سے نکلے اور برطانوی حکومت کے سِوِل سپلائیز کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ جلد ہی دونوں نے اپنی اپنی نوکری چھوڑ دی۔ شکیل بدایونی دہلی سے بامبے (اب ممبئی) فلمی نغمہ نگاری کے لیے آ گئے۔ سیاسی حالات کی وجہ سے اُن دنوں فیملی کے ساتھ بامبے رہنا محفوظ نہیں تھا، اس لیے ساز برہانپوری اپنے والد کے حکم سے بامبے سے اپنے وطن برہانپور لوٹ آئے۔ یہاں آ کر ضلع نماڑ میں فوڈ انسپکٹر کی نوکری کی اور اسے بھی چھوڑ کر بالآخر برہانپور میں درس و تدریس کا مستقل پیشہ اپنا لیا اور قادریہ بوائز ہائر سیکنڈری اسکول میں لیکچرار ہو گئے اور بعد میں وائس پرنسپل۔ برہانپور میں جب سائنس کالج کھلا تو بوہرہ سماج کے اسی ادارے 'التعلیم' کے زیر انتظام قادریہ سیفی گولڈن جوبلی بوائز سائنس کالج میں انگلش اور قادریہ گرلس کالج اور ڈپٹی ٹیچرس ٹریننگ انسٹیٹیوٹ (ڈپٹی کالج) میں انگریزی اور نفسیات بھی پڑھانے لگے۔ درس و تدریس کا پیشہ اپنانے کے دوران کھنڈوہ سے بی ایڈ بھی کیا۔ آپ نے یونیورسٹی آف ساگر، ساگر (اب سر ہری سنگھ گور یونیورسٹی) سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔

آپ نے سینٹرل پروونس اینڈ برار کے 12 شعرا کے ناگپور سے شائع تذکرے میں سب سے کم عمر کے شاعر کی حیثیت سے جگہ پائی۔ یہ بات مجھے ان کے دیرینہ دوست ناگپور کے پروفیسر منشاء الرحمٰن خان منشا نے خود ایک بار درگ بھلائی، چھتیس گڑھ میں ان کے قیام کے دوران بتائی تھی۔ تب وہ اپنے ویٹرینری ڈاکٹر بیٹے کے یہاں درگ میں قیام پزیر تھے۔ ساز برہانپوری نے پندرہ سال کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی اور محض سترہ سال کی عمر میں اپنے وقت کے موقر ادبی ماہنامہ 'ساقی' دہلی، میں ان کی غزل فروری 1939 کے شمارے میں شائع ہو گئی تھی۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی انھوں نے شاعری جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا ورنہ بصورتِ دِگر شاعری چھوڑنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ ماہنامہ ساقی دہلی میں ایک غزل اور ماہ نامہ ادبِ لطیف لاہور میں دو غزلیں جو 1939 سے 1941 کے درمیان شائع ان کی ابتدائی غزلیں ہیں، کلاسیکی رنگ میں مضامین حسن و عشق سے مملو ہیں مگر زبان و بیان کی فنی گرفت سے معمور کسی پختہ کار شاعر کا کلام معلوم ہوتی ہیں۔

ساز برہانپوری مشاعروں میں اپنے معیاری کلام، تحت میں گونج دار آواز اور عمدہ نظامت کی وجہ سے کُل ہند مشاعروں میں وسط ہند یعنی اس وقت کے سینٹرل پرووِنس اینڈ برار کے نمائندہ شاعر بن گئے تھے۔ مظفر حنفی کھنڈوہ میں ابتدائی ادبی زندگی کے دوران ان سے اپنے ماہنامہ 'نئے چراغ' کے لیے نگارشات لیتے رہے تھے۔ مظفر حنفی نے جن کا تعلق کھنڈوہ سے تا عمر ہی خاص رہا، اپنی غزلوں کے پچاس سالہ انتخاب 'روحِ غزل' (1993) میں ساز برہانپوری کو بھی تین غزلوں کے ساتھ اپنے عصر کے نمائندہ شعرا میں شامل کیا۔ (ص 479)

ساز برہانپوری نے تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی بلکہ اپنے طور پر اسے عروج تک پہنچایا۔ ان کے سلام، منقبت، نعت تو آج تک برہانپور کے پرانے اور نئے سلام خواں و نعت خواں حضرات پڑھتے آئے ہیں۔ قطعات کے معاملے میں نریش کمار شاد اور محمود دُرّانی (برہانپور/ بامبے) کی طرح ساز برہانپوری بھی شہنشاہِ قطعات کہے جا سکتے ہیں۔ گرچہ ان کے قطعات پر مشتمل کلام نایاب ہے مگر ویب سائٹ ریختہ پر ساز برہانپوری کے نام سے پانچ قطعات پر مشتمل ایک صفحے کا عکس میرے پاس محفوظ ہے۔ ان قطعات میں سیاسی بصیرت و طنزیہ کاٹ کا جواب نہیں۔ راغب فاونڈیشن برہانپور کے صدر اور جواں سال شاعر ایڈوکیٹ عابد احمد خان طالب ہاشمی نے 'کہکشاں' (سنہ اشاعت 2018) کے نام سے کتاب ترتیب دی ہے جس میں محمود بیگ ساز غالبی برہانپوری کے نام سے ایک نعت میری نظر سے گزری ہے۔

رباعیوں کے معاملے میں ہیئتی و عروضی تجربات بے شک نہیں کیے لیکن رباعیاں جتنی لکھیں ہیں خوب لکھی ہیں۔ نظموں کا رنگ و آہنگ رومانی ہے اور زیادہ تر جوانی کے دنوں میں کہی گئی ہیں۔ نئی نئی ردیفیں اور مشکل قافیوں

کو برتنے میں تو جواب ہی نہیں۔ پروفیسر وسیم افتخار برہانپوری نے اپنی تحقیقی کتاب 'برہانپور میں اردو نثر نگاری: ماضی اور حال کے آئینے میں' (نومبر 2012) اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر شبانہ نکہت انصاری نے اپنی کتاب 'میر کے مختلف سلاسل اور برہانپور' (2020) میں ساز برہانپوری کا مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے۔

محمود بیگ ساز برہانپوری فنی و اسلوبی تنوع سے لیس داخلی و خارجی کرب، سیاسی بصیرت و عصری حسیت کے ایک صاحب طرز شاعر کے طور پر بیسویں صدی کے معتبر شعرا میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال نے محمود بیگ ساز برہانپوری کا پہلا شعری مجموعہ 'تارِ نفس' کے نام سے 1995 میں بھوپال سے شائع کیا ہے جو غزلیات کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ یہی ابھی تک کا پہلا اور آخری شعری مجموعہ ہے۔ غیر مطبوعہ کلام میں حمد، نعت، منقبت سلام پر مشتمل بیاض ہے۔ نظموں پر مشتمل بیاض غائب ہو چکی ہے۔ قطعات، رباعیات اور غزلوں پر مبنی ان کی ڈائریاں ان کی زندگی میں ہی ادھر ادھر ہو گئیں۔ قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر (غیر مطبوعہ) عدم توجہ سے دیمک زدہ ہو کر ضائع ہو گیا۔ آپ نے نظم و نثر پر بھی یکساں قدرت پائی ہے اور آپ کے مضامین یہاں وہاں مل جاتے ہیں مگر برہانپور کے نثری ادب پر تحقیق کرنے والوں نے ان کی نثر نگاری کے باب کو اَن چھوا چھوڑ دیا ہے۔

نصف صدی تک سیاست میں سرگرم عمل رہنے کے بعد عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پھر حضرت نظام الدین چشتی المعروف بہ حضرت شاہ بھکاری کے آستانے سے وابستگی اور بڑھا دی اور جب تک ڈھلتی عمر کے ساتھ ہمت اور صحت نے ساتھ دیا آستانے کی روزانہ حاضری اور روحانی ریاضت کا سلسلہ قائم رکھا۔ امن کے موسم ہوں کہ فرقہ وارانہ تناؤ کا دور ہر موسم ہر وقت عوام کی بے لوث خدمت میں حاضر رہے اور شہر کی پر امن روایت کی پاسداری کی، حفاظت کی اور شہر کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے اہم ستون کے طور پر نصف صدی سے زائد عرصے تک اپنی خدمات انجام دیں اور نصف صدی سے زائد تقریباً ستر سال تک شعری سفر جاری رکھا۔ کئی سالوں تک انگریزی روزنامہ 'دی ہتواد، ناگپور' کے نامہ نگار بھی رہے۔ شہر کی صحافیوں کی تنظیم میں بھی سکریٹری رہے۔ مہا کوشل انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے۔ جمعیت علمائے ہند کی برہانپور شاخ کے معتمدِ اعلیٰ رہے اور سالوں سال فعال رہے۔ کنوینز کے طور پر برہانپور کی تاریخ میں پہلی بار کل ہند یونانی طبی کانفرنس کا تاریخ ساز انعقاد کیا اور برہانپور میں یونانی طبیہ کالج کی بنیاد کے لیے شہر کے نامی طبیبوں، ہمدرد فاؤنڈیشن دہلی کے اشتراک اور مقامی مخیر حضرات کی مدد پانے کے لیے دن رات ایک کیا۔ اس طرح غالباً سنہ 1964 میں برہانپور میں سیفیہ حمیدہ یونانی طبیہ کالج، برہانپور کی بنیاد پڑی۔

ساز برہانپوری کے خانوادے میں ان کے بڑے صاحب زادے مرزا مسعود بیگ (مسعود بیگ تشنہ) نے ان کی شعری و ادبی وراثت پائی ہے اور بینک آف بڑودہ سے مارچ 2014 میں سینئر مینیجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں اور اندور میں رہائش رکھتے ہیں۔ چھوٹی صاحب زادی طلعت سلطانہ قریشی بھوپال میں سرکاری اسکول میں لیکچرار ہیں اور چھوٹے صاحب زادے مرزا عاصم بیگ بھلائی، چھتیس گڑھ میں رہائش رکھتے ہیں اور بزنس کرتے ہیں۔ بڑی بیٹی ڈاکٹر فرحت سلطانہ مرحومہ کے شوہر ڈاکٹر ممتاز علی خان اور ان کے بچے یو ایس اے میں مستقلاً قیام پزیر ہیں۔ ساز برہانپوری کے جد امجد ایران سے ایک بزرگ کے قافلے کے ساتھ برہانپور آئے تھے۔ ساز برہانپوری کے جد اعلیٰ پردادا مرزا امان بیگ اماں چغتائی اپنے وقت کے مشہور نعت گو، سلام گو اور مرثیہ گو شاعر تھے۔ جد امجد دادا مرزا امیر بیگ چغتائی پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزی حکومت میں پولس سرکل انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور پھر تحریکِ خلافت سے متاثر ہو کر مقامی طور پر تنظیمی کاموں میں مصروف ہو گئے اور فریضۂ حج سے واپسی پر بحری سفر میں انتقال فرما گئے تھے۔ والد ڈاکٹر مرزا محبوب بیگ نے سِول نافرمانی تحریک اور خلافت تحریک سے متاثر ہو کر پولس سب انسپکٹر کے عہدے سے عین جوانی میں ہی استعفیٰ دے دیا، بعدہ وہ کلکتہ سے ہومیو پیتھی کی تعلیم لے کر برہانپور کے پہلے ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنے۔ ساز برہانپوری کے والد کی ہندستانی قومیت پسندی نے انہیں تقسیمِ ہند پر پاکستان ہجرت کرنے سے باز رکھا۔ یہی ہندوستانی قومیت پسندی اور حب الوطنی کا جذبہ ساز برہانپوری کی اولاد میں بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

مراجع و مآخذ

1. تارِ نفس مجموعہ کلام محمود بیگ ساز برہانپوری (مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی) 1995
2. روحِ غزل (پچاس سالہ انتخاب) مرتب: پروفیسر مظفر حنفی (انجمن روح ادب الہ آباد)
3. گہوارۂ علم دار السرور مرکزِ روحانیت برہانپور: مصنف مولوی معین الدین ندوی (شعبۂ دار الاشاعت جامعہ اشرفیہ، برہانپور نومبر) 1978
4. آثار برہانپور (برہانپور گائیڈ): مرتب الحاج ماسٹر عتیق اللہ خان مجددی (بزمِ صوفی نور الہدیٰ مالیگاؤں مہاراشٹر شاخ برہانپور) 1992
5. اردو کی ترقی و نشو و نما میں صوفیاء کرام کا حصہ: مولوی عبدالحق
6. میر کے مختلف سلاسل اور برہانپور: مصنفہ و مولفہ ڈاکٹر شبانہ نکہت انصاری (سینٹرل انڈین ہسٹوریکل ریسرچ فاؤنڈیشن، گوالیار) 2020
7. برہانپور میں نثر نگاری ماضی اور حال کے آئینے میں: مولف پروفیسر وسیم افتخار انصاری (طباعت سیدہ گرافکس مومن پورہ، برہانپور (نومبر 2012)

■

Masood Baig Tishna
65 Sector A, Green Park Colony
Dhar Road INDORE-452002
Mob No : 9981377933
Email: baig.masood54@gmail.com

آبرو غم کی ہوئی یوں آنکھ کے پانی میں گم
چاندنی ہو جس طرح سورج کی تابانی میں گم
یاس و حسرت کی وہ اک منہ بولتی تصویر ہے
جو پریشانی میں چپ ہے جو پریشانی میں گم
دیکھ کر آئینہ مجھ کو رہ گیا حیراں اُدھر
اور اِدھر میں ہو گیا خود اپنی حیرانی میں گم
میں تصور میں ہوں جس کے اس قدر کھویا ہوا
جیسے وہ جانِ غزل میری غزل خوانی میں گم
وقت نے ایسے بھی میرِ کارواں پیدا کیے
کارواں اکثر ہوئے جن کی نگہبانی میں گم
جانے کتنی بار سر کے ساتھ میرا دل جھکا
کتنے سجدے ہو گئے پھر میری پیشانی میں گم
ہے مزاجِ زندگانی 'ساز' ایسا نرم گرم
جیسے پانی آگ میں ہو، آگ ہو پانی میں گم

اپنے دماغ میں مری الجھن اتار لیں
پھر چاہے سر مرا مرے دشمن اتار لیں
جس دل میں اختلاف ہو غوغائے وقت سے
اس دل میں میرے قلب کی دھڑکن اتار لیں
مجرم ہوں گر تضاد ملے قول و فعل میں
میرا بیان آپ من و عن اتار لیں
جو پیڑ سایہ دار نہ ہو بار ور نہ ہو
ایسے شجر سے میرا نشیمن اتار لیں
دھرتی کو بھی نظر میں رکھیں جا کے چاند پر
سوکھی نظر جو آئے تو ساون اتار لیں
ہر وقت جس کا آ کے بہاریں کریں طواف
صحرائے دل میں کیوں نہ وہ گلشن اتار لیں
تصویرِ میری فکر اے 'ساز' اہلِ فن
آئیں بڑھا کے ذوق کا دامن اتار لیں

یاسمین رشیدی

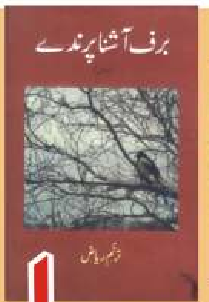

ترنم ریاض

قصہ گوئی نہ کہ جادو بیانی

آگہی اضطراب کا باعث ہوتی ہے۔ یہ اضطراب کم وبیش ہر ادیب کا مقدر ہے جو اسے قلم اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ ترنم ریاض کے افسانوی بیانیے میں عصری آگہی اور اس سے پیدا ہونے والے اضطراب کی تصویریں نمایاں ہیں۔ ترنم ریاض کے افسانے گلو بلائزیشن، عصری حقیقت نگاری، انسانی اقدار کی پامالی، رشتوں کی بے وقعتی، سائنس اور ٹکنالوجی کے زیر اثر انسانی زندگی کی شکست وریخت اور حیات وممات کے مختلف اور متنوع مسائل کی بازیافت ہیں۔ ترنم ریاض کی حساسیت اور وفورِ تخیل افسانوی قالب میں ظاہر ہوتے ہیں اور ہماری فکر کو مہمیز کرتے ہیں۔

سماجی حقیقت نگاری اور معاصر معاشرے کی تیزی سے تبدیل ہوتی زندگی ترنم ریاض کے افسانوں کا اختصاص ہیں۔ عصری سماج کی تمام حقیقتوں کو ایک افسانے (چمگادڑ) میں ڈھال کر انھوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ معاصر افسانہ نگاروں میں منفرد شناخت کی حامل تھیں۔ لاانسانیت، خودغرضی، وحشی پن، اقدار کی شکست وریخت جو معاصر معاشرے کی پہچان ہے۔ کیا یہی ہماری تہذیب ہے؟ کیا اپنے بزرگوں سے یہی سب کچھ ہمیں ورثے میں ملا ہے؟ ترنم ریاض کا افسانہ 'چمگادڑ' پڑھ کر ایک نوع کے خوف کا احساس ہوتا ہے۔ ہم کس سمت جا رہے ہیں؟ یہ کیسی ترقی ہے جس نے انسان کو وحشی بنا دیا ہے۔ کیا ترقی کے معانی تبدیل ہوگئے ہیں؟ یا ہم نے وحشی پن کو ہی ترقی تسلیم کرلیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار نور جہاں کی حالت ہر اس شخص کی حالت ہوگی جو ذرا بھی حساس دل ہوگا۔ ترنم ریاض نے افسانے میں معاصر معاشرے کے بیشتر مسائل کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں، ترقی کی ہوڑ میں آگے رہنے کے لیے ایک ملک دوسرے ممالک کو کس کس طریقے سے زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک ملک دوسرے ملک کو زیر کرنے کے لیے وحشی پن کے تمام ریکارڈ توڑ چکا ہے۔ عراق کے قیدیوں کے ساتھ امریکی سپاہیوں کا ظالمانہ سلوک اس وحشی پن کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ یہ انسانوں کی طرح نظر تو آتے ہیں مگر ان کے افعال ایسے ہیں گویا یہ انسان ہیں ہی نہیں:

دوست بن کر کمزوریوں کو خریدتی ہیں اور نہ خرید پائیں تو بے سبب کے دشمنوں کی طرح علی الاعلان حملوں پر اتر آتی ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں کو توڑنے اور غلام بنانے کے لیے انسانیت سوز حرکات کررہی ہیں...... بظاہر اخباروں میں عام انسانوں کی طرح آئس کریم کھاتے اور بچوں سے کھیلتے تصویریں چھپواتے ہیں یہ لوگ۔ گویا وہ بھی انسان ہیں اور بباطن ایسی حرکات کیے چلے جاتے ہیں۔ گویا انسان ہی نہیں۔

(ترنم ریاض: چمگادڑ مشمولہ جدید ادب، جرمنی: شمارہ 18، ص: 148)

ایسا بھی نہیں کہ یہ سب کرنے کے لیے یہ مجبور ہیں۔ بھوک سب سے بڑی حقیقت ہے جس کے لیے انسان کسی بھی حد تک جاسکتا ہے مگر بھوک ان کی مجبوری نہیں:

یہ لوگ فاقوں سے بے حال ہوکر پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لیے غلط چیزوں کے استعمال پر مجبور نہیں ہوتے۔ یہ لوگ شوق کی تکمیل کے لیے انسانیت سوز کام کرتے ہیں۔ (ایضاً ص: 148)

انسانوں کو مشین بنانے والی یہ زندگی 21ویں صدی کی پہچان بن چکی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے انسانی اقدار کو نیست ونابود کر دیا ہے۔ 21ویں صدی کی زندگی اور حالات کا جو خاکہ ترنم ریاض نے افسانہ 'چمگادڑ' میں کھینچا ہے وہ معاصر زندگی کے کھوکھلے پن پر ان کی بے چینی کو ظاہر کرتا ہے:

اسے خبر تھی کہ عام انسان کو تیز گام زندگی کی ایسی دوڑ میں دھکیلا گیا ہے کہ اس کے پاس سوچنے کی فرصت نہیں۔ وہ بھی مشین کی طرح دوسرے کل پرزوں پر انحصار کرتا بھاگتا جا رہا ہے۔ سوچنے کے لیے ذرا ٹھہر جاتا تو سوچتا کہ دنیا میں بھلا کون اپنے معصوموں کو جواں مرگی کا پیام دے گا۔ اپنے تو ایسا نہیں کرتے۔ محرومیوں اور رسوائیوں کا یہ سامان کون کر رہا ہے۔ لالچ بالادستی، زبردستی۔ کون جانے؟ (ایضاً ص: 147,148)

افسانہ 21ویں صدی کی تلخ حقیقت اور ترقی کے تانے بانے پر تشکیل دیا گیا ہے۔ جہاں سب سے پہلی اور سب سے مہنگی ڈش 'ہیومن فیٹس' ہے۔ اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے انسان جانور سے بھی بدتر حرکات کر رہا ہے۔ ادیب کا حساس ذہن ہر طرف پھیلی ہوئی حیوانیت سے خوف زدہ ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر اسے اپنا ماضی اور ماضی کی پرسکون زندگی یاد آتی ہے۔ مسائل وہاں بھی تھے مگر اس خوفناک صورت میں نہیں۔ ادیب جب ماضی اور حال کی زندگی پر نظر ڈالتا ہے تو بے چین ہو اٹھتا ہے۔ اس ترقی سے جو زندگی سے زیادہ قیمتی ہوگئی ہے۔ اس حیوانیت سے، جو آج کی زندگی کا خاصہ ہے۔ بقول منٹو 'افسانہ نگار اس وقت اپنا قلم اٹھاتا ہے جب اس کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ (بلراج مین را (مرتب): دستاویز؛ سعادت حسن منٹو، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1986، ص: 65)

ترنم ریاض اس صورتِ حال سے نالاں ہیں جہاں روحانی اور اخلاقی بنیادیں تبدیل کی جارہی ہیں۔ مذہب کا زہر رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ لوگ حیوان کیوں بنتے جا رہے ہیں۔ اس کا جواز بھی ترنم ریاض کے افسانے میں موجود ہے:

گلوبلائزیشن، کلوننگ، یہ نیوکلیائی ہتھیار، ہلاکتوں کے یہ جدید سائنسی آلات، دراصل انسانیت کا کمرشلائزیشن ہے اور فطرت سے بہت دور بھی، اسی لیے انسان کی معصومیت چھن گئی ہے اور لوگ جانور ہوگئے ہیں۔

(ترنم ریاض: جدید ادب، ص: 149)

نہ جانے یہ کیسی ترقی ہے جہاں لوگ بھوک کے ننگے مر رہے ہیں اور دوسری طرف سرکاریں نئے ہتھیاروں کے جائزے اور خرید وفروخت میں منہمک ہیں۔ افسانہ چمگادڑ، مٹی، شہر، ہمعصر معاشرے کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

افسانہ 'شہر' ایک خوفناک فضا کی تخلیق کرتا ہے۔ 'شہر' جہاں ملازمت اور رہائش کے مسائل کے ساتھ ساتھ انسانیت بھی ناپید ہوتی جارہی ہے۔ ایک ہی عمارت میں رہنے والے مکین ایک دوسرے سے اتنے اجنبی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے کے سکھ دکھ، جینے مرنے کی خبر تک نہیں ہوتی۔ افسانہ 'شہر' دراصل علامت ہے اجنبیت کی جو شہروں کی 'تہذیب' ہے۔ شہری مسائل کو اجاگر کرنے والی یہ کہانی، بچوں کی نفسیات سے ترنم ریاض کی گہری واقفیت کو بھی عیاں کرتی ہے۔ جو 'آدھے چاند کا عکس' میں بھی ظاہر ہے۔ واقعہ کو افسانہ بنانے کا فن انھیں بخوبی آتا ہے۔ افسانے میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس سے متعلق واقعے ہم آئے دن اخباروں اور ٹیلی ویژن پر دیکھتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے واقعے شہری زندگی میں غیر معمولی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ بظاہر معمولی نظر آنے

والے واقعے کو مصنفہ نے جزئیات نگاری کے ساتھ جس طرح افسانے کے بیانیے میں پرویا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ افسانہ پڑھ کر جھرجھری سی آتی ہے۔ یہ ترنم ریاض کا کمال ہے کہ جس خبر کو پڑھ پڑھ کر ہم اتنے بے حس ہو چکے تھے اسی واقعے کو اس انداز سے پلاٹ میں سمویا ہے کہ قاری اندر تک سہم اٹھتا ہے۔ بقول ترنم ریاض:

آج ہماری تخلیقات کا سبب ریاستی، ملی اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہورہی سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں ہیں۔ ہماری تخلیقات ہمارے اندر کا وہ کرب ہیں جو ان تبدیلیوں کا ردعمل ہے۔ (گوپی چند نارنگ (مرتبہ): اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، دہلی: اردو اکادمی، 2011، ص: 497)

ان کا یہ کرب 'مٹی' کی صورت میں سامنے آتا ہے تو کبھی 'برف گرنے والی ہے' سے عبارت ہے۔ ان کا یہ ردعمل کہیں 'شہر' کو جنم دیتا ہے تو کہیں 'باپ' کو، کہیں 'بابل' سے عبارت ہے تو کہیں 'چمگادڑ' سے۔ غرض کہ ان کا ہر افسانہ ان کے داخلی جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ کہیں کرب کی صورت میں تو کہیں خوشی کی صورت میں۔ کہیں ممتا کی صورت میں تو کہیں گھٹن اور طنز کی صورت میں۔

کشمیر اور کشمیر کی سیاست ترنم ریاض کے افسانوی بیانیے کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کے سیاسی، سماجی حالات کی عکاسی ملتی ہے۔ وہ کرب جو کشمیری عوام کا مقدر بن چکا ہے ترنم ریاض کے افسانوی بیانیے میں اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ افسانہ 'مٹی' میں انھوں نے کشمیر کی سیاست کو موضوع بنایا ہے۔ بظاہر جنت نظر آنے والی یہ ریاست وہاں کے مکینوں کے لیے کسی جہنم سے کم نہیں۔ جہاں کے شہری دوسرے درجے کی زندگی جینے پر مجبور ہیں:

کہتے ہیں اس رات وردی والے آدھی رات کو پھر آئے تھے۔ جانے کس کی تلاش میں۔ انھیں وہاں کوئی نہیں ملا تھا۔ پھر بھی وہ کئی گھروں میں گھنٹوں رکے رہے۔ غلام حسن اس دن سے خون تھوکتا ہے اور اس کی بیٹی اس رات سے بول نہیں سکتی۔ جب بھی نظر آتی ہے کسی کونے میں دبکی یا دیوار سے چپکی ہوئی۔ کسی کے بلانے پر اس طرح چونکتی ہے جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ (ترنم ریاض: ابابیلیں لوٹ آئیں گی، دہلی: نرالی دنیا پبلی کیشنز، 2000، ص: 78)

ترنم ریاض شعوری طور پر نسائیت کو اپنے افسانوں کا موضوع نہیں بناتیں۔ ان کے کردار وقوعہ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس سماج کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ سماج اور اقدار کی تبدیلیاں انھیں جنم دیتی ہیں۔ جو کبھی مرد کی صورت میں نظر آتے ہیں تو کبھی عورت کی۔ جب یہ کردار عورت کی صورت میں جنم لیتے ہیں تو افسانہ از خود نسائی پہلو اختیار کرلیتا ہے۔ عورت جو بہ یک وقت مختلف جذبوں کا مجموعہ ہے۔ کبھی 'سیتا' ہے تو کبھی 'کالی' ہے۔ ترنم ریاض کے افسانوں میں مختلف صورتوں اور مختلف جذبوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ممتا کا جذبہ غالب آتا ہے تو 'مائیں' اور 'آدھے چاند کا عکس' جنم لیتے ہیں۔ عورت بے بس ہوتی ہے تو 'اچھی صورت بھی کیا' 'اماں' 'بجھائے نہ بجھے' 'بابل' اور 'اماں' وجود میں آتی ہیں جو شوہر کا ظلم وستم چپ چاپ سہتی رہتی ہیں۔ یہ ظلم وستم جب انتہا کو پہنچتے ہیں تب ساحرہ (باپ) جنم لیتی ہے۔ جو چنڈی/ کالی کا روپ دھارن کرکے اس ظلم/ ظالم کا ناش کرتی ہے۔ افسانہ 'باپ' اسی ظلم وستم کے خلاف ایک عورت (بیٹی) کا احتجاج ہے جو بلاشبہ ممتا کی دیوی ہے لیکن جب استحصال کے خلاف آواز اٹھاتی ہے تو کالی/ چنڈی بن جاتی ہے۔

ترنم ریاض کے افسانوں کے کردار بذات خود ایک کہانی معلوم ہوتے ہیں۔ پس ماندہ طبقے کے استحصال زدہ اور پڑھے لکھے ترقی یافتہ دونوں طرح کے کرداران کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ ایک طرف نچلے طبقے کی سندری، اماں، ریشما، سپنا جیسی عورتیں ہیں جن کی ساری زندگی دوسرے گھروں میں کام کرتے ہوئے گزر جاتی ہے اور دوسری طرف وہ مرد ہیں جو ان کی کمائی پر عیش کرتے ہیں اور انھیں مارتے پیٹتے بھی ہیں:

اس کی طرف اکثر کام کرنے والی عورتوں کے شوہر کچھ نکمے واقع ہوئے تھے۔ عورتیں گھروں میں کام کرتیں۔ اور مرد اپنے گھروں میں بچے کھلاتے۔ شام کو جب عورتیں گھر کو لوٹتیں تو یہ پینے وینے نکل جاتے۔ (ترنم ریاض: ابابیلیں لوٹ آئیں گی، دہلی: نرالی دنیا پبلی کیشنز، 2000، ص: 31)

یا پھر چندر جیسے کردار ہیں جو اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور چلتے بنتے ہیں۔ 'باپ' جیسے درندہ صفت اور قمر الدین جیسے کاہل کردار بھی اسی سماج کی دین ہیں تو دوسری طرف ثنا جیسی سادہ دل لڑکی اور کنول جی جیسے معمر شخص بھی اسی سماج کی نمائندگی کرتے ہیں جو ایسی صورت حال سے نالاں ہیں جہاں زبان اور علم بھی خانوں میں تقسیم ہے:

زبانیں کیوں تعصب کا شکار ہوں۔ یہ تو علم ہے اور علم کوئی بھی ہو برا نہیں ہوتا... علم تو علم ہوتا ہے۔ (ایضاً، ص: 62)

یہ وہ سماج ہے جہاں انسان ہی نہیں زبان اور علم بھی مذہب کے خانوں میں تقسیم ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں انگریزوں نے اسی حکمت عملی کو اپنا کر برسوں ہندوستان کو غلام بنائے رکھا۔ پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی آج بھی اتنی ہی کارگر ہے۔ اب اسی رستے پر ہمارے سیاسی رہنما چل رہے ہیں۔ اور عوام آج بھی زندہ درگور ہے۔

ترنم ریاض کے کردار یہ کام بخوبی انجام دیتے ہیں۔ کہانی، پلاٹ اور کردار کی تثلیث ان کے افسانوں کو ایک منفرد رنگ عطا کرتی ہے جس میں چار چاند لگانے کا کام وہ جزئیات نگاری سے لیتی ہیں۔ چاہے وہ کرداروں کی شخصیت اور نفسیات کو ابھارنے کا کام ہو یا واقعے کو، جزئیات نگاری کا تفصیلی ذکر ان کے منفرد اسلوب کی پہچان ہے:

وہ ساؤتھ انڈین تھی۔ آبنوسی رنگ۔ بھرا بھرا جسم۔ بلکہ بھرنے کے پروسیس میں۔ بھرے بھرے لب ورخسار۔ بلی کی آنکھوں کی طرح آڑھی سی آنکھیں۔ یعنی آنکھوں کے اندرونی کونے نتھنوں کی طرف۔ اور باہری ماتھے کی طرف توے پر بنی روٹی جیسے گول چہرے پر گول گول چھوٹی سی ناک، سفید دانتوں کی متناسب قطار۔ چھوٹی سی چولی اور گل بوٹوں کی چھینٹ والے گھاگھرے کے درمیان کسی کسائی کمر۔ (ایضاً، ص: 29)

ترنم ریاض کے بیشتر بیانیے کا بیان کنندہ واحد متکلم ہے۔ بیانیے میں راوی کے کردار کے متعلق عموماً قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ واحد متکلم کا بیانیہ مصنف/ مصنفہ کی سوانحی کوائف کا اشاریہ ہے تاہم ترنم ریاض کے یہاں راوی کردار اور مصنفہ کے درمیان بُعد ہے۔ وارث علوی نے لکھا ہے:

افسانے کے راوی کے واحد متکلم ہونے کے باوصف اور کبھی کبھی سوانحی سایہ پڑنے کے باوجود، ترنم ریاض کا ہر افسانہ ایک ایسی حقیقت کا ترجمان ہے جو غیر شخصی اور آفاقی ہے اور اس پر ایک انسانی فینومینا کے طور پر غور کیا جاسکتا ہے۔ (وارث علوی: گنجفہ باز خیال مشمولہ جدید ادب، جرمنی: شمارہ 18، ص: 124)

کہانی، پلاٹ، کردار، جزئیات نگاری ان کے وہ جوہر اصلی ہیں جو معاصرین میں ان کی شناخت کو مستحکم کرتے ہیں۔ زبان سادہ اور سلیس ہے۔ زبان کا استعمال کرداروں کی مناسبت سے کیا گیا ہے تاکہ کہانی کی فضا میں یہ اجنبی معلوم نہ ہوں:

میرے کو لگتا ہے میم صاحب کہ میرا اسادی (شادی) اسی کے ساتھ ہوگا۔ (ترنم ریاض: ابابیلیں لوٹ آئیں گی، دہلی: نرالی دنیا پبلی کیشنز، 2000، ص: 32)

ان کے افسانے غیر ضروری ابہام سے پاک ہیں۔ وہ کرشن چندر کی طرح آرائشی زبان استعمال نہیں کرتیں حالانکہ وہ بھی فطرت کی گود میں پلی بڑھی ہیں۔ جن کے متعلق بیدی کا یہ جملہ مشہور ہے کہ 'میرا یار جادو ہی جگاتا رہے گا یا کہانی بھی کبھی لکھے گا'۔ ترنم ریاض جادو نہیں جگاتیں بلکہ کہانیاں لکھتی ہیں۔ ہماری اور آپ کی کہانیاں، یا یوں کہیں کہ انفس وآفاق کے قصے ان کی شعریات میں مبہم نہیں ہیں اور اسی لیے ان کا ورلڈ ویو بڑا واضح ہے۔

■

Dr. Yasmeen Rasheedi
Assistant Professor, Department of Urdu,
T. P. College, College chowk Madhepura,
Bihar, 852113
Mob.:9968549837

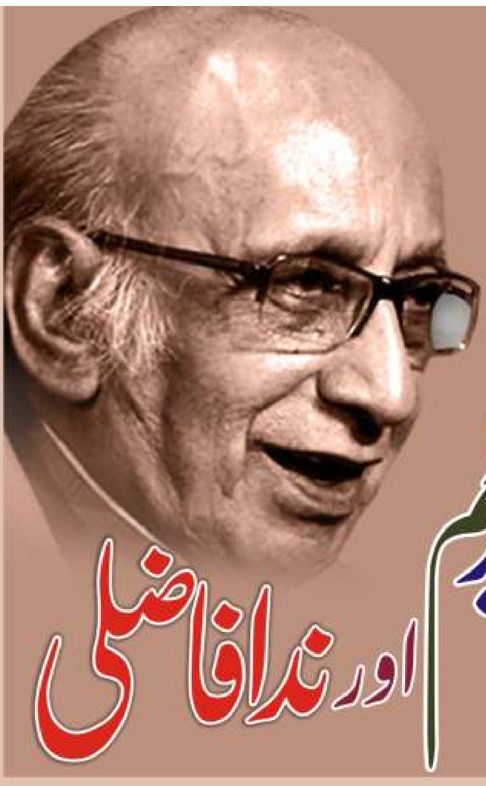

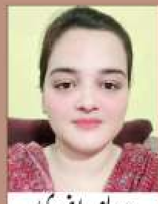

صبازہرا رضوی

جدید نظم اور ندافاضلی

ندافاضلی اردواور ہندی کے ایک ایسے ادیب، شاعر، نغمہ نگار، مکالمہ نویس اورصحافی تھے جنھوں نے اردوشاعری کوایک ایسالب ولہجہ اور اسلوب دیا جس کواردوادب کے اشرافیہ نے ان سے پہلے قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ ان کی شاعری میں اردو کا ایک نیا شعری محاورہ وجود میں آیا جس نے نئی نسل کومتوجہ اور متاثر کیا۔ ان کے اظہار میں سنتوں کی بانی جیسی سادگی، اک قلندرانہ شان اور لوک گیتوں جیسی مٹھاس ہے۔ ان کے مخاطب عام لوگ تھے لہٰذا انھوں نے ان کی ہی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے لطیف اور غیر جارحانہ طنز کے ذریعے دل میں اتر جانے والی باتیں کیں۔ انھوں نے امیر خسرو، میر، رحیم اور نظیر اکبرآبادی کی بھولی بسری شعری روایت سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے نہ صرف اس روایت کی بازیافت کی بلکہ اس میں عصر حاضر کی لسانی ذہانت جوڑ کر اردو کے نثری ادب میں بھی نئے امکانات کی نشاندہی کی۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن ان کے نثری اسلوب نے بھی اپنی الگ راہ بنالی۔ ندا کی شاعری ہمیشہ نظریاتی ہٹ دھرمی اور ادعائیت سے پاک رہی۔

ندافاضلی کی شاعری عام فہم زبان والی شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں کہیں بھی پیچیدگی یا الجھاؤ نظر نہیں آتا ہے۔ ایک سبک روندی کی طرح بہاؤ والی شاعری ہے۔ فاضلی نے جن مسائل وموضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ یہ مسائل اور معاملات دوسرے معاصر شعرا کے یہاں نظر نہیں آتے، لیکن ان موضوعات کو جس خوبصورتی سے اور نہایت عام فہم زبان میں انھوں نے پیش کیا ہے، وہ انھیں دوسروں سے ممتاز ضرور کرتا ہے۔ انھوں نے عصر حاضر کی زندگی کے انھی حقائق کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے، جسے ہر شخص اپنی زندگی میں محسوس کرسکتا ہے۔

ندا کی نظموں میں انسانی جذبوں کی سرشاری اور زندگی کی بالکل ہی سچی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انسانی زندگی اور انسانیت دونوں کو مستحکم کرنے والے جو بھی عوامل اور عناصر شاعری کے لیے استعمال ہوسکتے ہیں، ندا نے انھیں بہت ہی خوش اسلوبی سے استعمال کیے ہیں۔ پوری کائنات اور بالخصوص ہندوستانی زمین اور اس زمین پر تنے ہوئے نیلے شامیانے اور اس شامیانے میں جڑے ہوئے چاندسورج اور ستارے اور ان دونوں کے بیچ خلاؤں میں اڑتے ہوئے رنگ برنگ پرندوں کو ندا نے بہت ہی قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ چاند، مانجھی، ندی، دریا، گوریا، پیپل کے پتے، برکھارت، ساون، بھادوں، انگیٹھی، کٹیا، بگلوں کی ڈاریں، کٹورے سا تال، مٹکے کا پانی اور بھی ایسے نشانات وآیات جو ہماری ہندوستانی تہذیبی بساط کو خوب صورت بناتے ہیں، ندا نے انھیں اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ آپ ان الفاظ پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ بہت کم اردو کے شعرا ہیں جو ان کو اپنی شاعری میں جگہ دے پاتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ ہے، اپنی تہذیبی جڑوں سے دوری یا کم ازکم ان کی طرف توجہ کا فقدان۔ اگر یہاں الفاظ کے اچھے یا برے ہونے کی بحث چھیڑ دی جائے تو بات غیرضروری طور پر نظریاتی مباحث کی لیک پر چل نکلے گی اور ایسے میں ندافاضلی کے شعری منشور سے چھن کر آنے والی ست رنگی شعاعوں سے ہمارے ذہن منور نہیں ہوسکیں گے، اس لیے اس بحث کو یہیں موقوف کیا جاتا ہے۔

اب تک جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی، ندا نے ان کے علاوہ بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ شاعروں کا محبوب موضوع عشق بھی رہا ہے۔ عشقیہ مضامین اور ان کے ارتعاشات بھی ندا کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی نظم 'ایک ملاقات' پیش خدمت ہے:

نیم تلے دوجسم اجانے چم چم بہتا ندیا جل
اڑی اڑی چہرے کی رنگت کھلے کھلے زلفوں کے بل
دبی دبی کچھ گیلی سانسیں جھکے جھکے سے نین کنول
نام اس کا؟ دو نیلی آنکھیں/ ذات اس کی؟ رستے کی رات
مذہب اس کا؟ بھیگا موسم/ پتا؟ بہاروں کی برسات

نظم پڑھتے ہوئے الفاظ وتراکیب میں قطعی نہیں الجھتے بلکہ اس کی روانی میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ سچا جذبہ، سچا اور سیدھا اسلوب اظہار ہی ندا کی شاعری کا واضح نقش ہے۔ فکری پیچیدگی سے پرے اور پیچیدہ اسلوب سے دور ندا کی شاعری الگ سے پہچانی جاسکتی ہے۔

یہ نظم پیش خدمت ہے:

پیار، نفرت، دیا، جفا، احسان/قوم، بھاشا، وطن، دھرم، ایمان
عمر گویا/ چٹان ہے کوئی/ جس پہ انسان کوہ کن کی طرح
موت کی نہر/کھودنے کے لیے/سیکڑوں تیشے/ آزماتا ہے
ہاتھ پاؤں چلائے جاتا ہے

ندافاضلی خود رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کے بھوگی رہے ہیں، لہٰذا وہ ان رشتوں کو اپنی شاعری میں سجاتے سنوارتے رہے ہیں۔ سیاسی اور سماجی طور پر جو اتھل پتھل ہوتی ہے اسے بھی شاعر شعری پیکر عطا کرتا ہے۔ لیکن شاعر کا خلوص خواہ وہ دوستی کا ہو یا دشمنی کا، رشتوں کی الگنی پر دھوپ میں سوکھتے ہوئے زیادہ درخشاں اور پائندہ نظر آتا ہے۔

انسانی رشتے کی حقیقت اور نسلی بعد کو وہ اپنی ایک نظم میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

بیٹھے بیٹھے یونہی قلم لے کر/ میں نے کاغذ کے ایک کونے پر
اپنی ماں/ اپنے باپ، کے دونام/ ایک گھیرا بنا کے کاٹ دیے
اور اس گول دائرے کے قریب/ اپنا چھوٹا سا نام ٹانک دیا
میرے اٹھتے ہی، میرے بچے نے/ پورے کاغذ کو لے کے پھاڑ دیا

یہاں کاغذ پھاڑنے کے ساتھ ساتھ، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر کا دل بھی دونیم ہوگیا ہے۔ یہی ہے وہ احساس کی لطافت جس میں شدت کی پھواریں ہیں اور یہی ہیں وہ پھواریں جو ندا کی شاعری کو ترفع (Sublimation) عطا کرتی ہیں۔

ندا کی شاعری میں جہاں انسانی دردمندی کے نغمے ہیں وہیں بچوں کی معصومیت کے تحفظ کا گیت بھی ہے۔

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے
ہمیشہ مندر و مسجد میں وہ نہیں رہتا
سنا ہے بچوں میں چھپ کر وہ کھیلتا بھی نہیں

اسی طرح ان کی ایک مختصر سی نظم 'چھوٹی سی شاپنگ' ہے جس میں نہایت ہی سادگی کے ساتھ پانچ سال کی بچی کے لیے ایک گڑیا کی خریداری کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور پھر اس کی منظر کشی میں ندا نے جو تخلیقیت کے رنگ بھرے ہیں، اس سے وہ گڑیا رقص کناں ہوگئی ہے، ملاحظہ کیجیے۔

گوٹے والی/ لال اوڑھنی/ اس پر/ چولی گھاگھرا
اسی سے میچنگ کرنے والا/ چھوٹا سا اک ناگرا
چھوٹی سی! / یہ شاپنگ تھی/ یا/ کوئی جادو ٹونا
لمبا چوڑا شہرا چانک/ بن کر ایک کھلونا
اتہاسوں کا جال توڑ کے/ داڑھی، پگڑی، اونٹ چھوڑ کے
الف سے/ اماں/ بے سے/ بابا/ بیٹھا باج رہا تھا
پانچ سال کی بچی/ بن کر/ جے پور ناچ رہا تھا

تخلیقی ہنر مندی کے سبب 'داڑھی پگڑی اور اونٹ' جو کہ جے پور (راجستھان) کی تہذیبی شناخت خلق کرتے ہیں، ایک دم سے پانچ سال کی بچی کے لیے خریدی گئی گڑیا میں مبدل ہوکر ناچنے لگتے ہیں۔ یہ ان اشیا کی محض ظاہری تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس لطیف جذبے کی قلب ماہیت ہے جو شاعر کے دل میں اس بچی کے لیے پل رہا ہے۔ ندا نے رشتوں کے باطن میں اترنے اور انھیں محسوس کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی معصوم رشتہ جب گاؤں، گھر، خاندان کی طرف مراجعت کرتا ہے تو تخلیقی شعور کی کہکشاں آسمانِ شاعری پر یوں ابھرتی ہے۔

میں برسوں بعد/ اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا/ اپنے گھر پہنچا/ لیکن میرے گھر میں
اب میرا گھر نہیں تھا/ اب میرے بھائی اجنبی عورتوں کے شوہر بن چکے تھے/ میرے گھر میں
اب میری بہنیں/ انجانے مردوں کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھیں/ اپنے اپنے دائروں میں تقسیم
میرے بھائی بہن کا پیار/ اب صرف تحفوں کا لین دین بن چکا تھا/ میں جب تک وہاں رہا
شیو کرنے کے بعد/ برش، کریم، سیفٹی ریزر/ خود دھو کر اٹیچی میں رکھتا رہا/ میلے کپڑے
خود گن کر لانڈری میں دیتا رہا/ اب میرے گھر میں وہ نہیں تھے/ جو بہت سوں میں بٹ کر بھی
پورے کے پورے میرے تھے/ جنھیں میری ہر کھوئی چیز کا پتہ یاد تھا
مجھے کافی دیر ہوگئی تھی/ دیر ہو جانے پر کھویا ہوا گھر/ آسمان کا ستارہ بن جاتا ہے
جو دور سے بلاتا ہے/ لیکن پاس نہیں آتا ہے (نظم: دور کا ستارہ)

اس نظم میں محض 'ندا' کا مشاہدہ یا نجی تجربہ نہیں بلکہ گھر خاندان کے افراد کا الگ الگ ہوکر زندگی گزارنا، بھائی بہنوں کی شادیاں ہونے کے بعد آنگن میں 'اجنبیت' کا آجانا، تحفے کا لین دین — اس طرح دھیرے دھیرے قربتوں کا دوریوں میں بدل جانا، سب کچھ شامل ہے۔ یہ بہت ہی سچا Landscape ہے جسے ندا فاضلی نے بنایا ہے۔

یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ندا نے، اگر غلط نہیں، تو صرف رشتوں کی شاعری کی ہے۔ خاندانی افراد کے رشتوں کی، بہن بھائی اور ماں باپ کے رشتوں کی، پہاڑ اور چرند و پرند کے رشتوں کی، یعنی مظاہر قدرت میں بھی وہ ایک طرح سے رشتوں کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ انھیں شاید رشتوں کی کہانی سنانے میں روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ایک 'نظم' جو کہ غزل کے فارم میں ہے، ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ ندا نے 'ماں' کے روپ کو کس طرح پینٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں
بانس کی کھرّی کھاٹ کے اوپر ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوئی، آدھی جاگی، تھکی دوپہری جیسی ماں
چڑیوں کی چہکار میں گونجے رادھا موہن علی علی
مرغی کی آواز سے کھلتی گھر کی کنڈی جیسی ماں
بیوی، بیٹی، بہن، پڑوسن تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دن بھر اک رسّی کے اوپر چلتی نٹنی جیسی ماں
بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں، جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ندا نے ماں پر پورا ایک ناول تحریر کر دیا ہے۔ کتنی جہتیں ہیں۔ اردو شاعری میں 'ماں' کو طرح طرح سے عقیدتوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ آخر کے شعر میں ماں کے وجود کے بکھرنے یا یہ کہہ لیں کہ ماں کے اپنے وجود کو اپنی نئی نسل میں بانٹ کر خرچ کر کے مٹ جانے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ آپ ملاحظہ کیجیے کہ کس طرح یہ شعر پورے Sensory Nerves میں سنسناہٹ پیدا کر دیتا ہے۔

بانٹ کے اپنا چہرہ ماتھا، آنکھیں جانے کہاں گئیں
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

وارث علوی نے ندا پر لکھے گئے اپنے مضمون 'جدید شاعری کا معتبر نام - ندا فاضلی' (مشمولہ 'ناخن کا قرض') میں لکھا ہے کہ:

''میرے نزدیک اردو میں 'ماں' کے موضوع پر صرف دو نظمیں یادگار رہیں گی۔ فراق کی نظم 'جگنو' اور ندا کی منقولہ بالا نظم۔'' (ص 91)

حالانکہ ندا نے یہ نظم بغیر کسی عنوان کے کہی ہے اور غزل کی ہیئت میں کہی ہے۔ وارث علوی نے دو صفحات میں اسی نظم کے مختلف نقوش اور جہتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ندا نے ایک ہندوستانی ماں کی تصویر ہندوستانی پس منظر میں خوبصورت لفظوں کی مدد سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ندا فاضلی نے اس پوری کائنات کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور اس کی بیشتر اشیا کو اپنے باطن میں اتارنے، سنوارنے اور پھر الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نظموں اور غزلوں کو کم و بیش مساوی طور پر اپنی تخلیقات میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے ایک خاص بات جو سمجھ میں آتی ہے، وہ ہے ان کا اپنی مٹی اور اس کی جڑوں سے پیار۔ بلکہ ایسا جیسے ان کے لہو میں اس دھرتی کا رنگ حلول کر گیا ہے۔ ان کے یہاں صوفی سنتوں کے اقوال احساس کی حد تک اور ہندوستانی رنگ تنفس کی حد تک نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں Urban کردار کے بجائے ایک Rural اور دیہی کردار ابھرتا ہے اور اسی لیے انھوں نے اپنے کلیات کو بھی 'شہر میں گاؤں' سے موسوم کیا ہے۔ آخر میں یہ شعر ملاحظہ کیجیے جو میرے خیال سے، ندا فاضلی کی شعری اساس تک پہنچنے کا راستہ دیتا ہے۔

کھول کے کھڑکی چاند ہنسا پھر چاند نے دونوں ہاتھوں سے
رنگ اڑائے، پھول کھلائے، چڑیوں کو آزاد کیا

■

Saba Zehra Rizvi
Zamir Apartment, 1st Floor
Near- Almass Marriage Hall
Hussainabad, Chowk
Lucknow - 226003 (UP)

راشد کی شاعری میں اساطیری حوالے

قمر جہاں

راشد کی شعری زبان اور ان کی علامتی تہ داری ایک ایسی فضا کی حامل تھی جو اردو نظم کے لیے نامانوس تھی۔ اس لیے ان کا پہلا شعری مجموعہ 'ماورا' ابتدا میں ایک رائیگاں عمل معلوم ہوا۔قاری کو ان نظموں کی لسانی فضا انتہائی نامانوس معلوم ہوئی۔چوں کہ ہماری قدیم حکایتیں، اکثر لوک کتھائیں اور بیش تر الف لیلوی قصے بہت ہی سیدھے سادے انداز میں شروع ہوتے تھے مثلاً 'ایک دفعہ کا ذکر ہے' وغیرہ اور ہمارا قاری اسی انداز بیاں کا عادی تھا۔ایسا نہیں ہے کہ راشد سے قبل اردو نظم میں اسلامی اساطیر، روایات اور تہذیب و ثقافت کا استعمال نہیں ہوا تھا۔

دنیا کے بیش تر افسانوی ادب میں مافوق الفطرت، افسانوی اور دیومالائی عناصر ضرور پائے جاتے ہیں۔ان کے مطالعے سے ایک طرف قوموں اور ملکوں کے تاریخی اور ثقافتی ارتقا کے مدارج سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، تو دوسری طرف انسانی ذہن کے بدلتے رویوں کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے۔واضح رہے کہ افسانوی ادب سے یہاں صرف نثر مراد نہیں ہے بلکہ افسانوی ادب میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جن میں قصہ اور کہانی کا وافر ذخیرہ موجود ہے، مثال کے طور پر ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی ہو، شیکسپیئر کے ڈرامے ہوں یا مہابھارت اور رامائن ہو۔ یہ سب افسانوی ادب نثر میں نہیں بلکہ نظم کی شکل میں وجود میں آئے ہیں۔

اساطیر دراصل عربی لفظ ہے جو اسطورہ کی جمع ہے۔ادب میں اسطور سے بالعموم ایسی کہانی مراد لی جاتی ہے جو حقیقی مفہوم میں پوری طرح صداقت پر مبنی نہیں ہوتی۔اس میں اشخاص و کردار اور اعمال طبیعی دنیا سے مختلف ہوتے ہیں۔اساطیری اور نیم اساطیری کردار فوق الفطرت اور سماوی طاقتوں کا مرقع ہوتے ہیں۔ اردو میں اساطیر کے ساتھ ساتھ دیومالا کی اصطلاح بھی رائج ہے۔انگریزی میں اس کے لیے متھ (Myth) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ماہرین فن نے اپنے اپنے انداز میں اساطیر کی تعریف پیش کی ہے۔بہرحال اساطیر ہو یا دیومالا اور متھ، معنی و مفہوم کے لحاظ سے ان میں بڑی حد تک یکسانیت ہے، اور ان کا گہرا تعلق بالعموم مذہب سے ہوتا ہے۔ مذہب سے الگ رکھ کر ہم اساطیر کی تفہیم کر ہی نہیں سکتے۔

اسطوری فکر نے ہر عہد میں ادب اور دیگر فنون لطیفہ کو ایک وسیع کینوس عطا کیا۔ہومر کی ایلیڈ یا اوڈیسی ہو، دانتے کی ڈیوائن کامیڈی ہو یا اقبال کا جاوید نامہ۔ادب سے قطع نظر مائیکل انجلو کے شاہکار ہوں یا اجنتا اور ایلورا کی گپھاؤں میں موجود فنی شاہکار، اپنے فن کے اظہار کے لیے مرکزی خیال سب کو اساطیر میں ہی نظر آئے۔شعرو ادب کی دنیا پر بھی اساطیر کے نہ صرف بہت وسیع اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے بلکہ آج کی سائنسی حقیقت نگاری کے عہد میں بھی تخلیق کاروں اور فنکاروں کے لیے اساطیر و دیومالا میں تخلیقی کشش برقرار ہے۔اساطیری فکر پر مبنی ادب میں جہاں ایک طرف معنوی ابعاد پیدا ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف تلمیحات و استعارات، علامات و تمثیلات اور دیگر فنی پیرائے کے لیے نت نئے راستے ہموار ہوتے نظر آتے ہیں۔اساطیر نے شعروادب کو کس طرح گہرائی و گیرائی سے ہمکنار کیا ہے اسے اس مثال سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔غالب کا ایک شعر ہے۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کے پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

عام طور پر غالب کے اس شعر کو محض فلکیاتی نکتے کی شاعرانہ وضاحت سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اسے سپت رشی کے اسطوری قصے سے جوڑ دیا جائے تو شعر کی معنی آفرینی کا اندازہ ہوتا ہے۔سپت رشی کا قصہ یوں ہے کہ دریا کے کنارے ایک تپسوی ریاضت میں منہمک تھا۔ اسی اثنا میں سات شہزادیاں دریا پر نہانے کے لیے پہنچیں۔ان کے شوروغل سے رشی کی تپسیا بھنگ ہوگئی اور شہزادیوں کے برہنہ جسم پر نظر پڑنے کی وجہ سے اس کی تپسیا بھی اکارت ہوگئی جس کی وجہ سے اس نے تمام شہزادیوں کو بددعا دے دی اور وہ آسمان میں پہنچ کر بنات النعش کی صورت میں چمکنے لگیں۔اب اگر غالب کے اس شعر کو پڑھتے ہوئے سپت رشیوں کا یہ قصہ مدنظر رہے تو بنات النعش اور عریانیت دونوں کا ایک الگ ہی مفہوم نظر آتا ہے۔[1]

اسطوری لفظیات کے استعمال کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ایک تہذیب و ثقافت میں موجود اسطوری کردار کو پڑھتے ہوئے دیگر ثقافتوں میں موجود ویسے ہی کردار کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے اور ان میں مماثلت یا مطابقت کو تلاش کرتے ہوئے ایک قاری کا ذہن بیک وقت فن پارے کی قرأت اور تخلیق دونوں کی مسرت سے ہمکنار ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو نظم کی دنیا میں دو ایسے شعرا منظر عام پر آئے جنھوں نے اردو نظم کی دنیا کو ایک بالکل ہی نئے، منفرد اور انوکھے تجربے سے آشنا کیا۔ جنس سے متعلق فرائڈ کے نظریات اور فرد کی سماج پر بالادستی نیز انفرادیت کو اجتماعیت پر فوقیت، یہ ایسے انقلابی تصورات تھے جنھوں نے نظریاتی سطح پر اردو ادب میں اپنی جگہ بنائی۔ نظریات کی اس تبدیلی کے باعث اظہار کے طریقوں میں بھی تبدیلی ناگزیر تھی۔ میراجی اور راشد یہ دو ایسے شعرا تھے جن کے اثرات اردو نظم کی دنیا میں بہت گہرے اور دیرپا ثابت ہوئے۔ یہ وہ عہد تھا جب ایک طرف میراجی نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لیے ہندو دیومالا میں بے پناہ کشش محسوس کی اور دانستہ اپنی زبان کے ڈانڈے ہندی سے ملائے اور فارسی کو بتدریج کم کرنے کی طرف مائل ہوئے، وہیں راشد کا مزاج یکسر مختلف تھا۔ انھیں صحرا اور عجم کی وسعتوں میں تخلیقی کشش نظر آئی لہٰذا انھوں نے فارسی کے الفاظ و تراکیب کا بیش از بیش استعمال کیا۔

ن م راشد کا نام آتے ہی جو پہلی نظم ذہن کے پردے پر جھلملاتی ہے وہ ہے 'سبا ویراں'۔ یہ راشد کی ایک ایسی نظم ہے جس کی شمولیت کے بغیر جدید نظم کا کوئی بھی انتخاب مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ راشد کی مشہور ترین نظموں میں دیگر نظمیں اسرافیل کی موت، حسن کوزہ گر اور 'اندھا کباڑی' وغیرہ ہیں۔ 'اندھا کباڑی' سے قطع نظر مذکورہ دو نظمیں اپنے اساطیری ماحول، اپنے معرب و مفرس لہجے کی بلند و بالا گونج اور اپنے کہانی پن کے باعث ہماری یادداشت کا ایک مستقل حصہ بن چکی ہیں۔ راشد نے اپنی شاعری میں روایات، اساطیر، قصص اور تلمیحات بطور خاص عرب اور اسرائیلی اساطیر کو اپنے شعری تجربے کی ترسیل کے لیے بہت خوبی سے استعمال کیا ہے۔ تبسم کاشمیری لکھتے ہیں ''راشد کی شاعری میں اساطیری شہروں کی ایک دنیا آباد ہے''[2]

راشد کی شعری زبان اور ان کی علامتی تہ داری ایک ایسی فضا کی حامل تھی جو اردو نظم کے لیے نامانوس تھی۔ اس لیے ان کا پہلا شعری مجموعہ 'ماورا' ابتدا میں ایک رائیگاں عمل معلوم ہوا۔ قاری کو ان نظموں کی لسانی فضا انتہائی نامانوس معلوم ہوئی۔ چوں کہ ہماری قدیم حکایتیں، اکثر لوک کتھائیں اور بیش تر الف لیلوی قصے بہت ہی سیدھے سادے انداز میں شروع ہوتے تھے مثلاً 'ایک دفعہ کا ذکر ہے' وغیرہ اور ہمارا قاری اسی انداز بیاں کا عادی تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ راشد سے قبل اردو نظم میں اسلامی اساطیر، روایات اور تہذیب و ثقافت کا استعمال نہیں ہوا تھا۔ اقبال کی مثال سامنے کی ہے بلکہ اس عہد کی فضا میں اقبال کی پرشکوہ آواز گونج رہی تھی۔ لیکن اقبال اور راشد کے پیرایہ اظہار میں ایک واضح فرق ہے۔ اقبال کے یہاں ماضی کے تعلق سے ایک تفاخر اور اپنی روایت کے تعلق سے ایک قلبی لگاؤ تھا اور بیان کی سطح پر واقعات کی از سر نو تشکیل نہیں کی گئی تھی، جب کہ راشد کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ان کے یہاں عرب اور اسرائیلی اساطیر بالکل نئے اور نامانوس صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ راشد کے یہاں اساطیر سے استفادے کی نوعیت تلمیحی کے ساتھ ساتھ علامتی بھی ہے، جب کہ راشد سے قبل کی شاعری میں اس کی نوعیت صرف تلمیحی تھی، یعنی اس کردار سے وابستہ قصے سے واقفیت اس نظم یا فن پارے کو سمجھنے کے لیے کافی ہوتی تھی، جب کہ راشد نے علامتی انداز میں استعمال کرتے ہوئے قصے کے صرف کرداروں کے نام لیے اور ان سے وابستہ تصورات میں یکسر تبدیلی کر دی جس سے ان کی تفہیم نسبتاً مشکل ہوگئی۔ اس بات کو زیادہ بہتر طریقے سے واضح کرنے کے لیے راشد کی اسی نظم کی بات کرتے ہیں جس کا عنوان 'سبا ویراں' ہے۔ 'سبا ویراں' میں موجود کردار اسلامی اور اسرائیلی روایات کے مطابق ایک ایسے بادشاہ کا کردار ہے جس کی حکومت بحر و بر، جن و انس، چرند و پرند یہاں تک کہ ہواؤں پر بھی ہے۔ 'سبا' سے اس کا تعلق یہ ہے کہ وہاں 'بلقیس' رہتی ہے جو اسرائیلی روایات کے مطابق اس بادشاہ کی بیوی ہے۔ 'سلیمان' کے تعلق سے یہ قصہ ہمارے اجتماعی حافظے کا حصہ ہے۔ اب راشد کی نظم میں بیان کردہ 'سلیمان' کو ملاحظہ فرمائیے۔

سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں/ سبا ویراں، سبا آسیب کا مسکن/ سبا آلام کا انبار بے پایاں/ گیاہ و سبزہ و گل سے جہاں خالی/ ہوائیں تشنۂ باراں/ طیور اس دشت کے منقار زیر پر/ تو سرمہ در گلو انساں/ سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں![3]

'سلیماں' اور 'سبا' دو ایسی تاریخی علامتیں ہیں جن کے ساتھ عظمت و شوکت کا تصور وابستہ ہے۔ لیکن راشد نے ان علامتوں کو زوال، بے بسی اور تباہی کا منظر نامہ بنایا ہے۔ نظم کے آغاز میں 'سلیماں' کی پرشکوہ ہستی سے وابستہ ہمارا تصور مجروح ہو جاتا ہے اور ہم اچانک 'سلیماں' کو بے بسی اور کسمپرسی کی انتہاؤں پر دیکھتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ شان و شوکت اور سطوت کی یہ علامت اس بدترین حالت کو کیسے پہنچی۔ 'سبا' کا علاقہ جو خوشحالی اور زرخیزی کا دوسرا نام تھا وہ ویران ہی نہیں بلکہ آسیب کا مسکن بن چکا ہے۔ دنیا نباتات سے محروم ہے نہ سبزہ ہے نہ پھول اور نہ گھاس اور یہ سب کچھ ہو بھی تو کیسے کہ ہواؤں میں پانی ہی نہیں۔ گویا ایک آفاقی خشک سالی کا منظر ہے۔ نظم کے آخری حصے پر پہنچنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تباہی اور زوال کا سبب وہ غارت گر ہے جس کے اثرات ابھی تک اس زمین پر ہیں۔ چونکہ یہ نظم راشد کے مجموعے ایران میں اجنبی میں شامل ہے اور اس کا پس منظر جنگ عظیم دوم کے بعد کا ایران ہے جو سیاسی و ملکی انحطاط کے سبب غیر ملکی استعماریت کا شکار ہو گیا تھا۔ لہٰذا 'غارت گر' یہاں نو آبادیاتی طاقت کی علامت ہے جس نے ایران کو لوٹ کر برباد کر دیا تھا۔ 'سبا ویراں' ایک ایسے انسانی منطقے کی علامت بنائی گئی ہے جو آلام و آسیب کا شکار ہے، جہاں بالیدگی اور نمو پذیری اپنی قوت کھو چکی ہے۔ انسان سے اس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور پورے ماحول پر ایک غیر تخلیقی قوت غالب آگئی ہے جس کی وجہ سے عمل تخلیق معدوم ہو گیا ہے لہٰذا سب کچھ اگر بنجر اور ویران ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ راشد کی اس نظم پر گفتگو کرتے ہوئے طارق ہاشمی لکھتے ہیں ''نظم کی فضا ایلیٹ کے اسلوب شعر سے بہت مماثل ہے۔ نظم پڑھ کر ان کی نظم 'Gerontion' اور 'The Waste Land' کے بعض مصرعے بھی یاد آتے ہیں۔''[4]

راشد کے عہد میں بھی لوگوں نے ان کی تخلیقات میں خاصا ابہام محسوس کیا اور اب بھی جدید نظمیں مبہم اور مشکل ترین سمجھی جاتی ہیں۔ جدید نظموں کی تفہیم کے سلسلے میں درپیش مشکلات کے دیگر اسباب کے ساتھ ساتھ ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ زیادہ تر علامتیں قدیم دیومالائی کہانیوں، لوک کتھاؤں یا تاریخی حوالوں سے وارد ہونے کے باوجود کچھ الگ ہیں۔ نیا ادب اگرچہ پرانی علامتوں کے سہارے چل رہا ہے لیکن ایک نئے انداز میں۔ انتظار حسین کا زرد کتا ہو یا آخری آدمی، انور سجاد کا پرومیتھس، سسی فس ہو یا سنڈریلا تاریخی یا نیم تاریخی اور اساطیری حوالوں سے در آنے والے ان کرداروں کو سمجھنے میں قاری کو مشکل یوں بھی پیش آتی ہے کہ نئے ادب میں ان کا استعمال محض تلمیحی نہیں ہے۔ قاری جس 'سلیماں' سے روبرو ہوتا ہے وہ کروفر والا اور شان و شوکت والا بادشاہ سلیمان نہیں بلکہ راشد کا 'سلیماں' سر بہ زانو ہے۔ اور سبا کی ویرانی میں سلیماں کو سر بہ زانو دیکھنا ایک بالکل غیر متوقع اور حیران کن تجربہ ہے۔ ادب میں اساطیر اور دیومالا کے علامتی استعمال کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے سہیل احمد خان نے ایک بہت اہم بات کہی ہے:

نئے ادب میں عموماً ہوا یہ ہے کہ قدیم علامتیں الٹ گئی ہیں۔ زینہ بلندی کی طرف نہیں جاتا پل راستے میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ مذہبی اور اساطیری کردار اپنی قوت کھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سلیماں سر بہ زانو ہے اور سبا ویراں۔ انسان جانور بن جاتا ہے اور بھول بھلیاں سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ سواریاں منزل تک نہیں پہنچتیں اور زندگی کا شجر ٹنڈ منڈ درخت بن گیا ہے... انسان کو جانور نئے افسانہ نگاروں نے تو نہیں بنایا وہ قدیم کہانیوں ہی کا ایک مرحلہ تو ہے بھول بھلیوں میں پھنسنا بھی خود انھیں کہانیوں ہی کا ایک مرحلہ ہے۔ پل سے لڑھک جانے کا منظر وہاں بھی ہے مگر وہاں انسان گر کر سنبھل جاتا ہے اور ان عبوری مراحل سے نکل آتا ہے نئے ادب میں عموماً یہ مرحلہ مستقل بن جاتا ہے۔[5]

نظم 'اسرافیل کی موت' میں راشد نے اسرافیل کے اساطیری کردار کو مختلف جہتوں اور تخلیقی رویوں کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ نظم گذشتہ صدی کے ساتویں عشرے میں کہی گئی تھی۔ اس وقت مغربی ادب میں بالخصوص Death of Orpheus کا بہت چرچا تھا۔ یک بیک سارے مغربی ملکوں میں اور بالخصوص ادیبوں اور دوسرے تخلیق کاروں کی دنیا میں ایک داخلی سناٹے کی کیفیت تھی۔ اس سکوت کی گونج ہمیں اس نظم میں بھی سنائی دیتی ہے۔ اسلامی اساطیر کے حوالے سے اسرافیل انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور بہ حکم خداوندی انھیں ایک حیات ابدی عطا کرے گا۔ راشد نے اس روایت کو اپنے تخلیقی رنگ میں الگ جہت دے دی ہے اور ہم ایک ایسے اسرافیل کو دیکھتے ہیں جو خود مرگ آشنا ہے۔ وہ ہستی جو نئی اور ابدی زندگی کا وسیلہ سمجھی جاتی ہے وہی موت سے دوچار ہوگئی۔ مرگ اسرافیل ایک ایسا کربناک حادثہ ہے جس کے صدمے سے نہ یہ کہ پوری کائنات کی حالت ابتر ہے بلکہ خالق کائنات کی آنکھیں بھی نم ہیں، کیوں کہ اسرافیل کی موت گویا آواز کی موت ہے۔ ترسیل اور اظہار کی موت ہے، چنانچہ زمان و مکاں جو آواز ہی کے رشتے سے باہم منسلک تھے اور انسان اور فطرت خداوندی میں آواز ہی سے ربط قائم تھا لہٰذا مرگ اسرافیل کے باعث انسان اور خدا کے درمیان رابطہ بھی ختم ہوگیا:

مرگ اسرافیل سے/ گوش شنوا کی، لب گویا کی موت/ چشم بینا کی، دل دانا کی موت/ تھی اسی کے دم سے درویشوں کی ساری ہاؤ ہو/ اہل دل کی اہل دل سے گفتگو/ اہل دل جو آج گوشہ گیر و سرمہ درگلو/ اب تنانا ہو بھی غائب اور یارب ہا بھی گم/ اب گلی کوچوں کی ہر آواز گم/ یہ ہمارا آخری ملجا بھی گم/ مرگ اسرافیل سے/ اس جہاں کا وقت جیسے سو گیا، تھرا گیا/ جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا/ ایسی تنہائی کہ حسن تام یاد آتا نہیں/ ایسا سناٹا کہ اپنا نام یاد آتا نہیں/ مرگ اسرافیل سے/ دیکھتے رہ جائیں گے دنیا کے آمر بھی/ زباں بندی کے خواب/ جس میں مجبوروں کی سرگوشی تو ہو/ اس خداوندی کے خواب!
(اسرافیل کی موت)[6]

نظم کی تعبیر مختلف ناقدین نے مختلف طریقے سے کی ہے۔ عقیل احمد صدیقی کے خیال میں اس نظم میں اسرافیل انسانی ضمیر کا استعارہ ہے اور اسرافیل کی موت بنیادی طور پر انسانی ضمیر کی موت ہے۔ یہ تصور کہ قیامت آئے گی اور اس وقت اسرافیل صور پھونکیں گے تو راشد اعلان کرتے ہیں کہ اسرافیل کی تو موت واقع ہو چکی اور اس کے خوف سے جو نظام کائنات میں رنگ و آہنگ یا سوز و گداز تھا، کب کا ختم ہو چکا۔ یہ پوری نظم زبردست طنزیہ انداز رکھتی ہے۔

نظم کی ایک تعبیر یہ بھی کی گئی کہ اسرافیل انسانی تہذیب و تمدن کے تحرک اور انسانی حقوق کی حفاظت کی علامت ہے۔ یہ ایک ایسا بنیادی نقطہ ہے، جس کے گرد راشد نے تمام بنیادی انسانی تقاضے جمع کر دیے ہیں۔ اسرافیل کی زندگی ان تقاضوں کی حفاظت ہے اور اسرافیل کی موت اس مقصد کی موت ہے۔ انسان کی فکری، تہذیبی اور سیاسی آزادی سلب ہونے سے دنیا انجماد کا شکار ہوگئی ہے۔ اس نظم کی علامتیں ان ایشیائی ممالک پر منطبق ہوتی ہیں جہاں آمرانہ نظام قائم ہے اور عوام بنیادی حقوق سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ نظم میں معانی کے اتنے امکانات اور فنی دبازت، اسطور کے کامیاب استعمال کی ہی مرہون منت ہے۔ راشد کی ایک اور نظم ہے ابولہب کی شادی۔ نظم 'ابولہب کی شادی' میں ابولہب اجنبی زمینوں سے لعل و گوہر سمیٹتا، سالہا سال بعد جب اپنے گھر واپس آتا ہے تو لوگ اس کی یہ بات نہیں بھولتے کہ

ابولہب! / تو وہی ہے جس کی دلہن جب آئی، تو سر پہ ایندھن/ گلے میں سانپوں کے ہار لائی؟ (ابولہب کی شادی)[7]

یہ سن کر ابولہب یہ نہیں کرتا کہ لوگوں سے معافی مانگ لے بلکہ وہ اپنے عمل پر نازاں ہوتا ہے اور اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اجنبی کی طرح باقی زندگی گزار دے۔

ابولہب ایک لحہ ٹھٹکا، لگام تھامی، لگائی مہمیز، ابولہب کی خبر نہ آئی![8]

قرآن میں ابولہب اور اس کی بیوی کا ذکر دشمن اسلام کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ یہ دونوں پیغمبر اسلام کے دشمن تھے اور ہمہ وقت انھیں تکلیف پہنچانے کے درپے رہتے تھے۔ راشد نے دونوں کو اس تاریخی مفہوم سے نکال کر نئے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ابولہب کے لفظ میں 'آگ اور چنگاری' کا لغوی مفہوم موجود ہے۔ بیوی کی صفت یہ ہے کہ اس کے سر پہ ایندھن ہے اور گلے میں سانپوں کا ہار۔ دونوں باتیں کسی کو بھی خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ عقیل احمد صدیقی کے خیال میں "اس نظم میں ابولہب مذہبی استعارے کے طور پر مستعمل نہیں ہے بلکہ یہ 'فنکار' کی علامت ہے اور 'بیوی' اس کا 'فن' ہے۔ یہ فن عوام کو اس لیے پسند نہیں کہ یہ اجنبی بو باس رکھتا ہے اور ان کے لیے اچنبھے اور خوف کا باعث ہے۔"[9]

ابولہب کو فنکار کی علامت بنانے سے متعلق عقیل صاحب یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ "یہ دراصل عوام کے رویے کے خلاف ردعمل بھی ہوسکتا ہے جس طرح فرانس کے علامت نگار خود کو 'زوال پسند (ڈکیڈینس)' کہتے تھے گویا اسی طرح راشد نے بھی خود کو ابولہب کہا ہے۔ اس میں ایک طنز کی کیفیت ہے اور یہ طنز عوام پر ہے کہ وہ سنجیدہ شاعروں کو اپنا دشمن مانتے ہیں۔"[10]

اب کچھ ایسی نظموں کا تذکرہ جن میں اسلامی اور اسرائیلی اساطیر سے قطع نظر ان اساطیر سے استفادہ کیا گیا ہے جنھیں کسی مکانی یا ثقافتی چوکھٹے میں بند کرنا مشکل ہے۔ اساطیر سے ماخوذ علامتوں میں راشد کی ایک علامت 'سمندر' ہے۔ سمندر ادبیات اور اساطیر عالم کی ایک اہم علامت سمجھی جاتی ہے۔ ہر تہذیب کے اساطیر میں سمندر ایک مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ چینی تہذیب کے مطابق سمندر ہی اژدہاؤں کا خصوصی مسکن اور ہر قسم کی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ قدیم ہند کے ویدک زمانے میں پانی کو زندگی کی ماں کہا گیا۔ پانی کو لافانی بتایا گیا ہے۔ اس زمین پر پانی ہی چیزوں کا آغاز اور انجام ہے، یعنی سمندر کے ساتھ موت اور از سر نو پیدائش کا تصور پایا جاتا ہے۔ راشد کی دو نظموں 'اے سمندر' اور 'سمندر کی تہہ میں' میں سمندر تہ در تہ لاشعور کی علامت ہے، جس کی اتھاہ گہرائیوں میں نامعلوم کیا کچھ پڑا ہے، گویا ماضی اور ماضی کے تجربات، اساطیر، خواب، ناتمام خواہشیں اور پرانی یادیں۔

سمندر کی تہ میں/ سمندر کی سنگین تہ میں/ ہے صندوق... / صندوق میں ایک ڈبیا میں ڈبیا/ میں ڈبیا.../ میں کتنے معانی کی صبحیں/ وہ صبحیں کہ جن پر رسالت کے در بند/ اپنی شعاعوں میں جکڑی ہوئی کتنی سہمی ہوئی! (سمندر کی تہ میں)[11]

ذکر جب راشد کا ہو تو ان کی محبوب ترین علامت 'آگ' کا تذکرہ کیے بغیر یہ ذکر مکمل نہیں ہوسکتا۔ زمانہ قبل

از تاریخ سے 'آگ' ایک مافوق الفطرت قوت کی حیثیت اختیار کرگئی تھی۔ بعدازاں دنیا کی قدیم تہذیبوں مثلاً مصر اور ویدک ہند میں آگ کو دیوتا کا مقام حاصل ہوگیا۔ دنیا کے مختلف خطوں میں یہ دیوتا مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا۔ چنانچہ آریا اسے اگنی، مصری رع، یونانی اپالو اور ہیلی اوس، رومی ولکن اور ایرانی اسے مزد کہتے تھے۔ 12

مشرق اور مغرب کی دیومالا میں آگ سے متعلق تصورات میں حیرت انگیز یکسانیت نظر آتی ہے۔ قدیم انسان نے آگ سے جو تجربات حاصل کیے، ان میں ہمہ گیر مماثلت کا عنصر ملتا ہے مثلاً قدیم انسان کا تعلق زرعی زندگی سے تھا۔ انسان ہمیشہ سے بکثرت پیداوار کا خواہش مند رہا۔ اس ضمن میں وہ آگ کو اپنا مددگار اور دوست سمجھتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ آگ کے سحر سے اس کی فصلوں پر ہونے والے برے اثرات دور ہوسکیں گے۔ زرخیزی کے ساتھ ساتھ آگ کے ساتھ تطہیر کا تصور بھی وابستہ تھا یعنی آگ سے چھوجانے والی ہر چیز پاک، صاف اور گناہ و آلائش کی آلودگی سے مصفا ہوجاتی ہے۔ زرخیزی، افزائش اور تطہیر کے یہ تصورات پوری دنیا میں موجود رہے ہیں، اس سلسلے میں یورپ، ایشیا اور افریقہ میں فرق نہیں ہے۔ ہندو دیومالا کے مطابق 'اگنی' ہی ایک ایسا دیوتا ہے جس میں دیگر تمام دیوتا جذب ہوجاتے ہیں، اسی لیے اسے دیوتاؤں کا مجموعہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ راشد کی شاعری میں مختلف شعوری اور غیرشعوری تصورات کی پیش کش کے لیے آگ بار بار اپنے تلازمات کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ کہیں وہ آزادی کی علامت ہے تو کہیں جذبے اور شعور کی علامت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے تو کہیں اس کے تطہیری کردار کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے:

آگ آزادی کا دلشادی کا نام/ آگ پیدائش کا، افزائش کا نام/ آگ کے پھولوں میں نسریں، یاسمن، سنبل، شقیق ونسترن/ آگ آرائش کا، زیبائش کا نام/ آگ وہ تقدیس دھل جاتے ہیں جس سے سب گناہ/ آگ انسانوں کی پہلی سانس کے مانند اک ایسا کرم/ عمر کا اک طول بھی جس کا نہیں کافی جواب (دل مرے صحرانورد پیر دل) 13

راشد نے نہ صرف یہ کہ اساطیر کا بحسن وخوبی استعمال کیا ہے بلکہ ان کے یہاں اسطورسازی کی کامیاب کوشش بھی نظر آتی ہے۔ راشد کا حسن کوزہ گر، جہاں زاد، وزیرے چنیں اور وزیرمعارف کیانی وغیرہ ایسے ہی کردار ہیں جو دیومالائی کردار محسوس ہوتے ہیں۔ حسن کوزہ گر شعریت کے اعتبار سے ان کی نظموں میں ایک مختلف رنگ یعنی ایک وجدانی طرز احساس کی حامل علامت نظم بن جاتا ہے، جہاں بغداد کے اساطیری حوالوں سے راشد نے ایک نیا اسطور تشکیل دینے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ الف لیلوی علامتیں بغداد کی گلیوں اور دروازوں سے ابھرتی ہیں اور قاری خود کو ایک دیومالائی دنیا میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ نظم میں جہاں زاد کا کردار 'دنیازاد' کے کردار سے ماخوذ ہے۔ حسن کوزہ گر کا کردار راشد نے ایک سیریز کے تحت چار نظموں میں پیش کیا ہے۔ یہ چاروں نظمیں مل کر ایک کل کی تشکیل کرتی ہیں اور جزوی طور پر اپنا اپنا مکمل مفہوم بھی رکھتی ہیں۔ اس کی معنوی توضیح اور کرداروں کی توضیح مختلف سطحوں پر کی جاسکتی ہے، کیونکہ راشد نے اس نظم میں محض افسانے یا کردار کی تخلیق پر ہی توجہ مرکوز نہیں رکھی بلکہ عہد جدید کے بعض فکری عناصر بھی سموئے ہیں خصوصاً وقت کا مسئلہ اور زمان ومکاں کے مباحث اس نظم کے مصرعوں میں بار بار آئے ہیں۔ راشد چاہتے تو اسے جنوبی ایشیا کے کسی مقام سے شروع کرسکتے تھے یا کسی ایرانی شہر مثلاً تہران، مشہد اور قزوین وغیرہ سے کیونکہ یہ دیار وامصار راشد کے براہ راست تجربے کا حصہ تھے، لیکن ان کا تخلیقی حوالہ بغداد اور دجلہ کی سرزمین ہے۔ اس سرزمین کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہ خطہ ماضی کے آثار قدیمہ اور داستانوں کا ایک کثیر ذخیرہ رکھتا ہے اور راشد نے شعوری یا غیرشعوری طور پر ایک اسطوری تشکیل کی کوشش کی ہے۔ وہ حسن اور جہاں زاد کے رومانس کے اولیں منظروں کے لیے دجلہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ دجلہ وہ الف لیلوی دریا ہے جس کے نام کے ساتھ ہزار راتوں کی داستانیں منسوب ہیں۔

راشد کی شاعری سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں: ''خارجی زندگی کے جن پہلوؤں کے خلاف راشد نے جہاد کیا، وہ زمانے کی ایک ہی کروٹ سے مٹ چکے ہیں اور یوں راشد کے جہاد کی عمومی اپیل بھی ازخود ختم ہوگئی۔'' 14

وزیر آغا کے ان الفاظ سے گزرتے ہوئے عقل حیران تھی کہ یہ ادب کے متعلق گفتگو ہے یا کسی فوجی مشن پر جانے سے متعلق۔ اہم بات یہ ہے کہ راشد کے یہاں اساطیری لہجے کی گونج اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ عمومی اپیل وہ شاعری کھودیتی ہے جس میں معانی کی ایک سے زیادہ سطحوں کے امکانات نہیں ہوتے۔ لیکن راشد کی مبہم اور علامتی شاعری کو آپ ہر زمانے کے ظلم و جبر کے خلاف اور نظریات کی فرسودگی اور ٹکراؤ میں اپنے دل کی آواز کے ہمراہ پاتے ہیں۔ راشد کی بہت سی نظموں میں علامتیں، استعارے، تمثالیں اور تلازمے اگرچہ تاریخ کے خاص کرداروں کی طرف اشارہ کرتے ہیں مگر یہ علامتیں زمانی اور مکانی حوالوں کے بغیر بھی اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں اور وہی کشش رکھتی ہیں۔ تبسم کاشمیری کی رائے اس سلسلے میں انتہائی معتدل ہے کہ ''زمان ومکاں کے کسی دور میں بھی جب جمود وانحطاط کی ایسی غیرتخلیقی حالت طاری ہوجائے تو 'سباویراں' میں اس کی علامتی معنویت موجود ہوگی اور نظم کا یہی قرینہ اسے ہر زمانی حالت میں زوال کی علامت بنا سکتا ہے۔'' 15

راشد کی متعدد نظموں کے تجزیے سے اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ راشد کے یہاں نہ صرف یہ کہ عربی اور اسرائیلی روایات اور اساطیر کا گہرا اثر موجود ہے بلکہ عالمی اساطیر کے حوالے بھی ان کی شاعری میں قابل ذکر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ اردو نظم کی تاریخ میں راشد کی مسلم اور منفرد حیثیت کو مستحکم کرنے میں ان کے ان اساطیری حوالوں کا بھی بہت اہم کردار رہا ہے۔

حواشی

1 سید یحیٰی نشیط، اسطوری فکر و فلسفہ، پونہ: اصول پبلیکیشنز، 2008، ص 15
2 تبسم کاشمیری 'راشد اور شہر کی تمثال'، لامساوی راشد، لاہور: نگارشات، 1994، ص 145
3 ن م راشد، کلیات راشد، دہلی: کتابی دنیا، 2016، ص 168
4 طارق ہاشمی، جدید نظم کی تیسری جہت، فیصل آباد: شمع بکس، 2014، ص 103
5 سہیل احمد خان، 'علامتوں کے سرچشمے'، علامت کے مباحث مرتبہ اشتیاق احمد، لاہور: بیت الحکمت، 2005، ص 117
6 ن م راشد، کلیات راشد، ص 285
7 ایضاً، ص 270
8 ایضاً
9 عقیل احمد، صدیقی، جدید اردو نظم: نظریہ و عمل، علی گڑھ: ایجوکیشنل ہاؤس، ص 297
10 ایضاً
11 ن م راشد، کلیات راشد، ص 450
12 تبسم کاشمیری، لامساوی راشد، ص 124
13 ن م راشد، کلیات راشد، ص 271
14 وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، دہلی: دارالاشاعت مصطفائی، 2014، ص 357
15 تبسم کاشمیری، لامساوی راشد، ص 97

■

Dr. Qamar Jahan
Asst Prof. Dept of Urdu
Mahila P G College
Bahraich- 271801 (UP)
Mob.: 9910360096

ثاقب فریدی

ن م راشد شمیم حنفی کی نظر میں

شمیم حنفی نے راشد کی شاعری کے معنوی امکانات، دانشورانہ آھنگ اور تفکر کو تاریخی اور معاشرتی سیاق میں دیکھا ھے۔سب سے اھم چیز یہ ھے کہ شمیم حنفی نے راشد کی شاعری کو تخلیقی احتیاج کے طور پر دیکھاھے۔شمیم حنفی کا خیال ھے کہ راشد کا نام ایک وقت تک پھبتی کے طور پر لیا جاتاتھا۔ان کی شاعری کو جنس زدہ، مریضانہ ذھنیت کا حامل،مبھم اورمھمل سمجھا جاتا رھا۔راشد کے تعلق سے یہ خیال عام تھا کہ راشد کے خیالات مغرب سے ماخوذ ھیں اور مشرق کی شعری روایت سے اس کا کوئی سروکار نھیں ھے۔پھر وہ وقت بھی آیا جب راشد کی شاعری کے معنوی امکانات روشن ھوئے۔

شمیم حنفی نے راشد پر ایک تفصیلی مضمون ’خودکوزہ و خودکوزہ گر وخودگل کوزہ‘ کے عنوان سے لکھا تھا۔ان کا یہ مضمون اردو ادب کے راشد نمبر میں شائع ہوا۔شمیم حنفی کے اس مضمون کا عنوان راشد کی ایک مشہور نظم ’حسن کوزہ گر‘ سے مستعار ہے۔شمیم حنفی کا یہ مضمون راشد کی نظم ’حسن کوزہ گر‘ کی توضیح وتنقیداور اس کا مرتبہ متعین کرنے تک محدود نہیں ہے۔انھوں نے راشد کے ساتھ ان کے عہد کے شعرا میں میراجی، اختر الایمان، فیض اور مجید امجد کا نام کئی موقعوں پر لیا ہے۔ان لوگوں کے بالمقابل شمیم حنفی کو راشد کی شاعری معنوی امکانات، لہجے اور تفکر کی گونج اور دانشورانہ آہنگ واسلوب کی سطح پر زیادہ وقیع، گراں مایہ اور طاقتور نظر آتی ہے۔شمیم حنفی کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ راشد کی شاعری میں جو معنوی امکانات ہیں ان کا رشتہ راشد کے عہد سے ہی نہیں بلکہ ہمارے عہد سے بھی ہے۔لیکن راشد کا اسلوب عام طور پر لوگوں کے لیے حجاب بن گیا۔اس اسلوب کے تجزیے اور تفہیم کے لیے ذہنی تربیت کی بھی ضرورت ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی ایک بڑے حلقے میں راشد کی شاعری فیض اور اختر الایمان کے مقابلے میں اجنبی ہے۔شمیم حنفی کو یہ احساس بھی ہے کہ راشد کے مقابلے میں ان کے دوسرے معاصرین کو زیادہ پڑھا گیا۔شمیم حنفی راشد، میراجی، مجید امجد، اختر الایمان اور فیض کی شعری انفرادیت کے قائل ہیں۔ان کی کتاب میراجی کا نگارخانہ بھی ہے۔انھوں نے غالب اور اقبال کے بعد راشد کو تیسرا سب سے جاذب نظر شاعر قرار دیا ہے۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

”غالب اور اقبال کے بعد میرے لیے وہ تیسرے شاعر ہیں جس کی نظموں میں معنی کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔یہ شاعری اپنی تفہیم اور تعبیر کے کسی بھی مرحلے میں ہمارے لیے ماضی کی چیز نہیں بننے پاتی۔اپنے تمام دروازے کبھی بند نہیں کرتی، کسی نہ کسی تجربے، طرز احساس اور تصور کے واسطے سے یہ شاعری ہمیں از سر نو متوجہ کر لیتی ہے اور ہماری تخلیقی احتیاج کی آسودگی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔اپنے دانشورانہ آہنگ اور تفکر کے لحاظ سے اپنے تاریخی اور معاشرتی حوالوں کی کثرت اور رنگا رنگی کے اعتبار سے، راشد— غالب اور اقبال کے بعد ہمارے تیسرے سب سے جاذب نظر شاعر ہیں۔“

(خودکوزہ وخودکوزہ گر وخودگل کوزہ، شمیم حنفی: اردو ادب ن. م. راشد نمبر، نئی دہلی، 2010، ص30)

شمیم حنفی نے راشد کی شاعری کے معنوی امکانات، دانشورانہ آہنگ اور تفکر کو تاریخی اور معاشرتی سیاق میں دیکھا ہے۔سب سے اہم چیز یہ ہے کہ شمیم حنفی نے راشد کی شاعری کو تخلیقی احتیاج کے طور پر دیکھا ہے۔شمیم حنفی کا خیال ہے کہ راشد کا نام ایک وقت تک پھبتی کے طور پر لیا جاتا تھا۔ان کی شاعری کو جنس زدہ، مریضانہ ذہنیت کا حامل، مبہم اور مہمل سمجھا جاتا رہا۔راشد کے تعلق سے یہ خیال عام تھا کہ راشد کے خیالات مغرب سے ماخوذ ہیں اور مشرق کی شعری روایت سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے۔پھر وہ وقت بھی آیا جب راشد کی شاعری کے معنوی امکانات روشن ہوئے۔ رفتہ رفتہ مشرقیت کے سیاق میں راشد کی شاعری کو دیکھا جانے لگا۔راشد کی شاعری مجموعی طور پر مشرق کے زوال کا علامیہ بن گئی۔ان کے ابہام کو بھی فنی ہنر مندیوں سے تعبیر کیا گیا۔اب اردو کے بعض ناقدین کی نظر میں راشد اقبال کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔وہ الزامات جو راشد کی شاعری پر تھے رفتہ رفتہ ان کی شاعری ان الزامات سے نکل آئی۔شمیم حنفی نے راشد کے اس شعری سفر کو جس طرح بیان کیا ہے، اس سے راشد کی شاعری کے ساتھ ان کے عہد کی تصویر بھی نظر آتی ہے۔وہ راشد کی شخصیت اور ان کی شاعری کو ایک ساتھ دیکھتے ہیں۔راشد کے ذہنی اور جذباتی رابطوں، انسانی سروکاروں اور انسانی تجربوں تک پہنچنے کی کوشش کو ان کے اختصاص

کے طور پر دیکھتے ہیں۔راشد نے انسان کی زندگی اور انسان کے درمیان جتنے رابطے تلاش کیے ہیں وہ آج بھی ہمارے لیے اتنے ہی بامعنی ہیں جتنے کل تھے۔اس سیاق میں شمیم حنفی نے لکھا ہے۔

''فیض،میراجی، مجید امجد اور خود اختر الایمان کی شاعری کے محاسن اپنی اپنی جگہ مثال ہیں اور یہ ہمارے لیے ہمیشہ قیمتی اور لائق تعظیم رہیں گے،مگران میں سے کسی کے یہاں تفکر کی وہ گونج اور گہرائی نہیں ملتی جو راشد کی شاعری کاایک امتیازی وصف ہے۔کسی کے یہاں انسانی تجربوں کی اساس تک پہنچنے کی وہ حقیقت پسندانہ کوشش بھی نہیں دکھائی دیتی جو راشد کی شاعری میں نمایاں ہے اور اسی لیے راشد کے کسی بھی ہم عصر کے یہاں انسان کے انفرادی اور اجتماعی وجود کی وہ رنگا رنگی،وہ وسعت، مسئلوں اور معاملات کی وہ کثرت بھی نظر نہیں آتی جس نے راشد کی شاعری کو جدید دور کی سیاست، معاشرت، تاریخ اور تہذیب کا آئینہ خانہ بنا دیا ہے۔اس اعتبار سے راشد،حالی،اکبر،اقبال کی روایت سے بہ ظاہر الگ ہوتے ہوئے بھی دراصل اسی روایت کے شاعر ہیں۔''

(خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ، شمیم حنفی:اردو ادب ن.م.راشد نمبر،نئی دہلی،2010،ص 30.31)

راشد کے ذہن میں ہمیشہ ایک ایسی شاعری کا تصور موجود تھا جو مستقبل میں بہت دور تک اپنے اثرات باقی رکھے۔شمیم حنفی کا خیال ہے کہ راشد زندگی بھر ایک ایسے مستقبل کی تلاش وجستجو میں گم رہے جس کے خدوخال ابھی روشن نہیں ہوئے تھے۔شمیم حنفی راشد کو اجتماعی تاریخ سے الجھتا ہوا شاعر کہتے ہیں۔اور یہ کہ راشد نے تاریخ میں رہتے ہوئے تاریخی حصار کو توڑا ہے اور ایک نامعلوم مستقبل کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔دراصل ایک نئے اور تابناک مستقبل کی تلاش ہی تاریخی حصار کو توڑنا ہے اور حال سے مستقبل کی طرف جانا ہے۔زندگی کے ذاتی تجربے اور مشاہدے نے بھی راشد کو اس طرف آمادہ کیا ہوگا۔اس کے علاوہ انسان کی اجتماعی زندگی راشد کے داخلی کرب کا سبب بنی۔راشد بنیادی طور زندگی کی شکست تسلیم کرنے والے شاعر نہیں تھے۔حال میں رہ کر ایک روشن مستقبل کی تلاش کرنا موجودہ زندگی سے نبرد آزما ہونا بھی ہے۔وہ مشرق اور مغرب کے مابین کشمکش سے برخواستہ خاطر تو تھے لیکن انسان کو مشرق اور مغرب کے خانوں میں دیکھنے کے لیے کسی طور سے آمادہ نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ'ماورا'اور 'ایران میں اجنبی' کے بعد لا=انسان اور گمان کا ممکن میں راشد نے ایک ایسے انسان کو پیش کیا ہے جو زندگی کی تگ ودو میں خود اپنا وجود کھو بیٹھا ہے۔یہی انسانی تجربوں کی اساس تک پہنچنے کی حقیقت پسندانہ کوشش ہے۔یہ کوشش راشد کے علاوہ ان کے عہد کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔شمیم حنفی نے راشد کو حالی،اکبر اور اقبال کی روایت کا شاعر کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حالی،اکبر اور اقبال کی شاعری کا سروکار بھی اسی انسانی اور اجتماعی زندگی اور اس کے تجربے سے تھا۔شمیم حنفی نے حالی، اقبال، اکبر اور راشد کو ایک خاص سیاق میں راشد کے ساتھ رکھ کر دیکھا ہے۔نوآبادیاتی سیاق میں ان کو ایک طرح کا شاعر کہا جائے گا لیکن اسلوب کی سطح پر اکبر کا رشتہ اقبال اور راشد سے نہیں بنتا۔شمیم حنفی کی بات کا تعلق دراصل اس زمانے کی سیاسی اور سماجی صورت حال سے ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان تینوں نے ایک ایسا زمانہ دیکھا جو نوآبادیاتی صورت حال کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں مشرق ومغرب کی کشاکش جاری تھی۔ان تینوں نے مشرق کو اپنے اپنے طور پر دریافت کرنے کی کوشش کی اور اس دریافت کے عمل میں جو خدشات اور مغالطے پیدا ہوئے اور جو سوالات قائم ہوئے وہ آج بھی کسی نہ کسی طور پر دہرائے جا رہے ہیں۔ورنہ تو اسلوب کی سطح پر راشد حالی،اقبال اور اکبر سے بہت مختلف ہیں۔راشد نے اگر چہ کچھ غزلیں ضرور کہیں لیکن ان کا بیشتر کلام نظموں پر مشتمل ہے۔اگر ان چاروں کا ایک ساتھ نام لیا جائے گا تو ایک خاص نوآبادیاتی روشنی میں ہی لیا جائے گا۔

شمیم حنفی نے تاریخ تہذیب اور اجتماعی آشوب کو حالی،اکبر اور اقبال کے ساتھ ساتھ راشد کی شاعری کا بھی مرکزی حوالہ اسی سیاق میں کہا ہے۔شمیم حنفی کا خیال ہے کہ راشد کے علاوہ بیسویں صدی کے شاعروں میں صرف اقبال ہیں جنہوں نے ماضی اور حال سے آگے بڑھ کر مستقبل کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔اسی وجہ سے شمیم حنفی راشد اور اقبال کی حسیت کو مشترک خیال کرتے ہیں۔ان کی نظر میں راشد اور اقبال کی حسیت میں صرف بصیرت اور تناظر کا فرق ہے۔ورنہ اقبال اور راشد دونوں ایک نئے اور تابناک مستقبل کی بات کرتے ہیں۔ایک ہمہ گیر مستقبل کو اپنی گرفت میں لینے کا عمل ہی راشد کو اقبال کی روایت کا شاعر بناتا ہے۔شمیم حنفی نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ راشد اور اقبال کی مشترکہ حسیت دھوکے میں ڈالنے والی ہے۔ اگر اس مشترک حسیت کو صرف اوپری سطح پر دیکھا جائے تو اس سے غلط نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔مثال کے طور پر شمیم حنفی نے

راشد بنیادی طور زندگی کی شکست تسلیم کرنے والے شاعر نہیں تھے.حال میں رہ کر ایک روشن مستقبل کی تلاش کرنا موجودہ زندگی سے نبردآزما ہونا بھی ہے.وہ مشرق اور مغرب کے مابین کشمکش سے برخواستہ خاطر تو تھے لیکن انسان کو مشرق اور مغرب کے خانوں میں دیکھنے کے لیے کسی طور سے آمادہ نہیں تھے. یہی وجہ ہے کہ'ماورا'اور 'ایران میں اجنبی'کے بعد لا=انسان اور گمان کا ممکن میں راشد نے ایک ایسے انسان کو پیش کیاہے جو زندگی کی تگ و د و میں خود اپنا وجود کھو بیٹھا ہے.یہی انسانی تجربوں کی اساس تک پہنچنے کی حقیقت پسندانہ کوشش ہے.

فتح محمد ملک کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کیا ہے۔اس اقتباس میں فتح محمد ملک راشد کو اقبال ہی کی طرح سامراج دشمن دانشور کہتے ہیں اور راشد کی شاعری کو از اول تا آخر سامراجی اور نوآبادیاتی یلغار کے خلاف شمشیر برہنہ بتاتے ہیں۔اس حوالے سے شمیم حنفی کا خیال ہے کہ راشد سرسید سے اقبال تک پہنچے والی دانشورانہ روایت سے مستفیض ضرور ہیں لیکن وہ اقبال سے بالکل مختلف فکری اور جذباتی رویے کے حامل ہیں،اور یہ کہ راشد اپنے خاص زمانی اور مکانی تجربوں کے سیاق میں تاریخی اور معاشرتی موقف کا انتخاب کرتے ہیں۔دراصل یہی وہ خط امتیاز ہے جو راشد اور اقبال کے درمیان فاصلہ قائم کرتا ہے۔شمیم حنفی کہتے ہیں کہ جو چیز راشد کو اقبال سے قریب لاتی ہے وہ راشد کا اسلوب شعر، تہ داری،فکری دبازت،ان کی نظموں کا صوتی آہنگ اور راشد کا دانشورانہ تفکر ہے۔شمیم حنفی نے اس مضمون میں کئی بار یہ بات کہی ہے کہ راشد اور اقبال کے درمیان بہت فاصلہ ہے لیکن پھر کسی نہ کسی زاویے سے یہ دونوں انھیں ایک جیسے ہی شاعر نظر آتے ہیں۔اس کی ایک اہم وجہ دونوں کی نظموں میں مشرق کی بازیافت اور مشرقی روح کا ہونا ہے۔راشد اور اقبال دونوں کی شاعری میں مشرقی زوال کا گہرا شعور نظر آتا ہے۔دونوں کی شاعری کا پرشکوہ آہنگ ایک کو دوسرے سے قریب کر دیتا ہے۔اس میں شک نہیں ہے کہ راشد اور اقبال دونوں دو الگ طرح کے

شاعر ہیں لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ ان کے مشترک پہلو ہمیں ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

مضمون کے آخری حصے میں شمیم حنفی نے راشد کی نظم 'حسن کوزہ گر' پر بات کی ہے۔ اس نظم کو انھوں نے راشد کے زندگی بھر کے تجربے کا ماحاصل بتایا ہے۔ شمیم حنفی نے نظم 'حسن کوزہ گر' کے حوالے سے جو رائے پیش کی ہے وہ اس نظم کی تفہیم و تعبیر میں معاون ہے۔ اس کے چند جملے میں یہاں رقم کرتا ہوں۔

''اسے تو ہم ایک ایسے رازوں سے بھرے ہوئے بستے، ایک ایسی بے مثال تخلیقی وحدت کی کلید بھی کہہ سکتے ہیں جس سے راشد کی پوری شاعری عبارت ہے:

حسن کوزہ گر چار فصلوں میں بٹی ہوئی ایک شخصی تمثیل ہی نہیں، ایک عجیب و غریب، تہ در تہ اور بھری پری داستان بھی ہے جو ہمیں عہد زوال کے آخری بڑے شاعر نے سنائی ہے۔''

(خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ، شمیم حنفی: اردو ادب ن۔م۔ راشد نمبر، نئی دہلی، 2010، ص 36)

''مجھے حسن کوزہ گر کا سب سے دلکش اور معنی خیز پہلو یہی دکھائی دیتا ہے کہ راشد نے فکر کی کسی ماورائی متصوفانہ جہت کا سہارا لیے بغیر حقیقت کو اپنے تخلیقی وجود کو اور اپنے زمینی ادراک کو ایک اسطور (ایک Myth) کے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'حسن کوزہ گر' کا داستانوی پیرایہ، اس کی تمثیلی اور استعاراتی جہتیں، اس نظم کی افسردہ ساماں غنائیت اور اس کا حزن آمیز مگر طاقتور بیانیہ، بلاشبہ اسے ہمارے زمانے کی ایک یادگار تخلیق بناتا ہے، ایک حیران کن اور غیر معمولی وجودیاتی مظہر۔ راشد کا تخلیقی وفور، ان کا اضطراب آسا تفکر، ان کی فنکارانہ استعداد اس نظم میں اپنے عروج پر ہے۔''

(خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ، شمیم حنفی: اردو ادب ن۔م۔ راشد نمبر، نئی دہلی، 2010، ص 41)

نظم 'حسن کوزہ گر' کی اس تفہیم میں بہت تازگی محسوس ہوتی ہے۔ شمیم حنفی نے 'حسن کوزہ گر' کو تخلیقی وحدت کی کلید کہا ہے۔ اسے تخلیقی وحدت کی کلید کہنا اس کے بے کراں معنوی امکانات کا اشاریہ ہے۔ دوسرے اقتباس میں نظم 'حسن کوزہ گر' کو راشد کی مجموعی حسیت کا نچوڑ اور ان کے عمر بھر کے تجربے کی اساس کہا گیا ہے۔ انسان زندگی بھر کی محنت و مشقت کے بعد جو چیز حاصل کرتا ہے وہ عموماً بہت نایاب ہوا کرتی ہے۔ جس نظم کا کینوس ماضی سے لے کر مستقبل تک پھیلا ہوا ہو، اس میں ظاہر ہے بے شمار معنی پوشیدہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ شمیم حنفی نے 'حسن کوزہ گر' کو راشد کی مجموعی حسیت کا نچوڑ کہا ہے۔ آخری اقتباس میں نظم 'حسن کوزہ گر' کا رشتہ راشد کے تخلیقی وجود اور زمینی ادراک سے قائم کیا گیا ہے۔ راشد کا اپنے وجود اور زمینی ادراک کو ایک اسطور کے طور پر دیکھنا اپنے حال کی نفی کرنا ہے۔ حسن کوزہ گر کا داستانوی انداز بیان، اس کی تمثیلی اور استعاراتی جہتیں شمیم حنفی کو متاثر کرتی ہیں۔ حسن کوزہ گر کی ان صفات کو وہ معنی خیز شمار کرتے ہیں۔

شمیم حنفی نے اپنی کتاب نئی شعری روایت میں راشد اور میراجی کی شاعری پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ اس جگہ شمیم حنفی راشد اور میراجی کا نام ایک ساتھ لیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ راشد اور میراجی دونوں کی شاعری بیرونی ہدایت کے جبر سے آزاد تھی اور انفرادی تجربے کے اظہار میں دونوں نے بے باکی سے کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ راشد اور میراجی کی شاعری پر شکست خوردگی، منفی اور مریضانہ ذہنیت اور شاعرانہ اسلوب کی سطح پر ابہام اور پیچیدگی کے الزامات عائد کیے گئے۔ شمیم حنفی نے راشد اور میراجی کی شاعری میں ان الزامات کو تلاش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کی نگاہ راشد اور میراجی کے شاعری میں زندگی کے مختلف تجربوں پر ٹھہرتی ہے۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ راشد اور میراجی اپنے ماقبل کے شعرا سے احساس اور تجربے کی سطح پر کس قدر اور کیسے مختلف ہیں۔

''نئے احساس، جذبے، شعور لب و لہجے اور نئے لسانی سانچوں کی تعمیر و تشکیل، پہلی جنگ عظیم کے بعد رونما ہونے والے عالمگیر نفسیاتی اور جذباتی اضطراب کی انقلاب آفریں فضا میں، تیزی سے بنتی اور بگڑتی ہوئی انسانی شخصیت کے وسیع اور پیچیدہ تناظر میں انسان کو اسی قدر کے استعارے کے بجائے، ایک وجودی وحدت کے طور پر دیکھنے اور دکھانے کا واضح عمل، جو ایک نئے شعری نظام کا محرک بنا، راشد اور میراجی سے منسوب ہے۔''

(نئی شعری روایت، شمیم حنفی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2005 ص 38)

نئی شعری روایت میں شامل شمیم حنفی کا یہ مضمون بذات خود راشد کی نئی بازیافت ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے راشد کی شاعری اور شخصیت کو ان کے تاریخی، سیاسی اور معاشرتی سیاق میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ راشد کے لہجے کی گونج اور دانشورانہ آہنگ و اسلوب پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ اس مضمون میں شمیم حنفی یکے بعد دیگرے راشد کے چاروں شعری مجموعوں پر بات کرتے ہیں اور راشد کے شعری محاسن، فنی ہنر مندیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے راشد کے ذہنی ارتقا پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شمیم حنفی کے اس مضمون کی قرأت کے بعد ایک مبتدی الذہن قاری راشد کے شعری محرکات، ان کی نظموں کی نفسیاتی صورت حال اور ان کے گھنے اور گہرے تجربے سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ شمیم حنفی راشد کو دانشورانہ آہنگ اور تفکر کے لحاظ سے غالب اور اقبال کے بعد اردو کی شعری روایت کا سب سے جاذب نظر شاعر خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں بتایا ہے کہ مغرب کی سائنسی تہذیب نے پورے مشرق کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اس نے مشرقی تہذیب و تمدن اور مذہبی اقدار پر جو کاری ضرب لگائی تھی، اس کی وجہ سے پورے مشرق میں جمود اور افسردگی کی ایک فضا پیدا ہوگئی۔ افسردگی اور جمود کی اس فضا نے 'ماورا' کی بیشتر نظموں میں غم اور غصے کی کیفیت پیدا کر دی ہے، لیکن راشد کے تفکر کی گونج غم اور غصے کی اس کیفیت پر حاوی نظر آتی ہے۔ راشد کے اسی دانشورانہ تفکر نے ماورا کی بیشتر نظموں میں ایک منطقی ماحول پیدا کیا ہے۔

شمیم حنفی کا خیال ہے کہ ماورا کی ابتدائی نظموں میں راشد کی جس ذہنی واردات کا اظہار ہوا ہے اس پر اختر شیرانی کی رومانویت اور ترقی پسند میلانات کا عکس نظر آتا ہے۔ شمیم حنفی ''میں اسے واقف الفت نہ کروں، رخصت، مری محبت جواں رہے گی، جرأت پرواز، عہد وفا جیسی نظموں میں رومانویت کے گہرے اثرات دیکھتے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ راشد کی ان نظموں میں محبت کا وہی ماورائی اور مقدس تصور موجود ہے جس نے اختر شیرانی کی شاعری میں سلمی وعذرا جیسے رومانوی کرداروں کو پیش کیا اور اسی ماورائی تصور شعر نے فیض کی شاعری میں محبت اور فرض کی کشمکش بھی پیدا کی ہے۔

شمیم حنفی کا خیال ہے 'ایران میں اجنبی' کی نظموں میں عالمگیر شعور کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ یہاں متکلم کا شعور اس بات سے آگاہ ہوتا ہے کہ انسانی زوال میں خود اس کا بھی اہم رول ہے۔ یہاں متکلم انگریزی ظلم وتشدد کا شکار ہوکر اپنی مظلومیت کے نغمے نہیں گاتا بلکہ تہذیبی اور سیاسی زوال میں خود اپنی شمولیت پر غور کرتا ہے۔ اس سیاق میں راشد نے اپنے ماضی، مذہب، مشرقی جمود، قناعت پسندی اور مشرق کے احساس آسودگی اور مزاج تن آسانی کی سخت گرفت کی ہے۔ ان رویوں کو پورے مشرق کے زوال کا ذمے دار قرار دیا ہے۔ شمیم حنفی ایران میں اجنبی کے ضمن میں راشد کی ہمہ گیر فکر اور مفکرانہ جلال کی بات کرتے ہیں۔ شمیم حنفی کو یہاں پہنچ کر راشد کی شاعری ماورا کے بالمقابل زیادہ پختہ اور مستحکم معلوم ہوتی ہے۔ انھیں یہ خیال بھی آتا ہے کہ ایران میں اجنبی کی نظمیں ماورا اور لا=انسان کے درمیان کی ایک مربوط اور مستحکم کڑی ہیں۔ یہ نظمیں ماورا کی حقیقت پسندی کو لا=انسان کی نئی حقیقت پسندی سے جوڑ دیتی ہے۔ اس حوالے سے شمیم حنفی نے لکھا ہے۔

''اب ان کی فکر 'ماورا' کی رومانیت اور انقلاب پسندی کے تقابل میں زیادہ ہمہ گیر اور عمیق دکھائی دیتی ہے اور تاریخی واقعات علامتی معنویت سے ہمکنار ہوکر مغرب ومشرق کے تہذیبی انتشار کے نسبتاً پیچیدہ تر پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان نظموں میں ادراک کی روشنی اور وسعت کے ساتھ زندگی کے ایک واضح شعور پر گرفت نے راشد کی آواز میں ماورا کے رومانی اور جذباتی آہنگ کے بجائے پختگی اور صلابت کو راہ دی ہے اور نامطبوع حقائق کے خلاف احتجاج کی لے، مفکرانہ جلال سے مملو ہے۔ اب راشد استعمار کی زنجیر کے علاوہ دور زمان ومکاں سے نکلنے اور ہستی رایگاں کے مفہوم کو سمجھنے کا جتن کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے 'ایران میں اجنبی کی شاعری ماورا کی نیم پختہ رومانی حقیقت پسندی اور لا=انسان کی نئی حقیقت پسندی کے بیچ کی کڑی بن جاتی ہے اور راشد کو اس جذباتی اور ذہنی ماحول سے قریب تر لاتی ہے جس میں جدیدیت کا خاکہ تیار ہوا ہے۔'' (نئی شعری روایت، شمیم حنفی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2005 ص 60.61)

'ایران میں اجنبی' میں آکر رومانی جذباتیت کی آواز دب جاتی ہے۔ راشد نے ایران میں تقریباً دو سال کی مدت گزاری تھی۔ ایران میں قیام نے ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا۔ پھر راشد نے 'ایران میں اجنبی' کی نظموں میں شعور سے کہیں زیادہ اپنے ذاتی تجربے سے کام لیا ہے۔ راشد اچھے یا خراب تجربے کے مابین تمیز نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے تمام تجربات بعینہٖ پیش کردینا چاہتے ہیں۔ جیسے جیسے راشد کے تجربے اور مشاہدے میں اضافہ ہوتا گیا، ان کی آواز میں پختگی اور صلابت آئی ہے۔ زندگی کے گھنے اور گہرے تجربے نے ہی راشد کی رومانوی جذباتیت کی لے مدھم کی ہے۔ راشد کے مفکرانہ جلال کا رشتہ بھی ان کے وسیع مشاہدے سے قائم ہوتا ہے۔ ایران میں اجنبی میں آکر ہم جس سیاسی بصیرت سے آشکار ہوتے ہیں۔ در اصل اسی سیاسی بصیرت نے راشد کو نئے انسان، اس کی لامحدود آرزوؤں اور اس کی زندگی کے مختلف مسائل کی طرف متوجہ کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ لا=انسان تک پہنچ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہی راشد کی اصل منزل تھی اور راشد کو یہاں تک آنا تھا۔ شمیم حنفی نے لا=انسان کے شاعر کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لا=انسان کے شاعر کو اندورن ذات کے راستے کائنات کے رازہائے سربستہ سے آشکار ہونے والا شاعر خیال کرتے ہیں۔ شمیم حنفی بتاتے ہیں کہ راشد کے نئے انسان نے زندگی کے جن پر پیچ ابعاد کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے، اس کا تعلق بذات خود انسان کی اندورن ذات سے قائم ہوتا ہے۔ اور یہ کہ راشد انسانی زندگی میں رونما ہونے والے تمام تجربوں کو ایک ہی واقعہ تصور کرتے ہیں، اسے مختلف ادوار میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ ایک وحدت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ شمیم حنفی کے نزدیک راشد کا زندگی کو اس قدر وسیع تناظر میں دیکھنا آفاق گیر حقیقت سے مربوط ہو جانا ہے۔ شمیم حنفی نے لا=انسان میں راشد کے آفاقی تصور حیات کے حوالے سے لکھا ہے۔

''ان میں نئے انسان کی اس گہری اور غم آلود آرزو مندی کا عکس ملتا ہے جو تمنا کے ژولیدہ تاروں کو پھر سے جوڑنا چاہتی ہے اور ریزہ ریزہ کائنات یا لخت لخت ذات کو پھر سے ایک کل کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہے.... ان میں راشد کا تمام تر ارتکاز وجود کے عین یا مقصد اور امکانات کے بجائے اس کی حقیقت پر ہے اور تلقین یا تنقید سے یکسر بے نیاز ہوکر انھوں نے نئی زندگی اور اس کے مسائل پر آزادانہ نظر ڈالی ہے۔ ان میں انسان کسی قدر کی علامت اور تجرید کے روپ میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی وجود کے ساتھ سامنے آیا ہے..... لا=انسان کی نظموں میں راشد نے ذات کے اثبات کے علاوہ نفی (لا) کے مفہوم تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی رسی کی اس گرہ کو مرکز نظر بنایا ہے جو انسان کا حال یعنی اس کے حقیقی وجود کا منظر نامہ ہے۔ خطیبانہ طرز تکلم کے بجائے ذاتی اظہار سے وابستگی نے ان نظموں میں آہنگ اور معنی کی ثنویت کو ختم کر کے انھیں قائم بالذات اور تجربوں کی حیثیت دے دی ہے۔''
(نئی شعری روایت، شمیم حنفی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2005 ص 62.63)

شمیم حنفی نے لا=انسان میں تمام کائنات کو ایک وحدت کی شکل میں دیکھنے اور انسان کی نئی زندگی کے مسائل کی طرف آزادانہ روش کو جدیدیت کی بنیادی اساس سے تعبیر کیا ہے۔ 'ایران میں اجنبی' کی نظموں میں اس احساس کا عکس مدھم تھا لیکن لا=انسان تک آتے آتے اس کے نقوش اور واضح ہو گئے۔ اب راشد کے جذبے، احساس اور فکر کا تمام تر محور نئے انسان کے مسائل، اس کی نئی زندگی، اس کی ذات کے پر پیچ ابعاد اور اس کے وجود کے اثبات ونفی کا مسئلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شمیم حنفی لا=انسان کی نظموں کو جدیدیت کی نئی اساس کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ راشد کی اسی نئی حقیقت پسندی سے جدیدیت کا خاکہ تیار ہوا ہے۔ اس کا سب سے بین ثبوت تو یہ ہے کہ لا=انسان کی نظموں میں انسان علامتی اور تجریدی پیکر میں نظر آنے کے بجائے اپنے حقیقی وجود کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ شمیم حنفی کا خیال ہے کہ ابولہب اور اس کی دلہن جس کے گلے میں سانپوں کا ہار تھا، اسرافیل کی موت کا اسرافیل، دل مرے صحرانورد کی ریگ اور آگ، زندگی اک پیرہ زن کی بوڑھی اور دیوانہ رو عورت جیسے کردار زندگی کی تخلیق کی تخلیق نو ہیں۔ شمیم حنفی یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر کردار اساطیری رنگ وروغن کے حامل نظر آتے ہیں اور اس طرح اس نوع کے کردار زمان ومکان کے حدود سے نکل کر ایک ابدی معنویت حاصل کر لیتے ہیں۔

شمیم حنفی نے ایک وسیع تناظر میں راشد کے پورے ارتقائی سفر کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح راشد کے فکری، جذباتی، حسی اور مشاہداتی ارتقا کا پورا منظر نامہ نظر آتا ہے۔

■

Saquib Faridi
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

عالیہ بیگم

احتجاجی فکر اور ن م راشد

ن م راشد اردو شاعری کی تاریخ میں آزاد نظم کے خالق کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔ بقول آغا ظفر حسنین ''انھوں نے اردو میں رائج پابند شاعری سے انحراف کرتے ہوئے آزاد نظم کو متعارف کرایا۔''

(ڈاکٹر آغا ظفر حسنین: مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2006، ص126)

وہ ایک انقلابی ہی نہیں بلکہ باغی شاعر کی حیثیت سے ہمارے ادب کا حصہ ہیں۔ ان کے فکر وطبع میں احتجاجی روش عہد طفلی سے ہی رونما ہونے لگی تھی۔ جس کا ثبوت ان کی پہلی نظم 'انسپکٹر آف مکھیاں' ہے جو انھوں نے ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران انسپکٹر آف اسکول کو ہدف تنقید بناتے ہوئے تخلیق کی اور اپنے شدید رویے کا برملا اظہار کیا۔

راشد کی نظمیں محض ذاتی اظہار کی پابند نہیں ہیں بلکہ وہ ہر قسم کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ انھوں نے لسانی اور موضوعاتی سطح پر کسی قسم کی غیر ضروری پابندیاں نہیں برتی، البتہ جلد ہی وہ ماورا کی افسوں سازی سے باہر آ گئے۔ بہر حال انھیں رجعت پسند شاعر کہا گیا کیونکہ وہ کمیونزم کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ ان کے شعری مجموعے 'ایران میں اجنبی' میں متعدد ایسی نظمیں موجود ہیں جو کمیونزم کے خلاف لکھی گئیں، لیکن 1947 میں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران کمیونسٹوں کے رویے نے انھیں بے حد متاثر کیا جس کے باعث انھوں نے اس پارٹی میں داخل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بہر حال راشد اپنے معاصرین شعرا میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا یوں رقمطراز ہیں:

''جدید اردو نظم میں راشد کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے، اور اگر لحظہ بھر کے لیے راشد کی نظم کو اردو ادب سے خارج کر دیا جائے تو جدید اردو نظم مفلس اور بے آبرو نظر آئے گی۔''

(ن م راشد ایک مطالعہ: مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وزیر آغا: مضمون؛ ن م راشد، مکتبہ اسلوب، کراچی، 1986، اشاعت اول، ص185)

علامتی طرز انداز نے انھیں علامتی شاعری کے میدان میں نقش اول کا مقام عطا کیا۔ ان کا وصف خاص یہ ہے کہ انھوں نے ناامیدی و مایوسی کے بجائے تمثیلی لب و لہجے میں غم واندوہ جذبات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا

وہ ایک انقلابی ہی نہیں بلکہ باغی شاعر کی حیثیت سے ہمارے ادب کا حصہ ہیں۔ ان کے فکر و طبع میں احتجاجی روش عہد طفلی سے ہی رونما ہونے لگی تھی۔ جس کا ثبوت ان کی پہلی نظم 'انسپکٹر آف مکھیاں' ہے جو انھوں نے ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران انسپکٹر آف اسکول کو ہدف تنقید بناتے ہوئے تخلیق کی اور اپنے شدیدرویے کا برملا اظہار کیا۔

اور بے حس و شکست خوردہ معاشرے کو علامتی انداز میں پیش کر کے اپنے احتجاجی جذبات کا برملا اظہار کیا۔ مثال کے طور پر ان کی بہترین علامتی نظم 'اندھا کباڑی' خصوصی توجہ کی حامل ہے۔ اس میں انھوں نے ایک ایسے منہزم اور پسپا معاشرے کا بیان کیا ہے، جہاں کسی کے درون قلب میں خواب دیکھنے کی سکت موجود نہیں ہے۔ مثلاً

''خواب لے لو خواب...''
صبح ہوتے چوک میں جا کر لگاتا ہوں صدا
''خواب اصلی ہیں کہ نقلی؟''
یوں پرکھتے ہیں کہ جیسے ان سے بڑھ کر
خواب داں کوئی نہ ہو!

شام ہو جاتی ہے
میں پھر سے لگاتا ہوں صدا...
'مفت لے لو مفت، یہ سونے کے خواب...''
'مفت' سن کر اور ڈر جاتے ہیں لوگ
اور چپکے سے سرک جاتے ہیں لوگ
دیکھنا، یہ 'مفت' کہتا ہے
کوئی دھوکا نہ ہو؟
ایسا کوئی شعبدہ پنہاں نہ ہو؟
گھر پہنچ کر ٹوٹ جائیں
یا پگھل جائیں یہ خواب؟
بھک سے اڑ جائیں کہیں
یا ہم پہ کوئی سحر کر ڈالیں یہ خواب

جی نہیں کس کام کے؟
ایسے کباڑی کے یہ خواب
ایسے نابینا کباڑی کے یہ خواب!''

(اندھا کباڑی: گمان کا ممکن، کلیاتِ راشد: ن م راشد، کتابی دنیا، دہلی، 2004، ص 97-496)

دراصل یہ معاشرہ نہ تو خود خواب دیکھنے کی استطاعت رکھتا ہے اور نہ ہی دوسرے کے خواب کو خریدنے کا حوصلہ۔ حتیٰ کہ مفت کا خواب بھی اسے موافق طبع نہیں لگتا۔ اس طرح خواہش مرگ لیے وہ معاشرے میں زندگی بسر کرتا رہتا ہے۔ بقول کوثر مظہری:

''یہ خواب درحقیقت معاشرے کی اعلیٰ قدریں ہیں جو تہذیب و ثقافت کا حصہ ہیں۔ ایک 'اندھا کباڑی' جو بظاہر دیکھ نہیں سکتا لیکن اس کی باطنی بصیرت محفوظ ہے، اور اس پوری بستی (معاشرے) میں وہی خواب دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' اس طرح زندگی کے اعلیٰ اقدار جو ہماری تہذیب و ثقافت کا لازمی جزو ہیں، اس شکست خوردہ اور پست ہمتی معاشرہ میں وہ اندھا کباڑی ہی درحقیقت ان اقدار اور انسانی جذبات و احساسات کا پاسدار معلوم ہوتا ہے۔ ''پورا معاشرہ زندگی کی بے معنویت اور شعور کی بے سمتی کا شکار ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معاشرے کو سانپ سونگھ گیا ہو اور سب کے سب خائف و ہراساں ہوں۔ یہ نظم زوال آمادگی اور انحطاط کی بدترین تصویر پیش کرتی ہے۔''

(کوثر مظہری: جدید نظم: حالی سے میراجی تک ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، مئی 2008، ص 371)

راشد کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی مذہبی بیزاری اور الحادی مزاج کا شدید احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے ایسی بے شمار نظمیں تخلیق کی جن میں خدا کی قدرت و اختیارات پر سوال قائم کیے گئے ہیں۔ اس مذہبی بیزاری کی سب سے بڑی وجہ راشد کا یہ خیال تھا کہ ذات خداوندی کے ہوتے ہوئے بھی اہل اقتدار طبقہ استحصال اور ناہمواری کے ذریعے اختیارات حاصل کیے جا رہا ہے۔ وہ مذہبی معاملات میں لاادریت کے مسلک کے قائل تھے۔

راشد نے مغربی بالادستی کا تذکرہ کرتے ہوئے تمام ایشیا کو اس کا اسیر بتایا۔ حکومت برطانیہ سے آزادی حاصل کر لینے کے بعد بھی ہندوستان میں انگریزی حکومت کے واضح اثرات نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے تمام ایشیا کی ذہنی و نفسیاتی اذیتیں بیان کرنے کی شعوری کوشش کی اور مشرق و مغرب کے سیاسی و تہذیبی تصادم سے پیدا ہونے والی جذباتی و فکری دشواری اور گنجلک پن کی مکمل غمازی کی۔

راشد کو ایران میں بھی وہی فرسودگی و بدحالی نظر آئی جو ہندوستان میں محسوس ہوتی رہی تھی۔ اہل ہند کی مانند اہل ایران بھی انگریزوں کے سیاسی و اقتصادی تشدد اور جبر آمیز رویے سے قہر آلود تھے۔ انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ حکومت برطانیہ اور مغربی تہذیب اہل مشرق کو اپنے تصرف میں لے کر ان کے فکر و خیالات پر قبضہ آوری کرنے کی پرزور کوشش کر رہی۔ جو ان کے سیاسی اقدار، تہذیبی پہلو اور معاشی پامالی کی وجہ بن رہے تھے۔ لہٰذا انھوں نے نظم 'من و سلویٰ' کی تخلیق کے ذریعے ایرانی عوام کو ان کے اعلیٰ اقدار کا احساس دلانے کی شعوری کوشش کی۔

یہ سنگدل، اپنی بزدلی سے
فرنگیوں کی محبت ناروا کی زنجیر میں بندھے ہیں
انھی کے دم سے یہ شہر ابلتا ہوا سا ناسور بن گیا ہے۔
محبت ناروا نہیں ہے،
بس ایک زنجیر،
ایک ہی آہنی کمند عظیم
پھیلی ہوئی ہے،
مشرق کے اک کنارے سے دوسرے تک،
مرے وطن سے ترے وطن تک،
بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں!

(من و سلویٰ: ایران میں اجنبی، کلیات راشد: ن م راشد، کتابی دنیا، دہلی، 2004، ص 92-191)

راشد کی شاعری میں احتجاجی و مدافعتی ردعمل کی سب سے بڑی وجہ ہندوستان کی تحریک آزادی اور دوسری جنگ عظیم کے تشویشناک حالات تھے۔ وہ قومی و بین الاقوامی انتشار و بدنظمی اور شکست و ریخت کے حالات سے یکساں متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں نظام ملوکیت کی مخالفت و خصلت کے جذبات و احساسات کا اظہار جابجا نظر آتا ہے۔'' آپ راشد کی ان نظموں کو دیکھیے جن کا تعلق راشد کی ذات اور سامراج سے ہے۔ راشد کی ان نظموں میں جنگ دو مورچوں پر لڑی جاتی ہے۔ ایک تو سامراج کے خلاف، اور دوسرا اپنی ذات کے خلاف... دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جب ملک میں آزادی کی جد و جہد جاری تھی تو راشد برطانوی فوج میں ملازم تھا اور فوج کے ایک افسر ہی کی حیثیت سے ہندوستانی دستے کے ساتھ ایران گیا تھا۔ جنگ آزادی کا سرفروش سپاہی بننے کے بجائے وہ سامراج کا ایک ادنیٰ سپاہی بن گیا.... راشد کے لیے یہ کشمکش ناقابل برداشت حد تک پہنچ جاتی ہے اور یہ احساس اسے بھلائے نہیں بھولتا.... غلامی بہرحال راشد کو ورثہ میں ملی تھی۔''

(ن م راشد ایک مطالعہ: مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وزیر آغا مضمون ن م راشد کی شاعری، مکتبہ اسلوب، کراچی 1986، ص 46-145)

جس کا ذکر انھوں نے اپنی شاعری میں بخوبی کیا۔ ان کے دل میں دشمنان ملک سے مقابلہ کرنے کی حسرت امڈتی رہتی تھی۔ اس کی بہترین مثال نظم 'سپاہی' کے مذکورہ اشعار ہیں۔

عمر گزری ہے غلامی میں مری
جس سے اب تک مری پرواز میں کوتاہی ہے!
زمزمے اپنی محبت کے نہ چھیڑ
اس سے اے جان پر و بال میں آتا ہے جمود
میں نہ جاؤں گا تو دشمن کو شکست
آسمانوں سے بھلا آئے گی؟
دیکھ خونخوار درندوں کے وہ غول
میرے محبوب وطن کو یہ نگل جائیں گے؟
ان سے ٹکرانے بھی دے
جنگ آزادی میں کام آنے بھی دے

(سپاہی: ماورا، کلیات راشد: ن م راشد، کتابی دنیا، دہلی، 2004، ص 79)

اس نظم میں راشد نے میدان کارزار میں دشمنان ملک سے متصادم و مقابل ہونے کا جذبہ ایک سپاہی کی زبان سے بیان کیا۔ علاوہ ازیں جذبۂ حب الوطنی کا باہمی اظہار اور غیر ملکی فرمانرواؤں کے ظلم و بربریت کے خلاف شدید باغیانہ روش کا اظہار ان کی احتجاجی فکر کی نظیر ہے۔ ان کا معاشرتی شعور ترقی پسند شعرا سے قدرے مختلف بلکہ بعض صورت میں مزید بلیغ، آزمودہ کار اور بالاستقلال تھا۔ تاہم 'ایران میں اجنبی' اپنی پوری دانائی و فہمیدگی کے ساتھ ترقی پسند نظریہ فکر کی حامل کہی جا سکتی ہے۔ زبان و بیان، طرز تحریر، جدید محاورے کے استعمال اور انفرادی خصوصیات کی بنیاد پر راشد اپنے معاصرین میں منفرد و ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کا لہجہ اور انداز مزید سخت اور خطیبانہ رہا ہے۔ مثلاً

زندگی تیرے لیے بستر سنجاب و سمور
اور میرے لیے افرنگ کی دریوزہ گری
عافیت کوشیٔ آبا کے طفیل،
میں ہوں درماندہ و بے چارہ ادیب
خستۂ فکر معاش!
پارۂ نان جویں کے لیے محتاج ہیں ہم

معاشرتی نظام اور عوامی رنج و آلام کو اپنی شاعری کا

موضوع بنایا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں معاشرتی و اقتصادی مسائل سے لگاؤ تھا۔ نظم ’دریچے کے قریب‘ میں ان کے انقلابی رویے کی کارفرمائی بخوبی نظر آتی ہے۔

اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملّائے حزیں
ایک عفریت.....اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کی مانند رواں!

☆☆☆

ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں!

☆☆☆

میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شب عیش گزر جانے پر
بہرِ جمعِ خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
چرخِ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں

(دریچے کے قریب: ماورا، کلیات راشد: ن م راشد، کتابی دنیا، دہلی، 2004، ص 97-99)

یہاں ظلم برداشت کرنے والوں کی کمزوریاں اور پست ہمتی کا تذکرہ کرتے ہوئے راشد نے اپنی بے ثباتی و کم ہمتی کا بھی بیان کیا ہے۔ عوام کی مانند ان کے درون قلب میں بھی وہ عزم و استطاعت نہیں ہے جو جبر و ظلم کے خلاف آوازِ حق بلند کر سکے۔ وہ بھی شب و روز دوسرے لوگوں کی مانند مسجد کی میناروں کو دیکھتے رہتے ہیں لیکن کچھ کرنے کی تاب و توانائی نہیں لا پاتے۔

راشد کی شاعری مغربی فکر و نظریات سے مغلوب نظر آتی ہے حالانکہ انھوں نے مشرقی افکار و نظریات سے مکمل روپوشی نہیں کی۔ ان کی شاعری میں جو مشرق نمودار ہوا وہ محض سیاسی بیداری اور مادی برکتوں کے تصور پر مبنی ہے۔ ورنہ انھوں نے مشرقی روایت و روحانی قدروں کے تعلق سے باغیانہ روش اختیار کرتے ہوئے مشرقی روایت و ماضی کی عظیم وراثت کو پا بجولاں قرار دیا۔ بقول وارث علوی ’’راشد مشرق کی روحانی قدروں کا ثناخواں نہیں بلکہ مادی برکتوں اور انسان کی آزادی کے لیے تصورات کا نوحہ گر ہے۔ راشد کو مغرب کی مادی ترقی اور انسانی آزادی کے تصورات پر کشش معلوم ہوتے ہیں۔‘‘

(ن م راشد ایک مطالعہ: مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، وارث علوی: مضمون: ن م راشد کی شاعری، مکتبہ اسلوب، کراچی، 1986، ص 152)

تاہم مشرقی روایت اور ماضی پرستی کے خلاف انھوں نے باغیانہ روش اختیار کی۔ ’’راشد کی نظر میں آج کے انسان کے لیے ماضی ایک بند کتاب کی مانند ہے۔ راشد محسوس کرتا ہے کہ ماضی کی جانب مڑ کر دیکھنے والا تو کہانی کے شہزادے کی طرح پتھر بن جاتا ہے۔ نئے انسان کی جولاں گاہیں میدان کے کھنڈروں میں نہیں بلکہ نئی بستیوں کی تلاش کرنی چاہئیں۔

مگر اب ہمارے نئے خواب کابوسِ ماضی نہیں
ہمارے نئے خواب ہیں آدمِ نو کے خواب
جہانِ تگ و دو کے خواب
جہانِ تک و مدائن نہیں
یہ اس آدمِ نو کا ماویٰ نہیں
نئی بستیاں اور نئے شہریار
تماشہ گہِ لالہ زار

بہرحال راشد ماضی پرستی کے شدید مخالف رہے کیونکہ ماضی پرستی و روایت پرستی کے باعث نئی دنیا کی تعمیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کے خلاف شدید احتجاجی عمل کا مظاہرہ کیا۔ ’’راشد کے یہاں ماضی کے خلاف جو اتنا شدید ردِعمل ملتا ہے۔ اس کا سبب ایک تو مشرقی مزاج کی ماضی پرستی اور روایت پرستی ہے اور دوسرا ہند و پاک کی وہ احیائی تحریکیں ہیں جو انسان کے نئی دنیا کی تعمیر کے حوصلوں کو کچل کے رکھ دیتی ہیں۔ راشد کی نظم ’سومنات‘ اس احیاپسندی کے خلاف شدید ردِعمل ہے۔‘‘

(ن م راشد ایک مطالعہ: مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، وارث علوی: مضمون: ن م راشد کی شاعری، مکتبہ اسلوب، کراچی، 1986، ص 154)

اردو شاعری کی روایت میں شب، ظلم و تاریکی اور روز، روشنی و فرحت کے طور پر مستعمل رہا ہے لیکن راشد نے شب و روز کا تجزیہ استدلالی انداز میں کیا۔ تاہم ان کے یہاں قدیم روایاتی اقدار رونما ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں عجمی آہنگ کا اشتراک ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری عربی ثقافت و تمدن، صحرائی اور مشرقی تہذیبی روایات کے عناصر کا احاطہ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر نظم ’ریت‘ جس میں انھوں نے عصری تہذیب کی فریب کاری اور عریانی پر شدید تنقید کرتے ہوئے منفرد انداز میں نایاب تجزیہ کیا۔ اس نظم میں پر خاموش صحرا کی دلکش منظر سازی کرتے ہوئے پانی اور گھاس کو دور سے دیکھنے پر نخلستان کی مانند بتایا اور اس صحرا میں گرسنگی و تشنگی سے بے اختیار ایک پرندہ اور ایک صحرانورد مسافر کی نغمہ سرائی کی۔ یہ تمام مناظر دراصل صحرا میں سسکتی حیات کی رمق کے غماز ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار قابل ذکر ہیں۔

تسلسل کے صحرا میں
ایک ریت کے ٹیلے کی آہستہ آہستہ لرزش
کسی گھاس کے نامکمل جزیرے میں اک جاں بلب
طائرِ شب کی لرزش
کسی راہ بھٹکے عرب کی سحرگاہ حمد و ثنا
تسلسل کے بے اعتنارات، دن میں تغیر کا
تنہا نشاں..... محبت کا تنہا نشاں!

(تسلسل کے صحرا میں: لا انسان، کلیات راشد: ن م راشد، کتابی دنیا، دہلی، 2004، ص 359-60)

یہاں شاعر نے خشک درخت کو ماضی کے معنی میں بیان کر کے خشک شجر سے روشن ہونے والے شعلۂ آتش کو مثل رہنما قرار دیا۔ حالانکہ راشد ماضی پرست نہیں تھے لیکن ان کے لاشعور میں ماضی کی تہذیبی قدریں منقوش تھی جن سے وہ عقب گزاری نہ کر سکے۔

اس طرح ’’ن م راشد ایک باشعور فنکار تھے۔ اپنے خیالات و محسوسات کو موزوں ترین لفظوں میں اپنے قارئین تک پہنچانے کے لیے اپنی نظموں میں محنت و کاوش کے ساتھ تبدیلیاں کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف ان کا فن آخری وقت تک آگے بڑھتا رہا اور دوسری طرف ان کی نظمیں ابلاغ، ساخت اور اظہار کے اعتبار سے بہتر ہوتی چلی گئیں۔‘‘

(ن م راشد: ایک مطالعہ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، مضمون: راشد کی چند نظموں کی ابتدائی صورتیں: جمیل جالبی، مکتبہ اسلوب، کراچی، 1986، اشاعت اول، ص 220)

بہرحال راشد کی شاعری اپنے عہد و ماحول کے سیاسی و معاشی بحران، معاشرتی قباحت و بے ترتیبی، انسانی و تہذیبی اعلیٰ اقدار کی پامالی، قومی و ملی انحطاط اور نوع انسان کی شکست و ریخت اور فرد کی آزادی کا رزمیہ ہیں ’’جس میں تغزل کا رنگ بھی ہے اور شاہنامہ فردوسی اور الیڈ کا عکس لطیف۔‘‘

(کوثر مظہری: جدید نظم: حالی سے میرا جی تک ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، مئی 2008، ص 375)

■

Aliya Begum
Research Scholar, Dept of Urdu
University of Allahabad
Allahabad
Mob.: 7706040760
aliyashaikh380@gmail.com

اصغر عباس

عشق کا نام جس سے روشن تھا

معیدالرحمن

معتبر محقق، ممتاز سرسید شناس، سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پروفیسر اصغر عباس صاحب کا 7 ستمبر 2022 کو اپولو اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ انا للّٰہِ وانا الیہ راجعون۔

پروفیسر اصغر عباس صاحب فکر سرسید کے امین، سید والا گہر کے عاشق صادق، بے حد نستعلیق اور اعلیٰ اقدار حیات سے مزین تھے، صارفیت اور مادیت کے اس دور میں خود تشہیری کے بجائے علمی خلوص اور انہماک کے ساتھ تحقیق و تصنیف میں مشغول رہتے تھے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ ہر شخص ہر موضوع پر اپنے تبحر علمی کا دعویدار ہو، اصغر عباس صاحب جیسی شخصیت کو خاطر خواہ مقام کا نہ ملنا قابل افسوس ہے۔

پروفیسر اصغر عباس صاحب فکر سرسید کے امین، سید والا گہر کے عاشق صادق، بے حد نستعلیق اور اعلیٰ اقدار حیات سے مزین تھے، صارفیت اور مادیت کے اس دور میں خود تشہیری کے بجائے علمی خلوص اور انہماک کے ساتھ تحقیق و تصنیف میں مشغول رہتے تھے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ ہر شخص ہر موضوع پر اپنے تبحر علمی کا دعویدار ہو، اصغر عباس صاحب جیسی شخصیت کو خاطرخواہ مقام کا نہ ملنا قابل افسوس نہیں ہے۔

پروفیسر اصغر عباس 9/اکتوبر 1941 کو اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک مردم خیز گاؤں بی بی پور میں پیدا ہوئے۔ جارج اسلامیہ کالج گورکھپور سے ثانوی درجات کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے بی اے اور ایم اے کی اسناد گورکھپور یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو زبان پر پیمبری وقت آن پڑا تھا۔ اس زبان پر تقسیم کی مار سب سے زیادہ پڑی تھی۔ اس وقت اردو زبان وادب کو ایک مضمون کے طور پر اختیار کرنا دیوانگی سے کم نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ آپ نے 1966 میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ معروف نقاد اور دانشور پروفیسر آل احمد سرور آپ کے نگراں مقرر کیے گئے۔ اس زمانے کے شعبۂ اردو میں نابغہ روزگار اساتذہ تھے۔ ایسے اساتذہ کی ایک بڑی تعداد تھی جو اردو زبان وادب کی تاریخ میں عہد آفریں اور رجحان ساز الفاظ سے یاد کیے جاتے ہیں۔ معین احسن جذبی، خورشید الاسلام اور نسیم قریشی وغیرہ شعبے کے سینئر اساتذہ میں شمار کیے جاتے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر محمد عزیر، خواجہ مسعود علی ذوقی، مجنوں گورکھپوری جیسے صاحب علم وفضل سے شعبۂ اردو مرکز علم وفن بنا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شعبے میں ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر سی ایم نعیم، شہریار اور ڈاکٹر مسعود عالم اس کاروان علم وفضل میں نئے نئے شامل ہونے والوں میں تھے۔ اصغر عباس صاحب کا تقرر شعبۂ اردو میں عارضی لکچرر کی حیثیت سے 1969 میں ہوا۔ 1976 میں آپ کی ملازمت مستقل ہوگئی اور آپ 2002 میں شعبۂ اردو سے چیئرمین کے عہدے سے سبک دوش ہوگئے۔

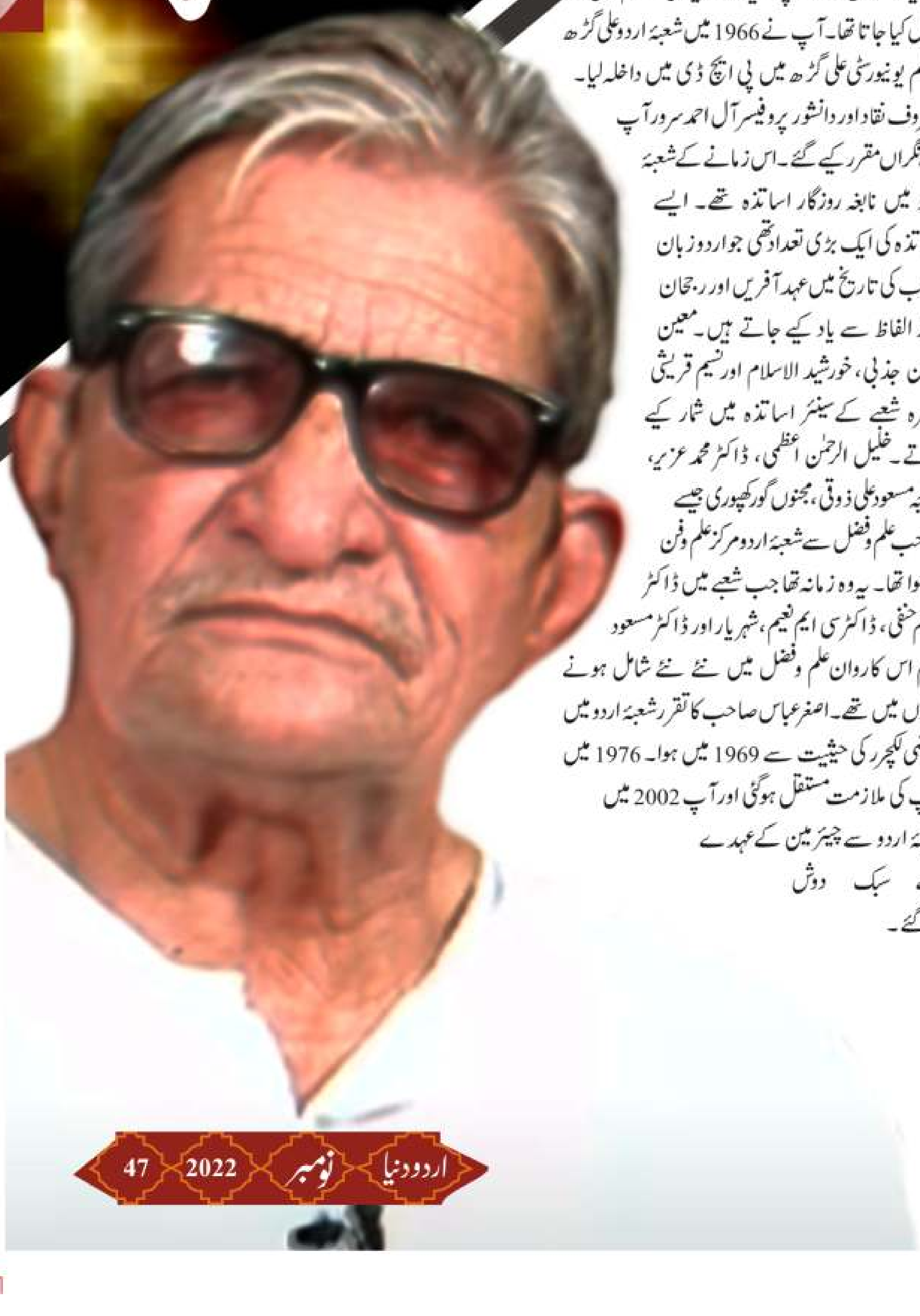

اصغرعباس صاحب کے علمی اکتسابات کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے 1857 کے رستخیز حالات سے پیداشدہ سرسید اور ان کے انقلاب آفریں تصورات کو اپنے مطالعے کا مرکز و محور بنایا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خاص طور پر اور بلالحاظ مسلک وملت ہندوستانی عوام کے لیے عام طور پر 1857 کے حالات ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ فیصلہ کن گھڑی تھی جب مغلیہ سلطنت کے باقی ماندہ آثار ختم ہو رہے تھے اور مغربی تہذیب طرز نو کی بنیاد ڈال رہی تھی۔ دونوں تہذیبوں کے مابین بعد المشرقین تھا۔ ایسے پرآشوب دور میں سرسید اپنی عبقریت، دوراندیشی اور بصیرت سے دونوں تہذیبوں کے مابین وحدت اور یگانگت کے پل کی تعمیر میں مصروف تھے۔ پروفیسر اصغرعباس کا سرسید اور ان کے علمی کارناموں کو موضوع بنانے کا مقصود ان مضمرات اور ارتعاشات کو گرفت میں لینا تھا جس کے نتیجے میں سرسید اور ان کے افکار کی تشکیل ہوئی تھی۔ برصغیر کی انیسویں اور بیسویں صدی کی فکری تاریخ اور سیاسی سماجی اتھل پتھل مذہبی اور تہذیبی اتار چڑھاؤ کی تفہیم مطلوب ہو تو سرسید کو سمجھے بغیر یہ ناممکن ہے۔ اصغرعباس کا سرسید سے تعارف بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں سرسید سے دلچسپی کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ''غالبًا ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا، جب میں نے سرسید کے دو مضامین خوشامد اور بحث و تکرار پڑھے۔ دونوں مجھے پسند آئے۔ سن شعور کی منزلیں طے کرتے ہوئے سرسید سے شیفتگی بڑھتی گئی۔''

(مطبوعہ، اردو دنیا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دسمبر 2015)

سرسید اور ان کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی تصورات کے مطالعے کا آغاز یوں تو مغرب اور برصغیر میں انیسویں صدی کے اواخر میں ہو چکا تھا۔ جی ایف آئی گراہم کی کتاب The life and work of Sir Syed Ahmad Khan (1885) اور خواجہ الطاف حسین حالی کی معرکہ آرا تصنیف حیاتِ جاوید (1901) سے سرسید شناسی کو ایک اہم علمی موضوع کے طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا۔ سرسید کی حیات و خدمات پر جتنی تصنیفیں منظر عام پر آئیں وہ سب قومی اور وطنی جذبے کے تحت تحریر کی گئیں۔ بیسویں صدی کے وسط تک مطالعات سرسید کا زور بڑھ گیا۔ اس کے پس پردہ متعدد تہذیبی سماجی اور سیاسی محرکات کارفرما تھے۔ تقسیم کا جب سانحہ پیش آیا تو ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں سرسید کے مطالعات میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اضافہ ضرور ہوا، لیکن ایک مسئلہ یہ پیش آیا کہ دونوں ممالک کے مصنّفین نے سرسید اور افکار سرسیّد کو اپنی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی ضرورتوں کے تحت پڑھنا شروع کیا۔ انھیں اپنے اپنے سانچوں میں ڈھالنا شروع کیا۔ غرض کہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ مختار مسعود جیسے دانشور کو یہ کہنا پڑ گیا کہ سرسید کا معروضی مطالعہ ہندوستان اور پاکستان میں ناممکن ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی جامعات میں بطور خاص اسکالروں کے لیے سرسید اور افکار سرسید ایک اہم موضوع بن گئے۔ سرسید کو تاریخ، سیاسیات، دینیات، صحافت اور ادب کے اسکالروں نے اختصاص کے ساتھ موضوع تحقیق بنایا۔

مطالعات سرسید کے ضمن میں ایک اہم نام پروفیسر اصغرعباس کا ہے۔ پروفیسر اصغرعباس کو دیگر ماہرین سرسید میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سب سے پہلے انھوں نے سرسید کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا۔ انھیں یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی علمی جستجو کو سرسید اور علی گڑھ تحریک کے لیے مخصوص کرلیا۔

سرسید شناسی کے سلسلے میں پروفیسر اصغرعباس صاحب کو ایک معتبر حوالہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اصغرعباس صاحب نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو اپنے تحقیقی و تنقیدی مطالعے کے لیے منتخب کیا تو گزٹ کی تمام فائلوں کا انھوں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اس تحقیقی سفر میں انھیں یہ احساس ہوا کہ سرسید کی اصلاحی اور انقلابی سرگرمیوں کا مرکز سائنٹفک سوسائٹی ہے اور ان کے بصیرت افروز اور عہد آفریں تصورات کا ترجمان انسٹی ٹیوٹ گزٹ ہے۔ اصغرعباس صاحب اپنی کتاب سرسید کی صحافت کے مقدمے میں تحریر کرتے ہیں:

''سرسید کے مصلحانہ کارناموں کا نقطہ ماسکہ سائنٹفک سوسائٹی ہے...... انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں یہ ادارہ اردو کی تہذیبی مطبوعات کا گہوارہ بن گیا تھا۔ اسی لیے جدید اردو نثر کی ترویج میں اس سوسائٹی کا اساسی کردار ہے۔ مزے کی بات ہے کہ 1857 کی چیرہ دستیوں کو بھلانے اور اپنی نیک نیتی کا ثبوت پیش کرنے کے لیے انگریزوں نے بھی سوسائٹی کے کاروبار میں گہری دلچسپی لی۔ اسی سوسائٹی سے اردو صحافت کا مہر درخشاں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی طلوع ہوا، جس کی روشنی کلکتہ سے پشاور تک پھیل گئی۔ سائنٹفک سوسائٹی کی مطبوعات اور اس کی روئیداد سے بعض نئے پہلو سامنے آئے جو ابھی تک تاریکی میں تھے۔'' (ص8)

اصغرعباس صاحب کا تحقیقی مقالہ سرسید کی صحافت کے عنوان سے انجمن ترقی اردو ہند سے پہلی بار 1975 میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن ہند و پاک سے شائع ہو کر علمی حلقوں میں مستند حوالہ بن چکے ہیں۔ مصنف کا یہ جذبۂ تحقیق قابل تحسین ہے کہ ہر ایڈیشن پر مصنف کے قلم سے ضمیمے اور کچھ اضافے شامل ہیں۔ پانچویں ایڈیشن میں متعدد ضمیموں کا اضافہ ہے۔ اس کتاب کا انگریزی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ سید عاصم علی نے پرنٹ کلچر کے عنوان سے 2015 میں پرائمس بک دہلی سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں سرسید کی صحافت سے قبل اردو صحافت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کی علمی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ سوسائٹی کے ترجمان علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی تاریخی تفصیلات، اس کے مدیران، اداریوں اور قلمی معاونین کا سیر حاصل احاطہ کیا گیا ہے۔ مشرق و مغرب کے ان اخبارات کی نشان دہی بھی کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، جہاں سے ملکی اور بین الاقوامی خبریں حاصل کی جاتی تھیں۔ اس مقالے میں معاصر صحافت پر انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اثرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مقالے کی تیاری میں بنیادی مآخذ سے استفادے کو ترجیح دی گئی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے براہ راست کسب فیض کیا گیا ہے۔

اصغرعباس صاحب سرسید کے اصلاحی سفر میں سائنٹفک سوسائٹی اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو سنگ میل سمجھتے تھے اور ان کے زرخیز اور درّاک ذہن کا اہم مظہر سمجھتے تھے۔ اصغر صاحب قاموسی مزاج کے حامل تھے۔ انھوں نے سوسائٹی اور گزٹ کے مختلف گوشوں کو اپنے تفصیلی مطالعے کا موضوع بنایا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید اپنے رفقا اور معاصرین پر تعزیتی تحریریں لکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ ان تمام تحریروں کو سرسید کی تعزیتی تحریریں کے عنوان سے یکجا کردیا، جو کتابی شکل میں 1989 میں منظر عام پر آئی۔ مرتب اپنے مقدمے میں ان تحریروں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں......

''وہ اپنے حافظے کی قیمتی یادداشت کو تاثرات کی شکل میں اس طرح پیش کرتے کہ اس کی سیرت کے اہم خطوط اور اس کی شخصیت کے نمایاں اکتسابات، اس کی وضع قطع اور عادات و اطوار کی ایک جھلک ہمارے سامنے آجاتی۔ (ص8)

سرسید نے اپنے معاصرین، دوستوں اور اپنے سے متضاد خیال کے حامل علما پر تعزیتی تحریریں لکھیں۔ اس میں صرف مشہور و معروف شخصیات ہی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ ایسی شخصیات بھی سرسید کے موئے قلم سے تاریخ کا حصہ بن گئیں جو علی گڑھ تحریک سے کسی درجہ میں منسلک تھیں۔

آپ نے اتر پردیش اردو اکادمی کے ایما پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مضامین کا انتخاب شائع کیا، جو 1982 میں شائع ہوا۔ اس میں متعدد اہم مضامین ہیں۔ محمد حسین آزاد کی کتاب آبِ حیات پر تبصرہ ہے۔ سید یحییٰ قرطبی کے اس عربی مرثیہ کا ترجمہ شامل ہے، جو سرسید نے مصائب اندلس کے عنوان سے کیا ہے۔ یہی وہ مرثیہ ہے جسے دیکھ کر سرسید نے حالی سے مسدس لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اصغر صاحب کی کتاب 'سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی' سرسید کے کارنامہ ہائے گراں مایہ کو یکجا کرنے اور انھیں نئی نسل کے سامنے پیش کرنے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب 2014 میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں سائنٹفک سوسائٹی کی تمام روداد کو محفوظ کردیا گیا ہے۔ مرتب کتاب تحریر کرتے ہیں: ''یہ روئدادوں کا مجموعہ نہیں گلدستہ دانش ہے۔ اس سے انیسویں صدی کے سماجی اور دانشورانہ رویوں کو پرکھنے تخلیق اور بیداری کے ایک متحرک دور کا اندازہ کرنے نیز سرسید اور ان کے ہم نواؤں کے اضطراب، بے چینی اور تدبر کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔'' (ص 8-7)

مرتب نے مقدمہ میں سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد، ترجمہ شدہ کتابوں اور دیگر علمی سرگرمیوں اور عزائم کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی محض ترجمہ کا ادارہ نہیں تھا بلکہ فکر و ذہن میں تحرک اور زرخیزی پیدا کرنے کی منظم تحریک تھی۔ اس سوسائٹی کے تحت جن اہم مشرقی اور مغربی کتابوں کے ترجمے ہوئے ان سے اردو ادب و تہذیب متمول ہوگئی۔ سماجیات، معاشیات، سائنس اور متعدد اہم علوم وفنون کے ترجمے ہوئے۔ اردو شعروادب، اردو لغت سازی، اردو علم صرف ونحو کے ضمن میں سرسید کی خدمات اور ان کے عزائم کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جملہ علمی سرگرمیوں میں سے ایک اہم، مفید موضوعات پر توسیعی خطبات کا انعقاد، مندوبین اور ان کے عنوانات نیز خطبہ دینے والے ماہرین کے نام تحریر کیے گئے ہیں۔ خاص طور پر علم زراعت پر کتابوں کی فراہمی، اس سے متعلق مفید آلات کی جمع آوری اور تجربہ گاہ کے قیام کی کوششوں کو اوّلیات سرسید میں شمار کیا گیا ہے۔ مقدمے میں ان نابغوں کا بھی ذکر ہے جو سوسائٹی سے وابستہ تھے۔ ممتاز مستشرق گارساں دتاسی، انڈین نیشنل کانگریس کے مؤسس اے او ہیوم، جدید ہندی نثر کے معمار بھارتیندو بابو ہریش چندر، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین احمد نیر درخشاں، منشی نول کشور کے اسما مذکور ہیں۔ یہ کتاب سائنٹفک سوسائٹی کی مستند تاریخ معلوم ہوتی ہے۔

اس میں بنیادی ماٰخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ آرکائیوز اور لائبریریوں میں موجود اس عہد کے اخبارات اور رسائل سے مواد جمع کرنے کا بھی التزام کیا گیا ہے۔ مرتب کے مطابق: اس تاریخ کی ساری شہادتیں، علی گڑھ آرکائیوز، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، کریمیہ لائبریری بمبئی، برٹش لائبریری لندن، رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن، بوڈلین لائبریری آکسفور یونیورسٹی، کیمبرج اور اڈنبرا یونیورسٹیوں کے کتب خانوں سے چنی گئی ہیں۔ (ص 7)

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا سرسید کی اصلاحی کوششوں کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ اخبار دو زبانوں انگریزی اور اردو میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں ہندوستانی باشندوں کی سیاسی، سماجی، تعلیمی، تہذیبی اور مذہبی ضروریات کے تحت سرسید مضامین لکھنے کا التزام کرتے تھے۔ ان مضامین میں سرسید کی فکری بصیرت کا بہ تمام وکمال اظہار ہوا ہے۔ فکر سرسید کی تفہیم کی کوئی کوشش گزٹ کے مضامین کے مطالعے کے بغیر ناممکن ہے۔ اصغر عباس صاحب نے 'شذرات سرسید' کے عنوان سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مضامین کا ایک جامع انتخاب مرتب کردیا ہے، جو دارالمصنفین شبلی اکادمی اعظم گڑھ سے 2017 میں شائع ہوا ہے۔ مرتب نے اپنے مبسوط مقدمے میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی تاریخ اور اس کے مضامین کی افادیت اور معنویت پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ گزٹ کے موضوعات کا اجمالی احاطہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی انگریزی زبان سے دوری، مسلمانوں کو عصری تعلیم کی طرف مائل کرنے کی کوششوں، دیگر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے روابط کو فروغ دینے، اور تجارت سے جوڑنے وغیرہ موضوعات بیان کیے گئے ہیں۔ زراعت اور علوم زراعت کو فروغ دینے کے تحت سرسید کی کاوشوں کا اجمالی ذکر ہے۔ اسپین کی علمی عظمت اور مغربی نشاۃ ثانیہ کے پس پردہ اسپین کی یونیورسٹیوں کی کارفرمائیوں کا ذکر ہے۔ مقدمہ میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مضامین یکجا کرنے کے تحت اس واقعے کا بھی ذکر ہے کہ اس کام کا

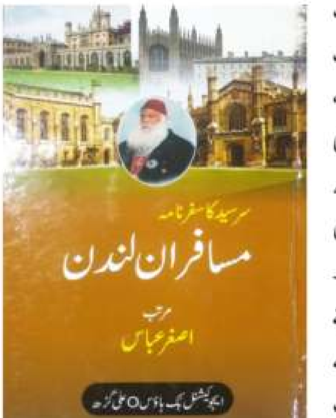

ڈول پہلے حالی نے ڈالا تھا۔ بعض عوارض کی بنا پر وہ اسے انجام دینے سے قاصر رہے۔ انھوں نے سرسید کے عزیز شاگرد مولوی عبدالحق سے ان مضامین کو مرتب کرنے کی گزارش کی، لیکن وہ بھی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ اصغر عباس صاحب کے اس کارنامے کو حالی کے خوابوں کی تکمیل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس وقت کے بڑے علما وفضلا کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان میں ایک اہم نام مولوی ذکاء اللہ کا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ہندوستان معروف کتاب ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جغرافیہ، طبعیات اور علم ہیئت پر نمایاں نقوش چھوڑے ہیں۔ اصغر عباس صاحب نے گزٹ میں مطبوعہ ان کے مضامین کا ایک انتخاب مرتب کیا ہے، جو اتر پردیش اردو اکادمی سے 1983 میں شائع ہوا۔ اصغر عباس صاحب نے سرسید کا سفرنامہ مسافران لندن کو مرتب کرکے 2009 میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع کرایا ہے۔ اس میں مرتب کا مبسوط مقدمہ اور فرہنگ شامل ہے، جو اس سفرنامہ کو مزید معنویت اور افادیت سے ہمکنار کرتا ہے۔ مسافران

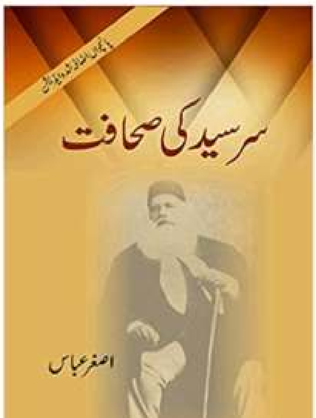

لندن کو مرتب کرنے کے پس پردہ یہ محرک کارفرما معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفرنامہ قسط وار پہلے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا۔ مقدمہ میں سفرنامہ مرتب کیے جانے کی روداد نیز اس سفرنامہ کے متعدد بار شائع کیے جانے کی تفصیلات کا بیان ہے، جو مرتب کی تحقیقی کاوش کا ثمرہ ہے۔ مرتب لکھتے ہیں: مسافران لندن تقریباً ایک صدی بعد مجلس ترقی ادب لاہور کے سربراہ سرسید کے عاشق اور اپنے حلقے کے نسائی تحریک کے اہم قائد سید ممتاز علی کے بیٹے امتیاز علی تاج کے ایما پر شیخ اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیا اور مجلس ترقی ادب لاہور نے 1961 میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ ہندوستان میں یہ سفرنامہ کتابی

شکل میں اب تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد پہلی بار شائع ہورہا ہے۔ شیخ اسماعیل پانی پتی نے اپنے مرتب کردہ مسافران لندن کو مختلف ماخذ تہذیب الاخلاق کے مذکورہ شمارہ، حیات جاوید، سرسید کے مکاتیب اور ان کے لکچر سے مرتب کیا ہے۔ زیرنظر کتاب میں سرسید کے سفرنامہ اور اس سے متعلق سارے مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مختلف شماروں سے اخذ کیے گئے ہیں، کیونکہ یہ پہلی بار بالاقساط وہیں شائع ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ مسافران لندن کی ابتدائی دو قسطیں گزٹ کو انھوں نے عدن اور مصر سے بھیجی تھیں۔'' (ص 22)

فرہنگ کے ذیل میں مشکل الفاظ کے معنی اور نامانوس الفاظ کی تشریحیں درج کی گئی ہیں۔ تعلیقات کے ذیل میں سفرنامہ میں مذکور شخصیات کا تفصیلی تعارف پیش کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔ سرسید کے دست راست اور سائنٹفک سوسائٹی کے رکن اساسی مولوی سمیع اللہ خاں کا سفرنامہ مسافران لندن کو بھی اصغرعباس صاحب نے مرتب کرکے اپنے مقدمہ اور تعلیقات کے ساتھ 2012 میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع کیا ہے۔ اس کو مرتب کرنے کے پس پردہ محرک انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس سفرنامہ کا قسط وار شائع ہونا ہے۔ مقدمے میں مولوی سمیع اللہ خاں کے سوانحی کوائف، سرسید سے ان کے روابط، سائنٹفک سوسائٹی میں ان کی شمولیت، پھر سرسید سے اختلاف اور وجوہ اختلاف کا سیر حاصل بیان ہے۔ سفرنامہ کے مندرجات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ سفرنامہ پہلے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں قسط وار شائع ہوا، پھر بعد میں تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا۔ مرتب نے یہ سفرنامہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے اخذ کیا ہے۔ تعلیقات کے تحت سفرنامہ میں مذکور شخصیات کا قدرے تفصیلی تعارف کا التزام کیا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف جہات میں پھیلی ہوئی سرسید تحریک آزادی کے بعد رفتہ رفتہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دائرۂ کار میں سمٹ کر رہ گئی۔ اصغرعباس صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ افراد یہاں کی روایات و اقدار کی ترجمانی کرنے والے افراد کو موضوع تحقیق و تصنیف بنایا۔ رشید احمد صدیقی آثار و اقدار کے عنوان سے شعبۂ اردو میں منعقدہ سمینار کے مضامین مرتب کیے جو شعبۂ اردو سے 1984 میں کتابی شکل میں منظرعام پر آئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں فکر سرسید کے نمایاں علم بردار اور فکر سرسید کو فلسفیانہ اساس فراہم کرنے والی ہستی کا نام علامہ اقبال ہے۔ اصغرعباس صاحب نے سرسید اور علی گڑھ

اصغر عباس صاحب کا ایک اہم کارنامہ یہ رہا کہ انھوں نے سرسید کی زندگی اور ان کے عہد آفریں تصورات سے عالم عرب کو روشناس کرانے کا ذریعہ تلاش کیا۔ پروفیسر صلاح الدین عمری سے سرسید کی سوانح اور ان کے افکار کا عربی زبان میں ترجمہ کرکے شائع کروایا۔ ہندوستان میں اردو زبان کے علاوہ دیگر زبانوں میں سوانح سرسید اور ان کے افکار کے متعلق کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ اصغر عباس صاحب نے سنسکرت، ہندی، تامل اور تیلگو زبانوں میں ان کے ماہرین کی مدد سے ترجمہ کروایا اور ہندوستان کے ایک بڑے علمی حلقے سے سرسید کو متعارف کرانے کا فریضہ انجام دیا۔

سے اقبال کی وابستگی اور اہل علی گڑھ کا اقبال سے والہانہ تعلق کو تاریخ کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ سرسید، اقبال اور علی گڑھ کے عنوان سے یہ کتاب 1987 میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ کتاب کے مقدمے میں موضوع کے جواز پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے ''اقبال علی گڑھ کے فارغ التحصیل نہیں تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے زاد راہ میں علی گڑھ کے گہرے آثار و نقوش ملتے ہیں۔ وہ علی گڑھ سے متاثر بھی تھے اور اس پر اثر انداز بھی، لیکن یہاں ان اثرات کا جائزہ مقصود نہیں بلکہ اس رسالے میں صرف اقبال اور علی گڑھ کے ربط و تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ اقبالیات کے مطالعے میں یہ پہلو بھی نظرانداز نہ ہو۔'' (شروع کی بات، ص 3)

عرفان سید حامد، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 2001، ارمغان سرور، انجمن ترقی اردو ہند 2001، سردار جعفری: شخصیت اور فن شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 2002، اصغرعباس صاحب کی یہ وہ مرتبہ کتابیں ہیں جو علی گڑھ تحریک کی ارتقائی کڑی کے طور پر پڑھی جاسکتی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ اصغرعباس صاحب کے خاصے مضامین ہیں جو سرسید اور یونیورسٹی سے متعلق کسی عمارت یا شخصیت پر مبنی ہیں۔ جیسے انھوں نے یونیورسٹی کی لٹن لائبریری پر خاصا معلوماتی مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ اخیر عمر میں انھوں نے 'ضیابار افراد کے خطوط' کے عنوان سے اپنے نام ان خطوط کو مرتب کردیا ہے، جو ان کے سینئر اساتذہ، معاصرین، اعزہ اور شاگردوں نے تحریر کیے ہیں۔ ان خطوط میں ادبی، علمی و تہذیبی گفتگو، کتابوں کے متعلق دریافت آپسی حال احوال اور علی گڑھ کی ادبی سیاست کی دستاویزات محفوظ ہیں۔ یہ مجموعہ خط 2020 میں منظرعام پر آیا۔

شعبۂ اردو میں تدریسی فرائض انجام دینے کے علاوہ آپ نے 99-1998 میں آکسفورڈ یونیورسٹی لندن میں وزیٹنگ آورسیز پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ متعدد بیرونی ممالک کے علمی اسفار کیے۔ تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ آپ سرسید اکادمی علی گڑھ کے ڈائریکٹر (2002-2008) رہے۔ آپ نے اس زمانے میں سرسید کی متعدد کتابوں کو اپنے مقدمے، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع کیا۔ اصغرعباس صاحب کا ایک اہم کارنامہ یہ رہا کہ انھوں نے سرسید کی زندگی اور ان کے عہد آفریں تصورات سے عالم عرب کو روشناس کرانے کا ذریعہ تلاش کیا۔ پروفیسر صلاح الدین عمری سے سرسید کی سوانح اور ان کے افکار کا عربی زبان میں ترجمہ کرکے شائع کروایا۔ ہندوستان میں اردو زبان کے علاوہ دیگر زبانوں میں سوانح سرسید اور ان کے افکار کے متعلق کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ اصغرعباس صاحب نے سنسکرت، ہندی، تامل اور تیلگو زبانوں میں ان کے ماہرین کی مدد سے ترجمہ کروایا اور ہندوستان کے ایک بڑے علمی حلقے سے سرسید کو متعارف کرانے کا فریضہ انجام دیا۔

آپ کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کا قومی سطح پر متعدد بار اعتراف کیا گیا۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے آپ کو بالترتیب 1975، 1987 اور 2001 میں آپ کی مختلف کتابوں پر انعامات سے نوازا۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے آپ کو اپنے ممتاز انعام امتیاز میر سے سرفراز کیا۔ ہریانہ وقف بورڈ نے آپ کو خواجہ الطاف حسین حالی ایوارڈ 2011 عطا کیا۔ اترپردیش اردو اکادمی نے آپ کی مجموعی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے سب سے مؤقر انعام مولانا آزاد ایوارڈ 2020 سے نواز کر قدرشناسی کا ثبوت دیا۔ اصغرعباس صاحب کے انتقال سے علم و ادب اور تحقیق کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا، ایک طویل عرصے تک اس کی بھرپائی ناممکن معلوم ہوتی ہے:

یہاں ملتا رہے گا سوز و ساز آرزو برسوں
کیا ہے خون دل سے اک قلندر نے وضو برسوں

(سرور)

■

Dr. Moyeedur Rahman
Asst. Prof., Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.: 8126410481

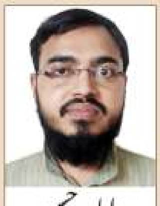

نایاب حسن

رضوان اللہ فاروقی

قصۂ ما مشعلے روشن کند راہِ صواب!

اردو کے بزرگ صحافی، ادیب وشاعر، سیلف میڈ شخصیت اور متعدد کتابوں کے مصنف ومترجم رضوان اللہ فاروقی 18 اکتوبر 2022 کی صبح انتقال کر گئے۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا (نئی دہلی) میں ان کی رہائش تھی، ان کی عمر تقریباً 92 برس تھی۔ مرحوم کا اصل وطنی تعلق اعظم گڑھ کے کوئریا پار سے تھا، مگر چالیس سال کا عرصہ ہوا کہ وہ دہلی میں مقیم تھے۔ بٹلہ ہاؤس، ذاکر نگر، شاہین باغ و ابوالفضل انکلیوان کی آنکھوں کے سامنے آباد ہوئے، وہ 1977-78 میں اس علاقے میں آکر رہائش پذیر ہوئے تھے۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے خاصے گوشہ گیر، خلوت گزیں اور اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان تھے

ان سے ہمارا تعارف مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے ان کے مضامین کے ذریعے کئی سال قبل ہوا، مگر چند ماہ قبل ان کی خودنوشت 'اوراقِ ہستی' پڑھنے کا موقع ملا، تو ان کی شخصیت اور زندگی کے کئی پہلوؤں سے خوشگوار و حیرت انگیز آشنائی ہوئی۔ اس عمر میں بھی ان کے ذہن وقلم ایکٹیو تھے اور 488 صفحات پر مشتمل مذکورہ خودنوشت 2020 میں شائع ہوئی، جبکہ تبصروں کا ایک مجموعہ تو ابھی چند ماہ پہلے انھوں نے شائع کروایا تھا۔

اس کتاب کو انھوں نے چار اوراق میں تقسیم کیا ہے اور ہر ورق کے ذیل میں اپنی زندگی کے ایک حصے کا احوال بیان کیا ہے۔ 'پہلا ورق' ابتدائی حالات، خانگی کوائف، ددیہالی وننھیالی خاندان کی تفصیلات، تعلیمی سلسلوں، جونپور و کانپور کے قیام، بنارس و دیوریا کی ملازمتوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

'دوسرا ورق' ان کی صحافتی زندگی کو بیان کرتا ہے، جس کا باقاعدہ آغاز کلکتہ کے 'عصر جدید' سے 1951 میں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ 'آزاد ہند' اور دیگر اخباروں میں بھی وہ ایڈیٹنگ اور ترجمہ نگاری کا کام کرتے رہے۔ یہ حصہ 153 سے 282 صفحات تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں 1951 سے 1975 تک کی نہ صرف اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے نشیب وفراز کی داستان انھوں نے لکھی ہے؛ بلکہ اس کے بین السطور میں وہاں کی پچیس سالہ اردو صحافت کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔ جن اخباروں (خصوصاً عصر جدید اور آزاد ہند) میں انھوں نے کام کیے، وہاں کے اندرونی حالات، ان کے مالکان اور ملازموں کی کشمکش، اخباری دفاتر کے

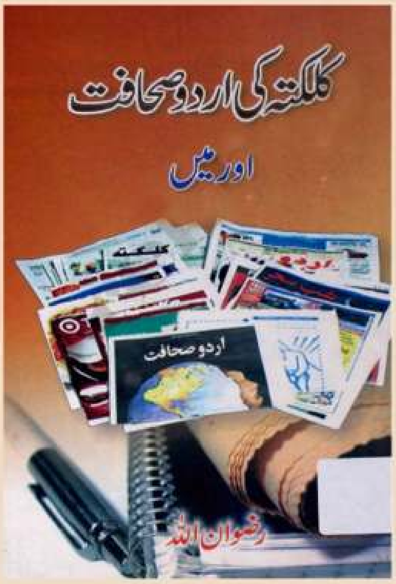

اندر اور باہر چلنے والی بوگس سیاستوں، وہاں کام کرنے والے مختلف اشخاص کا احوال اور ان اخباروں میں شائع ہونے والے مواد پر اجمالی تبصرے کے ساتھ اس دوران ذاتی زندگی میں رونما ہونے والے انقلابات کا بھی اس حصے میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح آزادی کے فوراً بعد اردو صحافت کو جس قیامت خیز صورتِ حال کا سامنا تھا اور اردو کے صحافی جس کس مپرسی

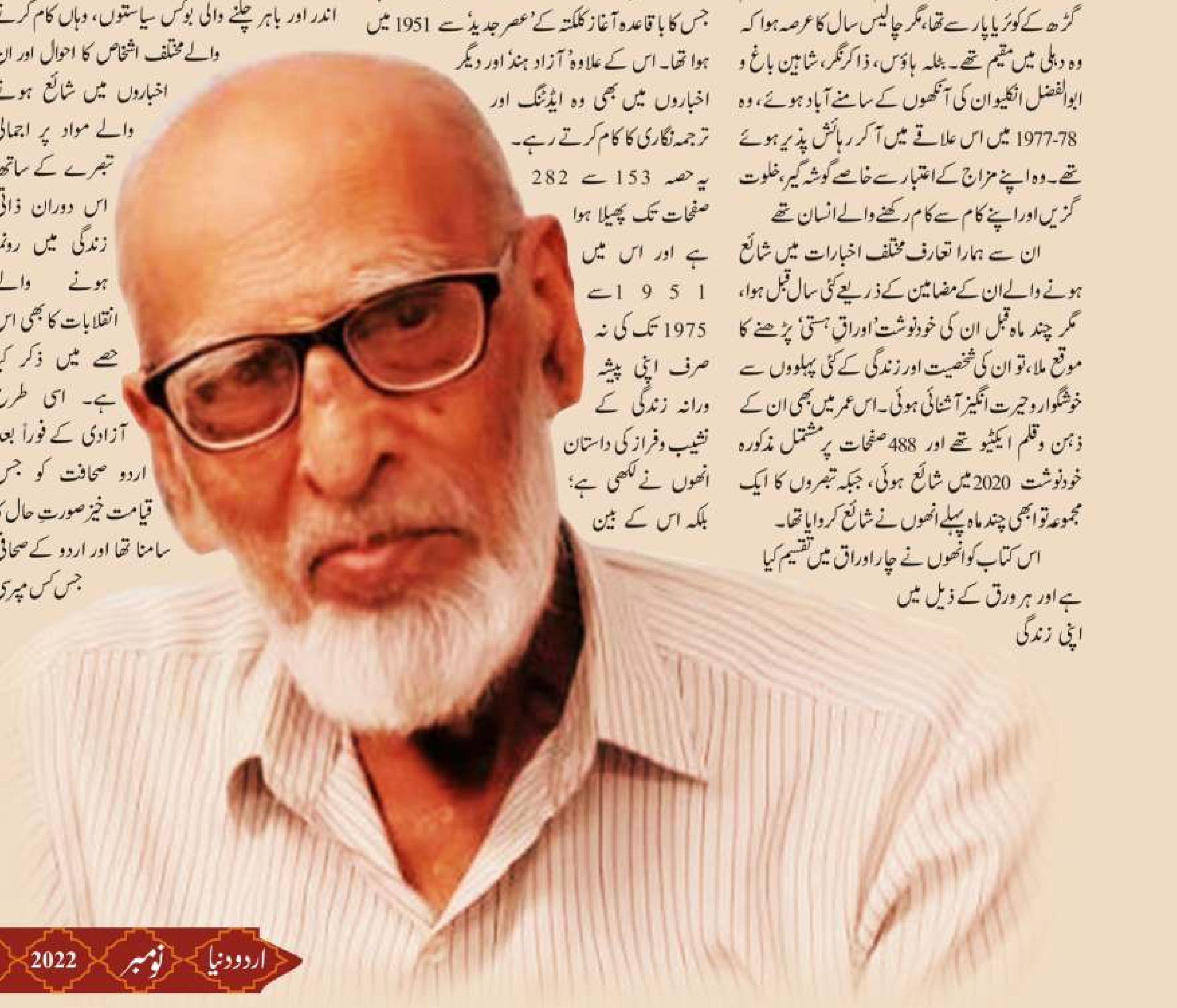

سے گزر رہے تھے، اس کا بھی مجموعی جائزہ لیا ہے۔

کلکتہ میں قیام کے دوران ہی انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے جرنلزم میں پوسٹ گریجویشن کیا، گریجویشن وہ کرائسٹ چرچ کالج کانپور سے کر چکے تھے۔ 1957 میں عصرِ جدید کے منیجر اشتہارات بھارتی جی کی معرفت ان کی رسائی امریکی دفتر اطلاعات تک ہوئی اور پھر ایک معقول ملازمت کی راہ نکل آئی، 1975 تک تو اس کے لیے جزوقتی اردو ترجمہ وایڈٹنگ کا کام کرتے رہے، پھر اسی سال انھیں اس کے دہلی دفتر میں شعبۂ اردو کا ذمے دار بنا کر بھیجا گیا۔ اپنی سوانح کے 'تیسرے ورق' میں ملازمت کے اسی دور کا انھوں نے احاطہ کیا ہے، جو 1992 تک دراز ہے۔ اس دوران انھیں جن ذاتی واقعات و سانحات سے گزرنا پڑا، پیشہ ورانہ مصروفیتوں کے ذیل میں ملک اور ملک سے باہر جو اسفار کیے اور کس طرح مختلف چیلنجز کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیتے رہے، ان سب کا احوال اس حصے میں ہے، جبکہ 'چوتھا ورق' انھوں نے اپنے اسفار کی روداد کے لیے خاص کیا ہے۔ اس میں خود ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ افغانستان، پاکستان، برطانیہ و امریکہ وغیرہ کے سفرنامے انھوں نے تحریر کیے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے مجھے معلوم ہوا کہ پروفیسر فیضان اللہ فاروقی پانچ بھائیوں میں ان کے سب سے چھوٹے بھائی تھے، جن کا 2020 میں انتقال ہوا ہے، وہ جے این یو کے شعبہ عربی سے ریٹائرڈ اور قدیم فاضل دیوبند تھے۔ اسی طرح ابتدائی حصے میں جو خاندان کا احوال انھوں نے بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اردو کے معروف دانش ور اور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا تعلق بھی انھی کے خاندان سے تھا، وہ رشتے میں رضوان اللہ صاحب کے بھتیجے تھے، ان کے چچازاد بھائی خلیل الرحمٰن صاحب کے بیٹے تھے، شمس الرحمٰن فاروقی کے دادا مولوی اصغر گورکھپور گورنمنٹ اسکول میں اردو فارسی پڑھاتے تھے اور فراق گورکھپوری کے بچپن کے استاذ تھے۔ اس حصے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاندان کافی بھرا پُرا تھا اور بیشتر لوگ مختلف علوم وفنون سے آراستہ اور صاحبانِ وقار و اعتبار تھے۔ مجموعی طور پر ان کا خاندان مشرقی یوپی کے زمیندار خاندانوں میں سے ایک تھا، مگر اس کی زمینداری مرورِ زمانہ کی وجہ سے بہ تدریج سمٹتی، سکڑتی گئی اور بالآخر آزادی کے بعد اس کا کلی خاتمہ ہوگیا، جس کی وجہ سے ان کے خاندان کے دوسرے نوجوانوں کی طرح خود رضوان اللہ صاحب کو بھی اپنی تعلیمی و عملی زندگی میں بے شمار دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا اور انھیں ایسی آسودگی کبھی حاصل نہ رہی، جو انسان کو حقیقی معنوں میں احساسِ عیش سے ہم کنار کرتی اور غمِ روزگار سے مستغنی کر دیتی ہے؛ لیکن حالات کی تنگی و ترشی کے باوجود انھوں نے کبھی ناشکری کا دامن نہیں تھاما، ہمیشہ باحوصلہ رہے، صابر و شاکر رہے، ان کی امنگوں، ترنگوں اور تازہ دمی و شادابی میں تاحیات کوئی کمی نہیں آئی اور سینہ سپر ہوکر ہر قسم کے سانحے کا مقابلہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاحیات ذہنی و نفسیاتی اعتبار سے توانا رہے، ان کی غیر معمولی صلاحیتیں علم وقلم کی مختلف راہوں کو اجالتی رہیں اور انھوں نے زبان وادب کے کئی گوشوں کو اپنے نتائجِ فکر وتخلیق سے منور کیا۔

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ رضوان اللہ صاحب نے اس میں زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلسلہ وار اپنا زندگی نامہ تحریر کیا ہے، ایک اور خاص بات یہ ہے کہ چونکہ وہ ایک دیدہ ور صحافی ہیں اور اخباری صحافت کے علاوہ سفارتی صحافت سے بھی ان کا گہرا رشتہ رہا ہے؛ اس لیے وہ اپنے حالات کے ساتھ مختلف زمانی وقفوں میں رونما ہونے والے قومی و عالمی سانحات وواقعات کا تذکرہ و تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ ایک حسن اس کتاب کا زبان و بیان کی سلاست، شیرینی اور غیر معمولی روانی بھی ہے، چونکہ رضوان اللہ صاحب محض روایتی قسم کے صحافی نہیں تھے، انھیں اردو کے علاوہ فارسی وانگریزی زبانوں پر بھی کامل عبور تھا اور ادبی وشعری ذوق بھی بڑا زرخیز تھا؛ اس لیے ان کی اس کتاب میں معلومات، تجزیوں اور مختلف سیاسی وسماجی حالات پر چشم کشا تبصروں کے علاوہ اسلوب و ادا کی رعنائی و زیبائی بھی بخوبی پائی جاتی ہے۔ پڑھتے ہوئے کہیں طبیعت کو اضمحلال، بوریت یا تکان کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی دوسری نثری نگارشات بھی زبان و اسلوب کی ان خوبیوں سے بہ تمام وکمال لیس ہیں۔

اس خودنوشت کے علاوہ ان کا ایک شعری مجموعہ 'متاعِ سحر' (ط: 2008) ہے، جس میں اردو نظموں، غزلوں کے علاوہ ان کا فارسی کلام بھی شامل ہے۔ 'اوراقِ مصور' (ط: 2002) ان کی ایک طویل مثنوی اور دو نظموں کا مجموعہ ہے۔ 'عکسِ خیال' دولسانی (اردو وانگریزی) نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔

رضوان اللہ صاحب کی شاعری بڑی جان دار و طرح دار ہے، ان کی غیر معمولی مشاہداتی قوت اور زبان آوری اس سلسلے میں خصوصاً ان کے ہم رکاب رہی ہے؛ چنانچہ ان کی نظموں اور غزلوں میں معنی آفرینی بھی ہے اور ان کی لفظیاتی سطح بھی بڑی ہموار، خوش رنگ اور دل آگیں ہے۔ انھوں نے اپنے طویل سفرِ حیات میں ذاتی زندگی کی اتھل پتھل کے علاوہ ملک اور دنیا کے بے پناہ تغیرات و سانحات دیکھے اور ایک سرگرم صحافی ہونے کی وجہ سے ایسے کئی سانحات کے وہ چشم دید گواہ بھی رہے؛ اس لیے ان کی شاعری، خصوصاً نظمیہ شاعری میں زمینی حقائق و احوال کی عکاسی محض شاعرانہ خیال آرائی پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ وہ اپنے واقعاتی پس منظر کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی حال ان کی غزلوں کا بھی ہے، البتہ ان میں رومانیت اور حسن وعشق، ہجر وفراق جیسے روایتی موضوعات کو بھی انھوں نے برتا ہے، مگر ظاہری ساخت اور تخیل کے حوالے سے اپنا انفراد بھی انھوں نے قائم رکھا ہے، چند اشعار، جن میں انسانی زندگی کے کئی رنگ جھلملاتے نظر آتے ہیں۔

وہ جہاں بھی کیسا جہان تھا، جہاں رات میری گزر گئی
وہ ہوائے شوق تھی مشک بو رگِ جاں کو جیسے کتر گئی
کوئی رشکِ حسن تمام تھا، وہی قد و قامتِ سرو سا
وہی برق جس کا بیاں ہو کیا، جو گری تو دل میں اتر گئی

دل کہاں ہر کسی سے ملتا ہے
یہ تو بس آپ ہی سے ملتا ہے
تکتا رہتا ہوں دیر تک اس کو
چہرہ جس کا کسی سے ملتا ہے
لے کے جائے جہاں بھی مجبوری
کون کس سے خوشی سے ملتا ہے

نہ دکھا سکا تجھے داغِ دل، نہ سمجھ کہ بجھ گئے سب دیے
یہ لحاظ مجھ کو ضرور ہے، نہ ہو داستاں یہ زباں زباں
جو کہا کسی نے وہ آرہا ہے کوئی فریفتہ آپ کا
تو نگاہِ ناز اٹھی ذرا، کہا اِک ادا سے: کہاں؟ کہاں؟

سنو سنو کہ جوانی رہے رہے نہ رہے
گھڑی گھڑی ہے سہانی، رہے رہے نہ رہے
چلو چلو کہ تماشائے زندگی دیکھیں
یہ رنگ روپ ہے فانی رہے رہے نہ رہے

نظمیں انھوں نے پابند بھی کہی ہیں اور معریٰ بھی اور دونوں قسم کی نظمیں اپنی بنت کے اعتبار سے بڑی توانا اور مقصدیت سے معمور ہیں، ان کے موضوعات زیادہ تر سماجی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں یا فرد کے احوال کی تخلیقی و

رضوان اللہ صاحب کی شخصیت بڑی ذوجہات تھی، زندگی انھوں نے بڑی بھرپور، بافیض اور ماجرا پرور گزاری، اردو صحافت کا وقار بن کر رہے اور اپنے پیچھے منثور و منظوم تخلیقات و تراجم کا قابل قدر ذخیرہ چھوڑ گئے۔ ان کی بعض تصانیف مکتبہ جامعہ سے حاصل کی جاسکتی ھیں rizwanullah.com کے نام سے ان کی پرسنل ویب سائٹ بھی ہے، جو انھوں نے 2015میں بنوائی تھی۔ وہاں ان کی منتخب تحریریں اور پی ڈی ایف ورژن میں ان کی کتابیں بھی مل جائیں گی۔

تخیلاتی منظر کشی کرتے ہیں۔ خود اپنے آپ کو موضوع بنا کر جو نظمیں انھوں نے کہی ہیں، وہ بھی اپنے پیغام یا مجموعی فضا کے اعتبار سے عمومی معنی لیے ہوئی ہیں۔ 'نئے آدم کی تشکیل'، 'اکیلی کتاب'، 'تلاش'، 'درد کی لذت باقی ہے'، 'روٹی'، 'سیل' اور 'سفر جاری ہے' ان کی بہت خوب صورت، معنی خیز اور انسانی المیوں کو واشگاف کرنے والی بڑی پرشوکت نظمیں ہیں۔

انھوں نے میر و غالب کی غزلوں پر تضمینیں بھی بہت شان دار کہی ہیں، مثلاً میر کی ایک غزل پر تضمین کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے

دنیا سے بے خبر تھا عجب اضطراب تھا
گویا جہاں کو آنکھ کا پردہ حجاب تھا
پہلو میں ایک دل تھا سو خانہ خراب تھا
'دل میں بھرا زبسکہ خیالِ شراب تھا
مانند آئینے کے مرے گھر میں آب تھا'

غالب کی ایک مشہور غزل پر بھی انھوں نے بہت اچھی تضمین کی ہے، ایک بند

ہتھیلی پر انا لے کر جو محتاجِ کرم نکلے
قیامت سے گزرنا تھا جو گم نامی سے ہم نکلے
تمناؤں کے پھندے میں زبوں، صیدِ الم نکلے
'ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے'

اس کے علاوہ مثنوی، رباعی اور قطعہ نگاری میں بھی رضوان اللہ صاحب نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنی تخلیقی جولانی کے عمدہ نقوش پیش کیے ہیں۔

وہ فارسی سخن طرازی میں بھی غیر معمولی دست رس رکھتے تھے اور باقاعدہ اس زبان میں غزلیں، نظمیں اور رباعی وغیرہ کہی ہیں۔ ان کی فارسی شاعری میں بھی تخیل کی بلند پروازی اور لفظیات کی شیرینی و سحر انگیزی مرتبۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے، اسے پڑھتے ہوئے ہمیں اردو کے ساتھ فارسی زبان اور اس کے شعری در و بست پر ان کی حیرت انگیز گرفت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فارسی شاعری کی پوری روایت، جو منوچہری و رودکی، فردوسی و عمر خیام، فریدالدین عطار و سنائی، سعدی و حافظ شیرازی، شمس تبریزی و مولانا روم اور امیر خسرو و اقبال وغیرہ سے وابستہ ہے، ان کے پیش نظر ہے اور اسی روایت کو وہ اپنے شوخ و شیریں و دل کش انداز میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ بڑے رواں، سلیس اور شگفتہ الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور خاصے دل آویز پیرایے میں اپنے افکار کو اشعار کے پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

اے تیرگی وداع کہ پیروزیِ سحر
برکف نہادہ طالعِ بیدار آمدیم
برخیز! دست آر! کہ بنیانِ نو نہیم
نے ما برائے شورش و پیکار آمدیم

(اے تیرگی رخصت ہوجا کہ صبح دم ہم اپنی ہتھیلی پر بختِ بیدار لے کر آئے ہیں۔ اٹھو، اپنا ہاتھ بڑھاؤ کہ مل کر ہم بنیادِ نو اٹھائیں، ہم محض ہنگامہ و معرکہ آرائی کے لیے نہیں آئے)

چوں نہ بینی دردِ پنہاں چشم و دامانم نگر
داغہا درسینہ دارم، زخمِ عریانم نگر
قصۂ ما مشعلے روشن کند راہِ صواب
شعلہ سامانم ولے گلہا بدامانم نگر

(اگر تمھیں میرا دردِ پنہاں نظر نہیں آرہا تو میرے چشم و دامن کو دیکھو، میرے سینے میں بے شمار داغ ہیں، (تم) میرے اس زخم (کو ہی دیکھ لو) جو ظاہر ہے۔ ہمارا قصہ یہ ہے کہ ہم اس مشعل کے مانند ہیں، جو راہِ راست کو روشن کرتی ہے، ہم خود تو شعلہ ساماں ہیں مگر اپنے دامن میں پھول رکھتے ہیں، دیکھو!)

سحر دمید بیا بام و در کشادہ کنیم
بیا کہ قصۂ فصلِ بہار تازہ کنیم
بیا کہ خوشۂ دل جامِ ارغواں پر کرد
بیا بیا کہ بہم باز شغلِ بادہ کنیم

(صبح ہوچکی، آؤ کہ بام و در کھولیں، آؤ کہ موسمِ بہار کے قصے کو تازہ کریں۔ آؤ کہ خوشۂ دل نے جامِ ارغواں کو بھر دیا ہے، آؤ آؤ کہ ہم پھر شغلِ بادہ نوشی کریں)

ما چراغ ہستیم و پروانہ خودیم
طرفہ خود آگاہ و دیوانہ خودیم
پاسدارِ آبروے دردِ خویش
ما صدف ہستیم و دردانہ خودیم

(ہمیں چراغ ہیں اور ہمیں پروانہ ہیں، عجب یہ ہے کہ ہم خود آگاہ بھی ہیں اور ہم پر دیوانگی بھی طاری ہے، ہم اپنی آبروے درد کے محافظ ہیں، ہمیں صدف ہیں اور ہمیں موتی ہیں)

نثر میں ان کی ایک کتاب 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' ہے، جس میں کلکتہ کی اپنی صحافتی سرگرمیوں اور وہاں کی مجموعی اردو صحافت کے اور چھور پر تفصیل سے لکھا ہے۔ 'ہمارے گاؤں ہمارے لوگ' میں اپنے گاؤں اور وہاں کے بعض مخصوص لوگوں کا خاکہ کھینچا ہے۔ 'بے ادبیات' ان کی ایک دلچسپ کتاب ہے، جس میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور منظومات جمع ہیں، ابھی وفات سے چند ماہ قبل ان کی ایک کتاب 'تبصراتِ کتب' شائع ہوئی تھی، جس میں انھوں نے ایک منفرد تجربہ کیا ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں خود اپنی کتابوں پر مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے تبصروں کو شامل کیا ہے، جن کی تعداد سولہ ہے اور دوسرے حصے میں دوسرے مصنفین کی کتابوں پر اپنے تبصرے شامل کیے ہیں اور ان کی تعداد ستائیس اٹھائیس ہے۔

لکھنے کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری بھی رضوان اللہ صاحب کا کل وقتی مشغلہ تھا؛ اس لیے انھوں نے پیشہ ورانہ تراجم کے علاوہ خود اپنی بہت سی تحریروں کے انگریزی ترجمے کیے اور دوسرے مصنفین کی متعدد کتابوں کے ترجمے بھی ان کے قلم سے منظر عام پر آئے، ان میں سے ایک اقبال سہیل کی مشہور کتاب 'ربا کیا ہے؟' کا انگریزی ترجمہ What is Reba اور ابوالفضل انکلیو کے بانی ابوالفضل فاروقی کی خودنوشت سوانح 'نشیب و فراز' کا انگریزی ترجمہ Ups and Downs خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر مقبول احمد کی متعدد تصانیف اور مختلف نصابی کتابوں کے اردو سے انگریزی ترجمے کیے۔

الغرض رضوان اللہ صاحب کی شخصیت بڑی ذوجہات تھی، زندگی انھوں نے بڑی بھرپور، بافیض اور ماجرا پرور گزاری، اردو صحافت کا وقار بن کر رہے اور اپنے پیچھے منثور و منظوم تخلیقات و تراجم کا قابلِ قدر ذخیرہ چھوڑ گئے۔ ان کی بعض تصانیف مکتبہ جامعہ سے حاصل کی جاسکتی ہیں rizwanullah.com کے نام سے ان کی پرسنل ویب سائٹ بھی ہے، جو انھوں نے 2015 میں بنوائی تھی۔ وہاں ان کی منتخب تحریریں اور پی ڈی ایف ورژن میں ان کی کتابیں بھی مل جائیں گی۔

■

Nayab Hasan
A-22, Seema Apts, Lane No.: 7
Batla House, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.:9560188574

کمپیوٹر پر دیدہ زیب صفحہ سازی کا طریقہ

خبروں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانے کے لیے سرخیوں پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔سرخیاں بنانا اپنے آپ میں ایک ایسافن ہے جو برسوں کی محنت کے بعد آتا ہے۔ ماہر صحافی سرخی سازی پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ خبر کانچوڑ سرخی میں آجائے یاکم ازکم تین 'ک' کا مفہوم واضح ہو جائے تو ایسی سرخیوں کوکامیاب سرخیوں کے زمرے میں رکھا جاتاہے۔

اردو اخبارات کے دفتر میں خوبصورت صفحہ سازی کا فن جسے آتا ہے؛ اس کی مقبولیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اس فن پر مہارت اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے؛ جب کمپیوٹر پر صفحہ سازی کا ہنر آتا ہو۔ میرے علم کے مطابق اس وقت تمام چھوٹے بڑے اردو اخبارات اور رسائل کی صفحہ سازی کمپیوٹر کے ذریعے کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اخباروں میں کام کرنے والے اس فن میں زیادہ ماہر ہیں، وہ اخبارات قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں زیادہ کامیاب ہیں۔ اخبارات کے قارئین کو جو چیز پہلی نظر میں متاثر کرتی ہے، وہ ہے اخبار کا 'لے آؤٹ' (Lay Out)۔ جب سے رنگین اخبار کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور کمپیوٹر کے ذریعے صفحہ سازی کا کام لیا جانے لگا ہے؛ تب سے صفحات کو خوبصورت بنانا، مناسب جگہوں پر خبروں کو سیٹ کرنا، تصاویر کو چھوٹی بڑی کر کے اپنی پسند کی جگہ پر لگانا بے حد آسان ہوگیا ہے۔ آج بین الاقوامی سطح کے بیشتر اخبارات خوبصورت سے خوبصورت بنا کر قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ اردو زبان کے اخبارات بھی اب اس میدان میں پیچھے نہیں ہیں۔ بیشتر اردو اخبارات اس وقت رنگین شائع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ان پہلوؤں پر بحث کی جائے؛ جن پر تھوڑی توجہ مرکوز کر کے کمپیوٹر کے توسط سے اخبار کے صفحات جاذب نظر بنائے جاسکتے ہیں، سُرخیاں معنی خیز بنائی جاسکتی ہیں اور تصاویر کو اہمیت کے اعتبار سے صفحے پر سجایا جاسکتا ہے، تاکہ اخبار کے تمام صفحات خوبصورت اور دل کش ہوں۔ اب آیئے ان نکات پر ہم تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں:

سرخیاں کیسے بنائیں؟

○ خبروں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانے کے لیے سرخیوں پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ سرخیاں بنانا اپنے آپ میں ایک ایسا فن ہے جو برسوں کی محنت کے بعد آتا ہے۔ ماہر صحافی سرخی سازی پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ خبر کا نچوڑ سرخی میں آجائے یا کم از کم تین 'ک' کا مفہوم واضح ہوجائے تو ایسی سرخیوں کو کامیاب سرخیوں کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ یوں تو صحافیوں کے لیے 'ک' کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے، پھر بھی ذکر کر دینا زیادہ مناسب ہے کہ خبریں چھ 'ک' یعنی کیا، کب، کہاں، کس کے ساتھ، کیوں اور کیسے کی تفصیلات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اگر سرخیوں میں تین 'ک' کا جواب مضمر ہے تو ایسی سرخیاں اچھی ہوتی ہیں۔ بہت سے اخبارات میں اچھی سرخی بنانے والے صحافیوں کو انعام سے نوازہ جاتا ہے اور اس طرح کامیاب سرخی سازی کی تحریک پیدا کی جاتی ہے۔ سرخی سازی کے لیے الفاظ کی تحدید کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک کالم یا دو کالم کی خبروں کی سرخیوں میں 15/ سے 20/ الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو سرخیاں، سرخیاں نہ رہ کر خبروں میں تبدیل ہوجائیں گی اور خبر کی معنویت ختم ہوجائے گی۔ خبروں کی سرخیاں ہمیشہ کالم کو نگاہ میں رکھ کر بنائی جاتی ہیں۔ ایک کالم سے آٹھ کالم تک کی سرخیاں گرچہ الگ الگ ہوں گی، البتہ مفہوم یکساں ہوگا۔ جیسے جیسے کالم بڑھتے جائیں گے، ویسے ویسے سرخیوں کے الفاظ اور ان کی ضخامت بھی بڑھتی جائے گی۔

○ سرخیوں کے الفاظ

عام طور پر ایک کالمی سرخی میں 3 سے 5/ الفاظ، دو کالمی سرخی میں 5 سے 8/ الفاظ، تین کالمی سرخی

میں 8 ر سے 10 ر الفاظ، چار کالمی سرخی میں 10 ر سے 12 ر الفاظ، پانچ کالمی سرخی میں 12 ر سے 16 ر الفاظ، 6 ر کالمی سرخی میں 16 ر سے 18 ر الفاظ، 7 ر کالمی سرخی میں 18 ر سے 20 ر الفاظ اور آٹھ کالمی سرخی میں لگ بھگ 20 ر سے 22 ر الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ الفاظ کی یہ ترتیب حتمی نہیں ہے۔ کم وبیش کی گنجائش بہرحال ہے۔ صفحے سازی کرنے والا اپنی صوابدید پر الفاظ کم یا زیادہ کر کے صفحہ کو دلکش اور سرخیوں کو معنی خیز بنا سکتا ہے۔

الفاظ کی مذکورہ ترتیب اس وقت ہے جب خبر صفحے کی پہلی خبر جسے لیڈ خبر (Lead News) بھی کہتے ہیں، نہ بنائی جارہی ہو۔ اگر خبر صفحہ پر پہلی خبر کے طور پر سجائی جارہی ہے، تو پھر الفاظ کم استعمال کرنے پڑیں گے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو خبر صفحے کی لیڈ خبر بنائی جاتی ہے، وہ صفحے کی تمام خبروں میں نمایاں ہوتی ہے۔ چنانچہ خبر نمایاں اسی وقت ہوگی جب سرخی کا فاؤنٹ بڑا ہوگا اور فاؤنٹ اسی وقت بڑا ہوسکتا ہے جب الفاظ کم اور حسب حال ہوں گے۔

دراصل خبروں کی پیش کش کے اعتبار سے خبروں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کسی بھی خبر کے زیادہ یا کم پڑھے جانے کا انحصار بہت حد تک سرخیوں اور پلیسمنٹ پر ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خبر کی سرخی ایسی بنادی جاتی ہے، جس کی وجہ سے قارئین اس خبر کو پڑھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

سرخیوں کا فاؤنٹ

کمپیوٹر پر خوبصورت صفحہ سازی کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ سرخیوں اور خبروں کے فاؤنٹ پر خاص طور پر دھیان دیا جائے۔ صفحہ اول کو چھوڑ کر دیگر تمام صفحات کی پہلی خبر جو لیڈ خبر ہے، اس کی سرخیوں کا فاؤنٹ عام طور پر 60 ر سے 70 ر کے درمیان رکھا جاتا ہے؛ اس کے علاوہ دیگر تمام خبروں کی سرخیوں کا فاؤنٹ اس سے کم رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر:

- ایک کالمی خبر ہے تو اس کی سرخی کا فاؤنٹ 15 ر سے 20 ر کے درمیان رکھا جاتا ہے۔
- دو کالمی خبر ہے تو اس کی سرخی کا فاؤنٹ 20 ر سے 25 ر کے درمیان رکھا جاتا ہے۔
- تین کالمی سرخی ہے تو اس کا فاؤنٹ 30 ر سے 35 ر کے درمیان رکھا جاتا ہے۔
- چار کالمی سرخی ہے تو اس کا فاؤنٹ 40 ر سے 50 ر کے درمیان رکھا جاتا ہے۔
- 5 ر، 6 ر، 7 ر یا 8 ر کالمی خبر ہے تو اس کی سرخی کا فاؤنٹ 45 ر سے 55 ر کے درمیان رکھا جاتا ہے۔

نوٹ: کسی بھی خبر کی سرخی پہلی (لیڈ) خبر کی سرخی سے زیادہ نمایاں نہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ لیڈ خبر وہی بنائی جاتی ہے، جو سب سے اہم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جو خبر سب سے اہم ہوگی، اس کی سرخی بھی نمایاں انداز میں پیش کی جائے گی، تا کہ قارئین کی توجہ فوری طور پر اس کی طرف مبذول ہوجائے۔

ذیلی سرخیاں

خبروں کی پہلی سرخیوں کے نیچے جو سرخیاں لگائی جاتی ہیں؛ وہ ذیلی سرخیاں کہلاتی ہیں۔ ذیلی سرخیوں کے الفاظ (کم یا زیادہ) ضرورت کے اعتبار سے استعمال کیے جاسکتے ہیں؛ بس خیال رہے کہ کسی بھی ذیلی سرخی کا فاؤنٹ لیڈ خبر کی سرخی سے زیادہ بڑا نہ ہو، ساتھ ہی پہلی سرخیوں سے بھی ذیلی سرخیوں کا فاؤنٹ بڑا رکھنا غیر مناسب ہے، بلکہ ذیلی سرخیوں کا فاؤنٹ پہلی سرخیوں سے ہمیشہ چھوٹا رکھائے تو بہتر ہے۔ ذیلی سرخیوں کا فاؤنٹ عام طور پر 20 ر سے 30 ر کے درمیان رکھتے ہیں۔ اگر تین سرخیاں لگائی جارہی ہیں تو اس کا خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ تیسری سرخی کا فاؤنٹ دوسری سرخی سے کم ہوگا۔

سرخیوں میں رنگ سازی

نیوز پیج (وہ صفحات جو خبروں کے لیے مختص ہیں) کی سرخیاں عام طور پر رنگین کی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ گو کہ اردو کے بیشتر اخبارات کی سرخیوں میں رنگ بھر دیا جاتا ہے اور انھیں رنگ برنگا کر دیا جاتا ہے؛ جو خوبصورت صفحہ سازی کی تکنیک کے برخلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی اور ہندی کے قومی سطح کے اخبارات میں سرخیوں کو کلر نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر خبروں کی سرخیوں کو رنگین کر دیتے ہیں تو رنگین تصاویر کی خوبصورتی نکھر کر سامنے نہیں آپاتی ہے۔ تصاویر کی خوبصورتی پوری طرح نکھر کر سامنے آجائے، اس کے لیے ضروری ہے کہ سرخیاں رنگین نہ ہوں۔ سرخیوں کے رنگین نہ رکھنے کے پس پردہ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بہت زیادہ رنگین سرخیاں آنکھوں پر گراں گزرتی ہیں۔ البتہ اخبار کو خوبصورت بنانے کے لیے 'ہائی لائٹر' وغیرہ کو کلر کر سکتے ہیں۔ خبروں کے اہم نکات کو ہائی لائٹ کرنے کی تکنیک کا جاننا بھی ضروری ہے۔ صفحہ سازی کے وقت ایک ماہر صفحہ ساز الگ الگ فاؤنٹ اور واوین ('''') وغیرہ لگا کر 'ہائی لائٹر' کو اس قدر خوبصورت اور دیدہ زیب بنا دیتا ہے کہ قارئین کی اولین نظر انہی 'ہائی لائٹرز' کی طرف مبذول ہوجاتی ہے۔

یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خبروں کے صفحات، ادارتی صفحہ، میگزین اور اسپورٹ کے صفحات میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اگر اخبار کے تمام صفحات یکساں بنا دیے جائیں؛ تو اخبار کی جاذبیت ختم ہوجائے گی۔ اس لیے خبروں کے صفحات، ادارتی صفحہ، اوپیڈ، میگزین اور اسپورٹ کے صفحات میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ میگزین کے صفحات کی سرخیاں بہ قدر ضرورت رنگین کر سکتے ہیں، میگزین کے صفحات کا مواد (Matter) بھی رنگین کر سکتے ہیں، لیکن نیوز پیج کا میٹر رنگین کرنے کا رواج نہیں ہے۔ بقدر ضرورت ہائی لائٹر رنگین کر سکتے ہیں۔ کمپیوٹر پر صفحہ سازی کے وقت مذکورہ باتوں کا دھیان رکھنے سے صفحات کی خوبصورتی نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور ایسے اخبارات قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب

ہوجاتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل درج ذیل سطور میں ملاحظہ فرمائیں:

صفحہ اول بنانے کا طریقہ

ماسبق میں جن امور کا تذکرہ کیا گیا ہے؛ وہ صفحہ اول وآخر کو چھوڑ کر اخبار کے دوسرے صفحات بنانے سے متعلق ہیں۔ اگر اخبار کا صفحہ اول بنایا جارہا ہے تو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ صفحہ انتہائی خوبصورت ہو، جس کو دیکھ کر ہی قارئین کی دلچسپی اس کی طرف بڑھ جائے۔ صفحہ اول کی تیاری کے وقت پیج انچارج اور مدیر کی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ خبروں اور خبروں کی ترتیب کے اعتبار سے اس صفحے کو اس قدر خوبصورت اور دیدہ زیب بنایا جائے کہ قارئین کی توجہ اپنے آپ اس کی طرف مبذول ہوجائے۔ اس لیے کوشش ہونی چاہیے کہ یہ صفحہ دلکش اور خوبصورت نظر آئے۔ صفحہ اول بناتے وقت اس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس دن کی اہم ترین خبریں اس صفحے پر سجائی جائیں۔ یہ صفحہ چونکہ اس دن کے تازہ ترین حالات کا آئینہ ہوتا ہے، اس لیے خبروں کا انتخاب، تصاویر کا سلیکشن، بولتی ہوئی سرخیاں؛ قارئین کو یہ بتانے میں کامیاب ہوں گی کہ آج کون کون سے اہم واقعات رونما ہوئے ہیں اور کہاں کہاں کس کس طرح کے حالات پیش آئے ہیں۔ صفحہ اول کو اندرونی صفحات کا ترجمان مانا جاتا ہے۔ اس لیے دنیا کے تمام اخبارات کے مدیران صفحہ اول کو دلکش بنانے پر یقین رکھتے ہیں۔ کمپیوٹر کی وجہ سے یہ کام اب بہت آسان ہوگیا ہے۔ بس تھوڑی توجہ دی جائے اور اہم امور کو ذہن میں رکھتے ہوئے صفحہ تیار کیا جائے تو اپنے آپ صفحہ اول کے ساتھ ساتھ دوسرے صفحات دیدہ زیب نظر آئیں گے۔

صفحہ اول سے متعلق اہم نکات

صفحہ اول، اس کی پہلی خبر اور اس کی سرخی جسے 'شاہ' سرخی بھی کہتے ہیں؛ بہت ہی زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ عام طور پر اس کا فاؤنٹ 70/ سے 90/ کے درمیان رکھنا زیادہ مناسب ہے۔ ضرورت پڑنے پر اس سے بھی زیادہ رکھ سکتے ہیں۔ صفحے کی باٹم لیڈ (یعنی سب سے نیچے جو خبر لگائی جاتی ہے) اس کی سرخی 'شاہ' سرخی سے کم ہو لیکن صفحے کی دیگر تمام خبروں کی سرخیوں سے جلی سرخی اس باٹم لیڈ خبر کی ہو تو صفحہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ اس لیے صفحہ اول تیار کرتے وقت اس کا بھی خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ صفحہ اول کی سرخیوں کا فاؤنٹ دیگر صفحات کی سرخیوں کے فاؤنٹ سے نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تفصیل کی روشنی میں صفحہ اول کی سرخیوں کے فاؤنٹ میں دوچار فاؤنٹ کا اضافہ فی کالم کے اعتبار سے کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

نوٹ: صفحہ اول پر 'ہائی لائٹرز' وغیرہ کا خاص طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔

- ہائی لائٹر کا فاؤنٹ 15-13 کے آس پاس ہوتا ہے۔
- ہائی لائٹر میں لائٹ اسکرین کا بھی استعمال کرسکتے ہیں۔
- اگر کوٹیشن کو 'ہائی لائٹر' میں لے رہے ہیں تو شروع میں واوین (“ ”) جلی اور آخر میں واوین (“ ”) خفی کا استعمال کرنے سے خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ پھر جس کا قول نقل کیا گیا ہے، اس کا نام دوسرے فاؤنٹ میں لکھنا بہتر ہوتا ہے۔ یعنی میٹر کے فاؤنٹ سے جدا ہو تو زیادہ اچھا ہے۔
- صفحات پر خوبصورت سے خوبصورت تصاویر کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کی وجہ سے واقعات، حادثات اور حالات کی مناسبت سے اچھی تصویر کو صفحات پر سیٹ کرنا بے حد آسان ہوگیا ہے۔ صفحہ اول پر اہم تصاویر کو جگہ دی جاتی ہے۔
- صفحہ اول پر اندرونی صفحات کی اہم جھلکیاں اگر دی جائیں، تو قارئین کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے، ساتھ ہی صفحہ اول خوبصورت اور جامع بھی ہوجاتا ہے۔
- جس دن کا صفحہ تیار کیا جارہا ہے، اس دن کی اہم ترین خبر صفحہ اول کی پہلی خبر بنائی جائے۔
- اہم ترین خبر کا انتخاب مدیر کے لیے بہت بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ اس کے لیے پروفیشنل اداروں میں 'نیوز میٹنگ' کا سسٹم ہوتا ہے، جس میں ادارتی ٹیم کے فیصلے سے صفحہ اول کی پہلی خبر کا انتخاب ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ صفحہ اول کی خبروں کا انتخاب بھی ادارتی ٹیم ہی کرتی ہے۔

اخبار کا آخری صفحہ

صفحہ اول کے بعد اہمیت کے اعتبار سے بھی اور تجارتی نقطۂ نظر سے بھی اخبار کا آخری صفحہ اہم مانا جاتا ہے۔ عام طور پر آخری صفحہ کھیلوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ قارئین کی دلچسپی اس صفحے کی طرف بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ صفحہ تیار کرتے وقت بھی بہت ہی زیادہ دھیان دینے ضرورت پڑتی ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر اس صفحے پر خوبصورت سے خوبصورت تصاویر کا استعمال اس کی جاذبیت میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ اس صفحے کے مختلف مواد کی سیٹنگ کے موقعے پر صفحہ سازی کی تکنیک کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے۔ واوین، کوٹیشن، ہائی لائٹرز، اسکور بورڈ، مختلف اسٹائل کی تصاویر، نمایاں سرخیاں وغیرہ صفحے کو خوبصورت بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے صفحہ اول کی طرح اسے بھی جاذب نظر بنانے پر خاص توجہ دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

فاؤنٹ کا استعمال

- متن اور سرخی میں صرف اور صرف نوری نستعلیق خط کا استعمال کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔
- باکس کی سرخی میں 'بامبے بلیک' یا 'امیر' کا استعمال ہوسکتا ہے۔
- کسی کا قول نقل کرنے کے بعد آخر میں اس کا نام امیر میں دینا بہتر ہے، جبکہ اس کا عہدہ وغیرہ نوری نستعلیق یا پھر بتول میں دے سکتے ہیں۔

تصویر سے متعلق اہم امور

تصویر کسی بھی اخبار کی جان ہوتی ہے۔ یہ قول بہت ہی مشہور ہے کہ تصویر کبھی جھوٹ نہیں بولتی ہے۔ کمپیوٹر کے اس دور میں خوبصورت سے خوبصورت تصویر کا رواج بہت عام ہوچکا ہے۔ کمپیوٹر کی وجہ سے تصویر کی سیٹنگ میں بہت آسانی بھی ہوگئی ہے، اس لیے اگر ایک مدیر تھوڑی مہارت کا مظاہرہ کرے تو تصویر کے ذریعے قارئین تک آسانی سے بات پہنچا سکتا ہے۔ اخبار میں الفاظ اور تصاویر کا رشتہ بہت ہی قدیم ہے اور اس میں رفاقت بھی پائی جاتی ہے۔ تمام قارئین چاہتے ہیں کہ اخبار میں خبروں سے متعلق اہم تصاویر ہوں۔ تصویر کا سائز، تصویر کا موضوع، تصویر کا رنگ اور تصویر کا کیپشن وغیرہ قارئین کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ تصویر کے موضوعات مختلف ہوتے ہیں۔ سائنسی ایجادات، حادثات، قدرتی آفات؛ جیسے سیلاب، طوفان، سونامی، زلزلہ اور آتشزدگی وغیرہ۔ ان کے علاوہ سافٹ نیوز کی طرح سافٹ تصاویر بھی ہوتی ہیں۔ جیسے اہم تقریبات، کھیل کود ودیگر تفریحات، موسیقی، ڈرامہ، مقامی جلسے جلوس، سیمنار، کانفرنس، مظاہرے اور ہڑتال وغیرہ کسی بھی موضوع کی تصویر ہوسکتی ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں تصاویر کا موضوع ہوسکتی ہیں۔

تصویر کو صفحے پر سیٹ کرنا اپنے آپ میں ایک فن ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کس طرح صفحے پر تصویر کو سیٹ کرنے سے صفحہ خوبصورت ہوسکتا ہے۔

تصاویر کیسے سیٹ کریں؟

- ہر صفحے پر ایک لیڈ فوٹو ہونا چاہیے۔ یعنی صفحے کی اہم ترین تصویر کا ہونا ضروری ہے۔ بقیہ تمام تصاویر اس سے چھوٹی ہوں گی۔
- تصویر صفحے کے بالکل بیچوں بیچ جہاں سے اخبار کو درمیان سے فولڈ کیا جاتا ہے؛ وہاں قطعی نہ لگائیں۔

اس لیے کہ اخبار فولڈ ہوتے ہی اس جگہ پر لگی تصویر بدنما ہوجاتی ہے اور بسا اوقات اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ یعنی تصویر لگانے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

- صفحے پر تصویر کے بالکل نیچے تصویر نہ لگائی جائے۔ کچھ نہ کچھ فاصلہ ضرور رکھا جائے۔
- تصاویر چھوٹی بڑی استعمال کی جائیں۔ ایک سائز کی تصویر سے صفحہ بھدا نظر آتا ہے۔
- تصاویر کی سرخیاں لگانے کا رواج تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے کوشش کریں کہ سرخیوں کی بجائے کیپشن سے کام چلائیں۔
- ایسی تصاویر کا انتخاب کیا جائے جن سے حالات، واقعات یا حادثات وغیرہ کی نشاندہی ہو۔
- خبروں کے ساتھ لگائی جانے والی تصویروں کی سیٹنگ ایسی کی جائے، جس سے خبر کی دلکشی میں اضافہ ہو۔
- نئے زاویے سے لی گئی تصویر کو اگر صفحے پر جگہ دی جاتی ہے تو اس کی بات ہی کچھ اور ہوگی۔
- تصویر میں رنگوں کا فرق بھی نمایاں ہونا ضروری ہے۔ کسی تصویر میں مجمع کو دکھانا مقصود ہوتا ہے اور کسی میں خاص منظر کو، تو اسی اعتبار سے تصویر کو سیٹ کریں۔ مثلاً مظاہرے میں مجمع کو دکھایا جاتا ہے، جبکہ کسی حادثے کے بعد زار و قطار روتے ہوئے لوگوں یا بچوں کو، تو تصویر سیٹ کرتے وقت اس کا بھی خیال رکھا جانا چاہیے۔
- تصویر ایسی ہو جس کو دیکھتے ہی نوعیت کا پتہ چل جائے۔
- تصویر کا کیپشن واضح الفاظ میں لکھیں۔ اگر کوئی واقعاتی تصویر ہے تو اس کا کیپشن ضرور لکھیں۔ اگر تفصیل کی ضرورت محسوس کریں تو اس سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔
- 'نیوز فیچر' کے ساتھ لگائی جارہی تصاویر میں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ فیچر میں دی گئیں تفصیلات سے ان تصاویر کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہو۔ قدیم تصویریں بھی کبھی کبھی بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ اگر متعدد تصاویر ایک ساتھ لگائی جارہی ہیں تو ہر ایک کا کیپشن ضرور لکھیں اور نمبر شمار دے کر ان کی وضاحت کریں۔ عید، محرم، یوم جمہوریہ اور یوم آزادی وغیرہ تقاریب کی متعدد تصاویر لگائی جاتی ہیں۔ لہٰذا تصاویر کی سیٹنگ اس انداز میں کی جائے کہ صفحہ خوبصورت اور دلکش نظر آئے۔

> **صفحہ اول سے آخر تک یکسانیت، جاذبیت، کمپیوٹر تکنیک کا ماہرانہ استعمال اخبار کو خوبصورت بناتا ہے۔ جو لوگ اس پیشے سے جڑے ہیں؛ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذکورہ امور کا دھیان دیں اور اپنے اخبار کو قارئین کی پہلی پسند بنانے کے لیے اسے خوبصورت سے خوبصورت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کریں۔**

مواد (Matter) کا فاؤنٹ

- خبروں، مضامین اور مراسلات کے مواد کا فاؤنٹ 10.5 سے 11.5/ کے درمیان معیاری اور بہتر ہوتا ہے۔ عام طور پر اردو اخبارات میں 10.5 سے 11/ کے درمیان فاؤنٹ کا استعمال ہوتا ہے۔
- اخبار کی ہر خبر کا فاؤنٹ یکساں رہنا ضروری ہے۔ اس کے لیے خبروں کو ایڈٹ کرنے کی ضرورت محسوس کریں؛ تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے اخبار مجموعی طور پر اچھا نہیں لگے گا۔ کالم کے اعتبار سے خبریں چھوٹی بڑی ضرور کر لی جائیں لیکن فاؤنٹ چھوٹا بڑا نہ کیا جائے۔ اگر کسی کالم میں خبر کی چند سطریں اضافی ہیں تو ایڈٹ کر دیں، اگر چند سطریں کم ہیں تو بڑھا دیں، لیکن فاؤنٹ سے سمجھوتہ نہ کریں، تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس لیے کہ خبریں چھوٹی بڑی کی جاسکتی ہیں، اس سے خبر کی جامعیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، البتہ فاؤنٹ کو چھوٹا بڑا کیا گیا تو تمام صفحات الگ الگ نظر آئیں گے، جس سے اخبار کے 'لے آؤٹ' پر منفی اثر پڑے گا۔ کچھ لوگ خبروں کا کالم نیچے کی طرف گرا دیتے ہیں یا اوپر کی طرف اٹھا دیتے ہیں؛ یہ بھی درست نہیں ہے۔ اس سے بھی لے آؤٹ پر اثر پڑتا ہے اور صفحات کی دلکشی متاثر ہوتی ہے۔
- تصاویر کے کیپشن کا فاؤنٹ خبروں کے مواد سے کچھ کم رکھنا زیادہ بہتر ہے۔ مثلاً اگر آپ خبروں کا فاؤنٹ 11/ رکھ رہے ہیں تو کیپشن کا فاؤنٹ 10.5/ رکھیں۔
- اداریے کا فاؤنٹ نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔ لھذا خبروں کے فاؤنٹ کو دھیان میں رکھتے ہوئے اداریے کا فاؤنٹ کچھ بڑا رکھا جانا چاہیے۔
- قطعہ کا فاؤنٹ بہت نمایاں ہوتا ہے۔ 14/ سے 16/ کے درمیان رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

مضامین، اداریے اور مراسلات سے متعلق اہم امور

- مضامین کی سرخیوں کا فاؤنٹ بھی کالم کے اعتبار سے ہوتا ہے، البتہ خبروں سے اس کا فاؤنٹ جدا ہوتا ہے۔ مضامین اور مراسلات کے میٹر کا فاؤنٹ خبروں کے فاؤنٹ کے برابر ہوتا ہے۔ مضامین میں السٹریشن، تصاویر، ہائی لائٹر وغیرہ کا استعمال صفحے کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔
- تمام اخبارات میں مضامین کی سرخیوں کا اسٹینڈرڈ فاؤنٹ متعین ہوتا ہے۔ عام طور پر مضامین کی سرخیوں کا فاؤنٹ 50/ سے 60/ کے درمیان ہوتا ہے۔
- اداریے کی سرخی کا فاؤنٹ عام طور پر 20 سے 25 کے درمیان رکھا جاتا ہے۔ ہاں اداریے کا فاؤنٹ خبروں کے فاؤنٹ سے نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔

کارٹون کی سیٹنگ:

قومی سطح کے اردو، ہندی اور انگریزی کے اخباروں میں کارٹون کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ عام طور پر صفحہ اول یا ادارتی صفحے پر کارٹون کو جگہ ملتی ہے۔ کارٹون کو نمایاں کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے آس پاس کوئی تصویر یا رنگین میٹر یا ہائی لائٹر نہ لگایا جائے۔ کسی بھی اہم موضوع پر کارٹون طنز کا کام کرتا ہے۔ یہ اپنے آپ میں بہت سے امور کو سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس لیے اسے ادارتی صفحے پر عام طور پر شائع کیا جاتا ہے۔ قارئین کی نظر کارٹون پر چلی جائے؛ اس کے لیے اس کے پلیسمنٹ پر خاص توجہ دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

مجموعی طور پر اخبار کا ہر صفحہ بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ صفحہ اول سے آخر تک یکسانیت، جاذبیت، کمپیوٹر تکنیک کا ماہرانہ استعمال اخبار کو خوبصورت بناتا ہے۔ جو لوگ اس پیشے سے جڑے ہیں؛ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذکورہ امور کا دھیان دیں اور اپنے اخبار کو قارئین کی پہلی پسند بنانے کے لیے اسے خوبصورت سے خوبصورت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کریں۔

■

Dr. Afzal Misbahi
Asst. Prof. & Section Incharge of Urdu
M M V, Banaras Hindu University
Varanasi- 221005 (UP)
Mob.: 9810358883

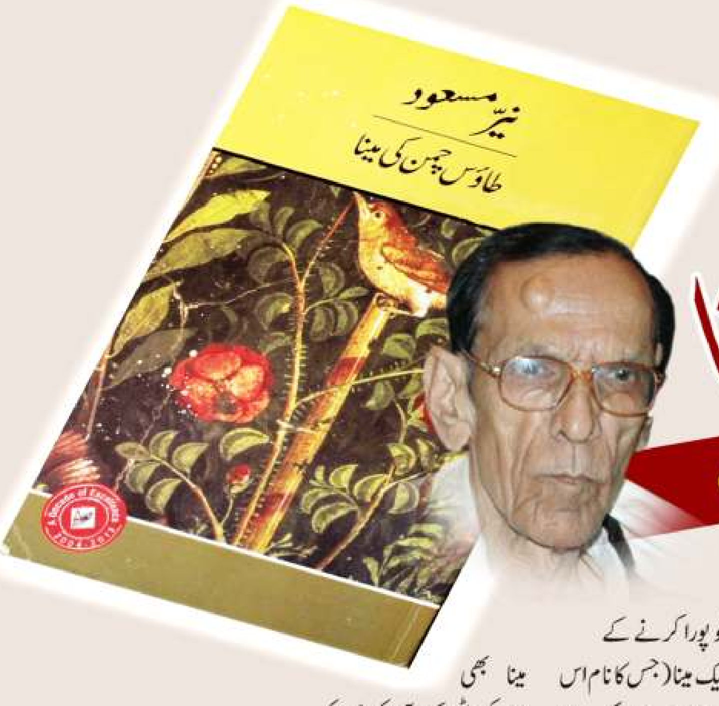

حسینہ خانم

طاؤس چمن کی مینا

جذباتی رشتوں کا پراثر بیانیہ

اردو فکشن میں ایک ممتاز حیثیت رکھنے والے نیر مسعود کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ نیر مسعود افسانے کے فن پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ان کے یہاں جملوں کی ساخت اور مکالموں کی ادائیگی میں فنی چابکدستی نظر آتی ہے۔ ان کے بعض افسانے یوں تو عام قاری کی سمجھ سے بالاتر ہیں،اس کے برعکس طاؤس چمن کی مینا کی ترسیل عام قاری تک ہو جاتی ہے۔ تاریخی واقعات کو افسانے کے فن میں سمو کر اس طرح پیش کر دینا کہ کہانی کہانی نہ لگ کر اس پر حقیقت کا گمان ہونے لگے یہ افسانے کی کامیابی کی دلیل ہے۔

افسانہ ’طاؤس چمن کی مینا‘ ہندوستانی تاریخ وتہذیب کے تاریک پس منظر میں اپنی کہانی کو پیش کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار اور راوی کالے خاں پوری کہانی کو صیغۂ واحد حاضر میں بیان کرتا ہے۔کہانی کالے خاں کی زندگی سے شروع ہوتی ہے۔کالے خاں کی بیوی انتقال کے وقت اپنی معصوم سی ننھی بچی جس کا نام فلک آرا ہے، چھوڑ جاتی ہے۔بیوی کی بے وقت دائمی جدائی سے کالے خاں کے اعصاب پر بہت برا اثر مرتب ہوتا ہے اور وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔اسی پریشانی کے عالم میں اسے اِدھر اُدھر بے مقصد گھومتا دیکھ کر شاہی جانوروں کے داروغہ نبی بخش نے اس پر رحم کھا کر قیصر باغ کے طاؤس چمن میں ملازمت دلا دی۔ زندگی میں سکون میسر آتا ہے تو وہ اپنی بچی فلک آرا کی طرف ملتفت ہوتا ہے۔ بچی اس سے پہاڑی مینا لانے کی ضد کرتی ہے،لیکن کالے خاں کی معاشی پریشانی اسے بچی کی ضد پوری کرنے سے روکتی ہے۔کیوں کہ بیوی کی وفات کے بعد بے روزگاری کے سبب وہ قرض میں ڈوب چکا تھا چنانچہ تنخواہ کا بیشتر حصہ قرض کی ادائیگی کی نذر ہو جاتا تھا۔اسی درمیان اسے اطلاع ملی کہ سلطان عالم طاؤس چمن کے لیے ایک ایجادی قفس بنوا رہے ہیں، جس میں پرندے رکھے جائیں گے۔ ایجادی قفس تیار ہو جاتا ہے اور اس میں چالیس پہاڑی مینائیں رکھی جاتی ہیں۔ادھر کالے خاں کی بچی کا مینا لانے کا اصرار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔کالے خاں سوچتا ہے کہ قفس میں کل چالیس مینائیں ہیں جن کا شمار کرنا مشکل ہے کہ پوری چالیس ہیں یا ایک کم۔لہٰذا بچی کی معصومانہ خواہش کو پورا کرنے کے لیے کالے خاں ایجادی قفس سے ایک مینا (جس کا نام اس کی بچی کے نام پر فلک آرا تھا) چرا لاتا ہے۔چوں کہ یہ مینا کالے خاں کی بچی کی ہم نام تھی اس لیے کالے خاں کو مینا سے پہلے ہی سے انسیت ہوگئی تھی۔ایک روز سلطان عالم ایجادی قفس کی طرف چلے آتے ہیں اور میناؤں کی طرف دیکھ کر محسوس کرتے ہیں کہ فلک آرا دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ وہ داروغہ نبی بخش سے سوال کرتے ہیں، داروغہ انھیں بتاتا ہے کہ وہ ان ہی میناؤں میں کہیں چھپی ہوگی۔سلطان عالم مطمئن ہو کر واپس چلے جاتے ہیں مگر کالے خاں کا چین وسکون غارت ہو جاتا ہے اور بے چینی سوار ہو جاتی ہے۔ وہ مینا فلک آرا کو گھر سے لا کر ایجادی قفس میں ڈال دیتا ہے اور کسی کو خبر نہیں ہو پاتی کہ فلک آرا کالے خاں کے گھر رہ کر آئی ہے اور جب فلک آرا مینا کالے خاں کے گھر تھی تو کالے خاں کی بیٹی اسے روز پڑھایا کرتی تھی۔

ایک روز سلطان عالم پورے اہتمام سے کچھ انگریزوں کو اپنے ساتھ ایجادی قفس اور اپنی میناؤں کے کرتب دکھانے لاتے ہیں اور ان کے ساتھ پرندوں کو پڑھانے والے میر داؤد بھی ہیں جنھوں نے ان میناؤں کو گانے کی تعلیم دی ہے۔ جب سلطان عالم قیصر باغ میں تشریف لاتے ہیں تو مینائیں میر داؤد کے پڑھائے ہوئے اشعار گاتی ہیں لیکن دیگر میناؤں کے برخلاف فلک آرا مینا کالے خاں کی بیٹی کے پڑھائے ہوئے بول گاتی ہے۔سلطان عالم ناراض ہو جاتے ہیں اور یہ راز ظاہر ہو جاتا ہے کہ مینا ایجادی قفس سے باہر لے جائی گئی ہے۔ کالے خاں کو ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے اور مقدمہ چلانے کی کارروائی ہوتی ہے۔ داروغہ کی رہنمائی سے کالے خاں اپنا مکمل احوال سلطان عالم تک پہنچاتا ہے۔سلطان عالم اس کا قصہ سن کر اسے معاف کر دیتے ہیں اور وہ پہاڑی مینا بھی اس کی بیٹی فلک آرا کو (مینا کو گانا سکھانے کے عوض) نواز دیتے ہیں۔ کہانی یہاں پوری ہوتی نظر آتی ہے اور لگتا ہے کہ یہیں اختتام پذیر ہے مگر ایسا نہیں ہوتا اور کہانی میں یہیں سے پیچیدگی پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔ مذکورہ مینا کے بول ایک انگریز کو پسند آ جاتے ہیں اور وزیر اعظم اس انگریز سے اس مینا کو دینے کا وعدہ کر لیتے ہیں۔ ہر چند کہ وزیر اعظم کا فیصلہ سلطان عالم کے فیصلے کے آگے نہیں چل سکتا تھا پھر بھی کسی حیلے بہانے سے وہ مینا کالے خاں سے حاصل کر کے انگریز کو نذر کرنے کا من بنا چکے تھے۔ مگر داروغہ نبی بخش اور کالے خاں نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح کا کوئی واقعہ ہو جس سے سلطان عالم کو رنج پہنچے۔ چنانچہ نبی بخش کے کہنے کے مطابق وہ مینا اور فلک آرا کو کہیں اور لے جاتے ہیں۔ ادھر اپنے منصوبے پر پانی پھرتا دیکھ کر وزیر اعظم کالے خاں کو قید کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد لکھنؤ پر انگریزوں کا تسلط ہو جاتا ہے اور بہت سے قیدی رہا کر دیے جاتے ہیں۔ وہ جیل سے باہر آتا ہے تو لکھنؤ کا نقشہ بدلا ہوا ہے، سلطان عالم قید کر کے جلا وطن کر دیے گئے ہیں۔وہ اپنی بیٹی فلک آرا کے پاس جاتا ہے۔ جو اس کی گود میں بیٹھ کر اس پہاڑی مینا کے قصے بیان کرنے لگتی ہے۔ یہاں پر افسانہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

نیر مسعود کی کہانی ’طاؤس چمن کی مینا‘ میں تاریخ کے بدترین سانحے کا ذکر ہے، جسے بہت سے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے اپنے اپنے طریقے سے اپنی تخلیق میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر جس طرح نیر مسعود نے ایک ایجادی قفس اور پہاڑی مینا کے حوالے سے اُس پورے منظر نامے کی تصویر کشی کی ہے اس سے وہ پورا تاریخی عہد ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے جیتا جاگتا نظر آتا ہے اور کچھ وقت کے لیے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ کی

اسی شگفتہ، شائستہ اور مہذب فضا میں سانس لے رہا ہے۔

دوسری بات جو قاری کو متوجہ کرتی ہے وہ یہ کہ عیش و آرام میں ڈوبے ہوئے پرتکلف زندگی کے عادی اہل اقتدار جس قدر تعیش پسندی اختیار کیے ہوئے تھے اور آرائش و زیبائش پر زور دیتے تھے، اگر امورِ حکومت میں اپنی عملی صلاحیت دکھاتے تو انگریزوں کے ہاتھوں وہ ہزیمت نہیں اٹھانی پڑتی، جس کی مثال وہ بڑا پنجرا ہے جس میں چالیس مینا بیک ساتھ پھدک سکتی تھیں، جس پر سونے کے تاروں کا کام ہوا تھا۔ بڑے پنجرے میں رکھنے کے لیے چالیس مینا لائی جاتی ہیں، بادشاہ سلامت آتے ہیں اور ایک ایک پنجرا اٹھا کر اس کی مینا کی حرکات و سکنات بغور دیکھتے ہیں، پھر اس مینا کا نام رکھ کر پنجرا رکھ دیتے ہیں۔ پھر دوسرا پنجرا ان کے سامنے لایا جاتا ہے اور وہ اسی طرح ایک ایک کرکے چالیس مینا ان کے سامنے لائی جاتی ہیں، وہ سب کا نام رکھتے ہیں۔ پھر وہ ساری مینائیں بڑے پنجرے یعنی ایجادی قفس میں چھوڑ دی جاتی ہیں، جہاں ان کے پھدکنے کے لیے کافی جگہ تھی۔ اقتباس دیکھیں:

''..... ملازم نے پہلا پنجرا بڑھایا..... بادشاہ نے پنجرا ہاتھ میں اٹھالیا۔ مینا پنجرے میں اِدھر اُدھر پھدک رہی تھی۔ بادشاہ نے ہنس کر کہا:

''ذرا قرار تو لو چلبلی بیگم!'' اور پنجرا واپس میز پر رکھ دیا۔

ایک مصاحب نے پنجرا اٹھا کر دوسرے مصاحب کو دیا..... میز پر دوسرا پنجرا آ گیا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھی ہاتھ میں اٹھایا۔ اس کی مینا اڈے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بادشاہ نے اسے ہلکی سی چمکاری دی تو اس نے اور زیادہ سر جھکالیا۔ بادشاہ نے کہا:

''اے بی، صورت تو دیکھنے دو۔'' پھر پنجرا میز پر رکھ کر بولے، ''یہ حیادار دلہن ہیں۔''

پھر یہ پنجرا میرے پاس آیا اور میں نے حیادار دلھن کو بھی قفس میں پہنچادیا۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک مینائیں بادشاہ کے پاس آتی رہیں اور وہ ان کے نام رکھتے رہے۔ کسی کا نام نازک قدم رکھا کسی کا آہو چشم،........''

جب بادشاہ کئی دنوں کے بعد باغ میں تشریف لاتے ہیں تو میناؤں کے پنجرے کے پاس رک کر انھیں دیکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ 'فلک آرا' نظر نہیں آرہی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ دوسری بار کی سیر میں بادشاہ کو چالیس میناؤں کے نام یاد رہتے ہیں، ان کی صفات سے واقف بھی ہوجاتے ہیں اور متحرک میناؤں میں فلک آرا کی کمی بھی محسوس کرلیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیں:

''بھئی نبی بخش، آج فلک آرا نہیں دکھائی دے رہی ہیں۔''

.........داروغہ نے کہا:

''جہاں پناہ، کہیں ٹہنیوں میں چھپ گئی ہیں۔ ابھی تو سارے میں اڑتی پھر رہی تھیں۔''

بادشاہ دھیرے سے ہنسے اور بولے:

''ہم سے شرما تو نہیں رہی ہیں؟ اور انھیں دیکھو، حیادار دلھن کو، کیسی چہلیں کررہی ہیں۔ بھئی حیادار دلہن، یہی تمھارے لچھن رہے تو ہم تمھارا نام بدل کر شوخ ادا رکھ دیں گے۔''

مذکورہ اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا' کا یہ حصہ داستانوی قصے کہانیوں سے مشابہت رکھتا ہے جسے نیر مسعود نے قصداً اس طرح کا بیانیہ رخ دیا ہے۔ ایجادی قفس پر جس طرح سونے کے تاروں کا کام ہوا، جس قدر اس کی سجاوٹ پر خرچ کیا گیا اور جتنی توجہ بادشاہ کی اس قفس اور اس کی میناؤں پر تھی، یہ سب واقعے اس بات کے عکاس ہیں کہ اس وقت انگریز ہندوستان کے سیاسی افق پر پوری طرح قابض ہوچکے تھے، اقتدار و اختیار کے مالک بن چکے تھے اور اس وقت ہند کے بادشاہ اور نوابین مجبور محض ہوچکے تھے، ان کے پاس دل بہلانے اور اپنے آپ کو اس طرح کی تفریحات میں محو رکھنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

کہانی پڑھنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کا راوی لکھنؤ کا دلدادہ ہے۔ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد وہ لکھنؤ کی گلیوں میں بے مقصد مدتوں گھومتا رہا اور پھر قیصر باغ کے چڑیا گھر میں ملازمت مل جاتی ہے۔ ملازمت کے مل جانے اور مینا کے چوری ہونے اور کالے خاں کی گرفتاری، اس پورے منظر نامے میں راوی (کالے خاں) جیل میں اپنی زندگی کے دن گزار رہا ہے اور اپنی رہائی کی تدبیریں اپنے ذہن میں بناتا رہتا ہے اور ایک دن اچانک وہ رہا ہوجاتا ہے۔ جیل سے باہر آنے پر اسے ساری فضا بدلی بدلی نظر آتی ہے۔ سارے عالم پر سوگواریت چھائی ہوئی ہے۔ سارا لکھنؤ اداسی میں غرق نظر آتا ہے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں دلی پر قابض ہوچکے تھے، اس کے بعد انھوں نے لکھنؤ کو اپنا نشانہ بنایا۔ نواب واجد علی شاہ کو جلاوطن کرکے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ یہ سارا منظر دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ پھر بھاگ کر قید خانے میں قید ہوجائے کیونکہ اب اسے اپنی آزادی سے زیادہ قید خانے کی زندگی ہی اچھی معلوم ہورہی تھی کہ اب زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ ہندوستان کے خوبصورت پاؤں میں غلامی کی بدنما زنجیر پڑتے ہی کروڑوں ہندوستانیوں کی زندگی بے رنگ، ان کا مستقبل تاریک اور ان کی بدنصیبی کا اعلان ہوگیا ہے اور اس عظیم ہندوستان پر ایک غیر قوم تسلط جما چکی ہے اور ایک نو آبادیاتی نظام ہندوستانیوں کے سر پر جبراً مسلط کیا جاچکا ہے۔ انگریزوں نے آتے ہی ہندوستانیوں پر ظلم و جبر اور قہر کے جو پہاڑ توڑے کسی قیامت سے کم نہ تھے۔ ان کی قہر سامانیوں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہوچکے ہیں۔

غلام ہندوستان پر ڈھائے گئے ظلم و بربریت، قتل و غارت گری، تباہی و بربادی اور شکست و ریخت پر لکھے گئے افسانوں اور ناولوں میں افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا' ایک نئے باب کا در وا کرتا ہے۔ مرکزی کردار کالے خاں اور ایجادی قفس اور مینا کے حوالے سے ہندوستان کی قدیم تہذیب اور اس تہذیب کے پاس دار انسانیت کے علمبردار عظیم الشان حکمران کے ذریعے نیر مسعود نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے، اس سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ افسانے کے آغاز سے اختتام تک اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔

دوسری طرف کالے خاں کا مرکزی کردار جو افسانے کے وحدتِ تاثر کو قائم رکھتا ہے۔ بحیثیت باپ اس سے جو کام نیر مسعود نے لیا وہ قاری کے ذہن پر دیرپا نقش چھوڑتا ہے۔ حالات کا ستم رسیدہ ایک شخص جس کی زندگی کی رمق ماند پڑگئی ہو، جو معاشی اور دلی طور پر بالکل کنگال ہوچکا ہو اور جس کی نظر میں زندگی اور موت میں فرق نہ رہ گیا ہو، اس کے جینے کا سہارا صرف اس کی معصوم بچی فلک آرا تھی۔ دیکھا جائے تو اس افسانے کی روح وہ بچی ہی ہے۔ اسی کے دم سے کہانی کا جذباتی ماحول برقرار رہتا ہے۔ کہانی کے کینوس کو تسلسل کے ساتھ جذباتی طور پر وسعت دینے میں اس بچی کا کردار سب سے اہم ہے۔

کالے خاں اور اس کی بچی فلک آرا کہانی کے وہ علامتی کردار ہیں جو صرف اسی دور ہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں ہمیں حقیقی زندگی میں بھی نظر آئیں گے۔ نیر مسعود کے اس افسانے کے پس منظر کو ہمارے ناقدین اور مبصرین بھلے ہی ہندوستان کے اس تاریخی سانحے سے جوڑ کر دیکھیں لیکن کالے خاں اور اس کی بچی فلک آرا کی شکل میں انسان کے حقیقی اور جذباتی رشتوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جو سخت و نازک ترین حالات اور مایوسی کے عالم میں بھی جینے کا سبب اور سہارا ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیر مسعود نے اس افسانے میں کالے خاں اور فلک آرا کے کردار کو حقیقی رشتوں کی ان اٹوٹ زنجیر کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے جس کے دم پر انسان تمام مصائب و آلام کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

■

Dr.Hasina Khanam
Ibra Hostel, Near: Aisha Tarin School
Lal Diddi
Aligarh- 202002 (U.P.)
Mob: 6307074632
Email:drhasinakhanam2020@gmail.com

ریاض احمد نجار

نیّر مسعود کی خاکہ نگاری 'ادبستان' کے حوالے سے

نیر مسعود کی پیدائش 16 نومبر 1936 کولکھنؤ میں ہوئی۔ وہ اردو کے ایسے قلمکار گزرے ہیں جنھوں نے ادب کے جس کسی میدان میں پرواز کی اس میں اپنا سکہ منوایا۔ انھوں نے جہاں تحقیق، تنقید، افسانہ، سوانح، تراجم، سفرنامہ کے میدان میں اپنا تخلیقی جوہر دکھایا ہے وہیں ان کی تخلیقی مہارت کا اندازہ ان کے خاکے 'ادبستان' سے بھی ہوتا ہے۔ 'ادبستان' نام کا یہ مجموعہ 2006 میں پہلی بار کراچی سے شائع ہوا۔ یہ کتاب 12 خاکوں پر مشتمل ہے۔ ان کے اس اہم کارنامے کا جائزہ لینے سے پہلے خاکہ نگاری کے فن پر روشنی ڈالنا لازمی ہے۔

اردو ادب میں داستان، ناول، افسانہ، انشائیہ اور ڈرامے کی طرح خاکہ نگاری بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو بھی اہم صنف کے طور پر شمار کیا جاتا ہے۔ خاکہ ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت سے انگریزی ادب کے زیر اثر وجود میں آیا۔ انگریزی میں اس کے لیے Sketch اور Pen Portrait جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں مگر اردو میں اس کے لیے خاکہ ہی موزوں لفظ ہے۔ اگر چہ قلمی تصویر، مرقع کشی یا شخصی مرقع جیسے الفاظ بھی اس کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر خاکہ اس کا اصل ترجمان ہے۔ اس ضمن میں نثار احمد فاروقی یوں رقمطراز ہیں:

''اسکیچ کے لیے اردو میں خاکہ نگاری، مرقع، قلمی تصویر، وغیرہ اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ان میں خاکہ سب سے موزوں ہے کیونکہ اسکیچ کا پورا مفہوم اسی لفظ سے ادا ہوتا ہے۔''

(درو دریافت، نثار احمد فاروقی، آزاد کتاب گھر گلاب محل، دہلی، 1964، ص 18-17)

اگر خاکہ نگاری کے فن کی بات کی جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا براہ راست تعلق شخصیت سے ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں کسی شخصیت کے اہم اور نمایاں پہلوؤں کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں دلچسپی پیدا ہو۔ خاکہ نگار اپنے ذاتی تجربات اور فنکاری سے متعلقہ شخصیت کی تصویر سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔ غرض خاکہ نگار اپنے کمال فن سے الفاظ کے ذریعے کسی شخصیت کی مصوری کرتا ہے اور قاری کے ذہن میں اس شخص کی تصویر نقش کرتا ہے جس سے اس کے ظاہری و باطنی اوصاف واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ خاکہ نگاری کے فن کے سلسلے میں مختلف ماہرین ادب نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ جن میں دو یوں ہیں:

''محمد حسین لکھتے ہیں کہ نوکِ قلم کی تصویر کشی خاکہ نگاری ہے۔ نثار احمد فاروقی نے لکھا کہ خاکہ کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے۔''

(اردو ادب میں خاکہ نگاری، صابرہ سعید، حیدرآباد، 1978، ص 62)

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ فن خاکہ نگاری الفاظ کے ذریعے یا الفاظ کے وسیلے سے کسی شخصیت کی تصویر کشی اس انداز میں کرنے سے متعلق ہے کہ اس کا ظاہر و باطن قاری کے ذہن میں نقش فی الحجر کی طرح منقش ہو جائے اور اس کی خاطر خواہ تعریف بھی ہو جائے۔

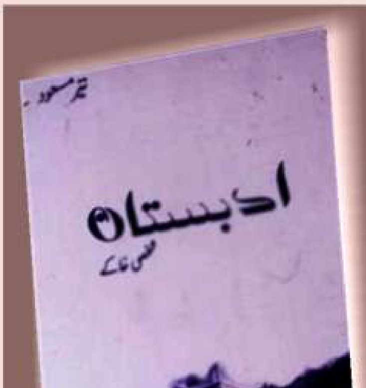

خاکوں کا مجموعہ 'ادبستان' میں نیر مسعود نے جن شخصیات اور یادوں کا نقشہ کھینچاھے وہ تمام اشخاص ان کے والد کے ساتھ گھر کی نشستوں میں پابندی سے شریک رہتے تھے۔نیر مسعود کو ان خاکوں کی کتابی شکل میں اشاعت کے وقت یہ احساس ہو گیا تھا کہ شمس الرحمن فاروقی، محمود ایاز اور عرفان صدیقی کے خاکوں میں اضافے کی گنجائش ھے لیکن بدقسمتی سے فالج کے حملے نے انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا.

خاکوں کا مجموعہ 'ادبستان' میں نیر مسعود نے جن شخصیات اور یادوں کا نقشہ کھینچا ہے وہ تمام اشخاص ان کے والد کے ساتھ گھر کی نشستوں میں پابندی سے شریک رہتے تھے۔ نیر مسعود کو ان خاکوں کی کتابی شکل میں اشاعت کے وقت یہ احساس ہو گیا تھا کہ شمس الرحمٰن فاروقی، محمود ایاز اور عرفان صدیقی کے خاکوں میں اضافے کی گنجائش ہے لیکن بدقسمتی سے فالج کے حملے نے انھیں ایسا

کرنے سے باز رکھا۔اس مجموعے کا پہلا خاکہ 'رشید حسن خان' کی قدآور شخصیت کے متعلق ہے۔رشید حسن خان کی تحریر کا جو خاص وصف ہے وہ ان کی عبارت آرائی ہے جو ان کی شخصیت کو روکھا اور بے رنگ ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔نیر مسعود نے ان کے اسی وصف کو ابھارا بھی ہے جس سے خاکے میں نہ صرف دلچسپی بڑھی بلکہ لطف کی فضا بھی قائم ہوئی ہے۔ان کے خطوط کے اقتباسات سے اس خاکے کی شروعات ہوئی جس میں ان کا شکایتی اور اپنے گردو پیش سے ناامیدی کا احساس کچھ اسی انداز کے جملوں میں ابھرتا ہے جو تلخ مگر ادائیگی کی سطح پر دلکش دکھائی دیتا ہے۔ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''جلسہ سات بجے ہے۔اگر آپ کچھ پہلے آجائیں تو خوب ہو... خدا جانے کیسے کیسے ہونقوں کا وہاں دیدار ہوگا اور کون کون غلام صورت بقال سیرت براجمان ہوگا! ابھی سے گھبرا رہا ہوں۔''

(نیر مسعود، ادبستان (خاکوں کا مجموعہ)، کراچی، 2006، ص6)

نیر مسعود نے رشید حسن خان کی شخصیت کو حقیقت کی عینک سے دیکھا ہے۔خاکے میں ان کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔خاکے میں ادبی لوگوں کی مصروفیت مثلاً سمینار، مشاعروں، ادبی محفلوں اور مجالس سے ان کی وابستگی کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو ان کا شریک کار سمجھ کر متن سے محظوظ ہوتا ہے۔میرے خیال میں یہی نمایاں خصوصیت ان کے خاکے کا جوہر ہے۔

سمینار کی جھلکیاں اور مزاج کی نرمی اور گرمی بھی ان خاکوں کی جان ہے۔نیر مسعود کے خاکے شخصیات کے تنقیدی رویوں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں۔ان کے خاکے اردو کا قیمتی خزینہ ہیں جن میں ایسی حقیقتیں عیاں ہوتی ہیں جو ہزاروں کتابیں کھنگالنے پر بھی نظر نہیں آسکتیں۔ذاتی زندگی میں انسان کس طرح کے اخلاق و کردار کا مظاہرہ کرسکتا ہے اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''...اسی موقعے پر رشید حسن خان میرے گھر تشریف لائے۔آتے ہی انھوں نے میری بچی صائمہ سے دوستی کر لی اور بچی بھی فوراً ان سے مانوس ہوگئی۔ان سے دیر تک باتیں کرنے کے بعد انھوں نے جیب سے ایک نوٹ نکالا۔میں نے احتجاج کیا تو بولے!'' آپ براہِ کرم اس معاملے میں دخل نہ دیں یہ کوئی تحقیقی مسئلہ نہیں میرا اور صائمہ کا حساب وکتاب ہے۔'' (ایضاً،ص 17-16)

اس مجموعے میں ایسے اشخاص کا بھی خاکہ لکھا گیا ہے جو ادب کی دنیا میں گمنامی کے شکار رہے ہیں۔ان میں ایک ڈاکٹر کشور بھی ہیں جو نیر مسعود کے بے تکلف دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ڈاکٹری پیشہ ہونے کے باوجود کشور صاحب ادب اور شاعری کے دلدادہ تھے۔اپنی کلینک میں ادبی ماحول پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیشے سے بھی برابر انصاف کرتے تھے مگر اردو لکھنے پڑھنے سے لاتعلق ہونے کے باوجود انھوں نے دیوناگری میں اردو کا پورا ادبی سرمایہ پڑھا تھا یہی وجہ ہے کہ انھیں اتر پردیش اردو اکیڈمی کی مجلسِ عاملہ کا ممبر مقرر کیا گیا تھا۔جس پر بعض لوگ اس غیر اردو داں کی نامزدگی پر ناراض بھی ہوئے لیکن اس الزام کا جواب دینے کے لیے کشور پہلے ہی کمربستہ تھے چنانچہ ظرافت بھرے لہجے میں لکھتے ہیں:

''میں تو اس لیے خاموش ہوں کہ کوئی من چلا اخبار میں میرا نام لے کر یہ بات لکھ دے کہ میں اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا، تو میں اس پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کروں اور عدالت میں جج کے سامنے اردو پڑھ اور لکھ کر تاوان وصول کروں۔پھر اس رقم سے تم لوگوں کی دعوت کروں۔''

(ایضاً،ص 21)

نیر مسعود نے یہ خاکہ ایسا کھینچا ہے جو دلکش بھی ہے اور زندگی سے معمور بھی۔خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مجموعہ کلام 'ہنوز شیشہ گراں' پر نیر مسعود کا تبصرہ ڈاکٹر کی زندگی میں ہی شائع ہو چکا تھا۔بہرکیف! نیر مسعود کو ان سے بے حد جذباتی لگاؤ تھا اور اسی بنا پر اس خاکے کا اختتام نیر مسعود نے ڈاکٹر کشور کی جلتی چتا کے منظر کو جذباتی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

''جب میں گومتی کے گھاٹ پر پہنچا تو چتا کو آگ دی جاچکی تھی اور اس کے اوپر شمشان کی چھت کا ٹین شعلوں سے تپ کر سرخ ہونے کے قریب تھا۔''

(ایضاً،ص 30)

نیر مسعود نے احتشام حسین پر بھی خاکہ لکھا ہے اور ان کی دریا دل شخصیت اور ادبی زندگی کا نقشہ انھوں نے جس انداز سے کھینچا ہے وہ واقعی احتشام حسین کے قد سے انصاف کے مماثل ہے۔انھوں نے ان کی دلچسپیوں اور تدریسی صلاحیتوں نیز ادبی گیرائیوں کی طرف ایسے لطیف اشارے کیے ہیں جو نہ صرف محقق وناقد احتشام حسین بلکہ خود خاکہ نگار کی عظمت اور اردو کے تئیں ان کی محبت پر دال ہے۔کوئی بھی موضوع ہو جب احتشام حسین اس پر بات کرنے لگتے ہیں تو لگتا ہے کہ وہ اسی مضمون کے پروفیسر ہیں۔خاکہ نگار ایسی خوبیاں اور خامیاں سامنے لاتا ہے جس سے شخصیت کے واضح خد و خال ادبی قرطاس پر ابھرتے ہیں۔اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

نیّر مسعود اپنے دوستوں کے سکھ دکھ میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔اصل میں انہی یادوں کو نیر مسعود نے خاکوں کے سانچوں میں پرویا ہے۔ اپنے دوستوں کی جرأت اور بے باکی کا اندازہ بھی ان کے خاکوں سے لگایا جاسکتا ہے۔محمود ایاز اپنی ڈاکٹری رپورٹ کے نتیجے کا تذکرہ ہشاش بشاش لہجے میں نیر مسعود سے فون پر اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے جرأت مندانہ انداز کا پتا چلتا ہے۔

''غصہ احتشام صاحب کو کم ہی آتا تھا یا وہ اس کا اظہار کم کرتے تھے۔میں نے ان کو پورے اور اصلی جلال کے عالم میں صرف ایک مرتبہ دیکھا جب انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے دو طالب علموں کو آپس میں لڑنے پر مارا تھا۔'' (ایضاً،ص 47)

خاکے میں کمال اختصار کے ساتھ شخصیت کے ظاہر و باطن کو سامنے لانا ہوتا ہے۔اس میں بے جا طوالت کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔نیر مسعود نے شخصیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے خطوط کے بھی حوالے دیے ہیں۔یہ وہ خطوط ہیں جو احتشام حسین نے 1952 اور 1953 میں اپنے امریکہ اور یورپ کے سفر کے دوران پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کو لکھے تھے۔خطوط سے کس طرح شخصیت کی اندرونی کیفیات کا پتہ چلتا ہے۔اس بارے میں ایک اقتباس دیکھیے:

''میں نے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانے بس دیکھ ہی لیے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلے سے میرے ذہن میں کوئی بات نہ تھی کہ مجھے کس کتاب میں کیا دیکھنا ہے... میں ایک قسم کی شدید بے دلی اور بے حوصلگی کی گرفت میں ہوں اور جو مواقع ملتے ہیں ان سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتا۔خدا جانے انجام کیا ہوگا۔''

(ایضاً،ص 50)

نیر مسعود اپنے دوستوں کے سکھ دکھ میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔اصل میں انہی یادوں کو نیر مسعود نے خاکوں کے سانچوں میں پرویا ہے۔اپنے دوستوں کی جرأت اور بے باکی کا اندازہ بھی ان کے خاکوں سے لگایا جاسکتا ہے۔محمود ایاز اپنی ڈاکٹری رپورٹ کے نتیجے کا تذکرہ ہشاش بشاش لہجے میں نیر مسعود سے فون پر اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے جرأت مندانہ انداز کا پتا چلتا ہے۔اسی جرأت مندانہ شائستگی کا نقشہ نیر مسعود نے یوں کھینچا ہے:

''بھائی صورت حال یہ ہے کہ Pancreas کا

کینسر ہے اور اب جگر بھی اس کی زد میں آگیا ہے۔ باہر کے اور یہاں کے ڈاکٹروں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ یہ Non Operable Case ہے، لہٰذا وقت مقررہ تک Symptomatic علاج ہوتا رہے گا۔ بھوک بالکل غائب ہے۔ درد ہوتا ہے، گولیوں سے افاقہ نہ ہو تو انجکشن لے لیتا ہوں اور آرام ہو جاتا ہے۔ بخار آتا رہتا ہے۔ بس یہ ہے مختصر روداد۔'' (ایضاً، ص 60)

محمود ایاز کے انتقال نے خاکہ نگار کو ہی نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا کو صدمہ پہنچایا کیونکہ ان کی مقناطیسی شخصیت نے اپنے اردگرد بہت اہم ادیبوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ یہ علمی معاملات میں اتنے سخت تھے کہ طاقت ور لوگوں کے کمزور مضامین واپس لوٹانے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ کرناٹک اردو اکادمی کے سیمینار میں تاریخی مقامات کی سیر میں ٹیپو سلطان کی لاش کے حوالے سے خاکہ نگار نے محمود ایاز کی دلی گھٹن کو بھی چاک کیا ہے اس لیے یہ خاکہ معلوماتی اضافے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

اردو ادب کے مشہور و معروف محقق و نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا خاکہ بھی نیر مسعود نے تحریر کیا ہے۔ جنھوں نے الہ آباد سے شب خون کا اجرا کیا جسے جدیدیت کا علمبردار قرار دیا گیا۔ نیر مسعود نے اس خاکے میں مزاحیہ پہلوؤں کو بھی ابھارا ہے۔ اس طرح خاکہ نگاری کا حق ادا کرنے میں کسی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فاروقی کے بہنوئی نفیس بھائی کا ذکر اس خاکے میں اس طرح کیا ہے کہ ایک عجیب قسم کی تخلیقی مسرت قاری کو محسوس ہوتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

''فاروقی کے ساتھ ان کے چھوٹے بہنوئی نفیس بھائی لگے رہتے تھے۔ انھیں ادب سے سروکار نہیں تھا لیکن ادبی گفتگوئیں بڑے انہماک سے سنتے تھے۔ ان کے بڑے بڑے بال اور گھنی مونچھیں تھیں جو ایک بار سگریٹ سلگانے میں آگ پکڑ چکی تھیں۔'' (ایضاً، ص 67)

اس خاکے میں خاکہ نگار نے ایسی بڑی شخصیت کی خامیوں کو بھی واضح کیا کہ وہ کبھی کبھی گالی گلوچ بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ فاروقی صاحب کے والد کو ان کی آزاد طبع زندگی اور خیالات کے سبب شروع شروع میں ان سے متعلق یہ گمان تھا کہ ان کا بیٹا ناکارہ زندگی گزارے گا لیکن بعد میں جب انھوں نے اپنے بیٹے کی کامیابیاں دیکھیں تو وہ فخر سے سرشار ہوئے نیز رسالہ 'شب خون' کی بہت سی یادیں نیر مسعود نے اس خاکے میں بیان کی ہیں۔

ادیب کا خاکہ بھی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ ادیب کی شخصیت کو جامعیت کے ساتھ نیر مسعود نے بیان کیا ہے۔ 'ادبستان' کے شخصی خاکوں میں متذکرہ خاکہ طویل خاکہ ہے لیکن اس میں مرزا ادیب کی پوری ادبی زندگی کو سمیٹا گیا ہے۔ تحقیقی اور تخلیقی کام کو مرزا ادیب کس طرح انجام دیتے تھے اس کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ خاکہ نگار کے مطابق مرزا ادیب منتشر مواد کو ایک منظم کتاب کی شکل دیتے تھے اور اس تحقیقی انضمام کو تحقیقی کام کے مشکل ترین مرحلوں میں شمار کرتے تھے۔ اپنی کتاب 'اردو ڈرامہ اور اسٹیج' کا خاکہ اور مناسب نقشہ انھیں خواب میں منکشف ہوا۔ خواب سے بیدار ہوتے ہی انھوں نے اسی وقت اُٹھ کر کتاب کا مکمل خاکہ بنا لیا۔ اس ترتیب سے پہلے وہ سالہا سال پریشان رہے۔

ادیب بااصول زندگی گزارتے تھے۔ اپنی کتابیں دوسروں کو نہیں دیتے تھے۔ تلافی کے خوف سے انھیں گھر میں ہی مطالعے اور استفادے کا مشورہ دیتے تھے۔ اس طرح دوسرے ادیبوں سے عاریتاً کتابیں مانگتے بھی نہیں تھے۔ اس کے علاوہ خاکہ نگار نے ادیب کے تیز ذہن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ اتنے ذہین تھے کہ اپنی کتاب کو جلد سے پہچانتے تھے اور اگر کسی بچے سے کبھی کوئی کتاب منگواتے تو پہلے اس کتاب کی پوری معلومات دیتے تھے۔ خاکہ نگار نے مرزا ادیب کی شخصیت کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ مرزا ادیب ایک چلتا پھرتا کتب خانہ معلوم ہوتا ہے۔

نیر مسعود نے شخصیت کے علاوہ ایک حویلی جس کا نام 'ادبستان' تھا، پر بھی خاکہ قلمبند کیا ہے۔ اس حویلی کو ان کے والد صاحب نے خرید کر نئے سرے سے پُرکشش شکل و صورت میں تبدیل کیا تھا۔ اس حویلی میں ایک زمانے میں حسرت، یگانہ، پریم چند جیسی شخصیات آیا کرتی تھیں۔ اس خاکے میں آغا امیر حسین کا بھی ذکر ہے جن کی نگرانی میں یہ عمارت از سر نو تعمیر ہوئی تھی انھوں نے باضابطہ طور پر فن تعمیر کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر اس کے باوجود انھوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ خاکہ نگار نے بڑے ہی جذباتی انداز میں 'ادبستان' کی موجودہ شکل و صورت کو قارئین تک پہنچانے میں بڑے ہی دلکش اور دلفریب لفظوں سے اس کی تصویر کشی کی جس سے ہمیں اس حویلی کی موجودہ شکل ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اس حویلی کی خود بہ خود سیر کر رہے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ادبستان کی عمارت اب بھی تقریباً ویسی ہی ہے جیسی انھوں نے بنوائی تھی، البتہ کہیں کہیں پر معمولی سی شکست و ریخت ہوئی ہے۔ مثلاً اس کے دو منزلوں کی مغربی سمت والی منڈیر پر کوئی وضع بنوانے کے بجائے انھوں نے آغا امیر حسین سے سیمنٹ کے بہت بڑے حرفوں میں جو انگریزی عبارت Live and Let Live لکھوائی تھی اس میں Live کا ایک آدھ حرف ٹوٹ چلا ہے لیکن Let Live کے حروف جوں کے توں موجود ہیں۔''

(ایضاً، ص 120)

اس کے علاوہ اس خاکے میں بھی ادیب کے حافظے کے متعلق بات کی گئی کہ آخری وقت میں انھوں نے حافظے کی توانائی کھو دی مگر اس کے باوجود بھی وہ 'ادبستان' کی تصویر منگوا کے اس کے نقشے کو دوبارہ ذہن نشین کرنے کی ناکام کوشش کرتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا کہ اس حویلی سے ان کو کتنا جذباتی لگاؤ تھا۔

مرزا ادیب کی متنوع زندگی کا عکس جس انداز میں ادبستان کے شخصی خاکوں میں ابھرا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی زندگی کے آخری وقت کو خاکہ نگار نے جذباتی اور پُرنم آنکھوں سے جس طرح قلمبند کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ خاکہ نگار نے کتنی محنت سے یہ خاکہ تحریر کیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

''جس وقت ان کے سر کے نیچے سے تکیا ہٹایا جا رہا تھا اور ان کے داغ داغ بدن پر چادر ڈالی جا رہی تھی، مجھے کچھ دن پہلے کی وہ رات یاد آئی جب کراہتے کراہتے رک کر انھوں نے بڑے پُرسوز لحن میں یہ شعر پڑھا تھا

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا''

(ایضاً، ص 129)

اس کے علاوہ دوسرے خاکوں مثلاً 'شہنشاہ مرزا'، 'صباح الدین عمر' اور 'عرفان صدیقی' میں بھی نیر مسعود نے اپنے ہنر کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے خاکوں میں جو زبان استعمال کی ہے وہ واقعی سریلی ہے اور جن شخصیات کی تصویر انھوں نے کھینچی ہے وہ قابل داد کے ساتھ ساتھ قابل مطالعہ بھی ہے۔ ادبستان کے یہ دلکش خاکے قاری پر تاثراتی اور توضیحی اہمیت کی چھاپ ڈالتے ہیں۔ نیر مسعود نے ان خاکوں میں وہ فنی اجزا بھرپور ملحوظ نظر رکھے ہیں جن کا خاکوں میں ہونا لازم ہے۔ سنجیدہ پن اور اعتدال ان کے خاکوں کی اہم پہچان ہے۔ غرض یہ خاکے نیر مسعود کو تنقید نگار، نثر نگار کی حیثیت کے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے خاکہ نگار کی صف میں نمایاں مقام عطا کرتے ہیں۔

■

Reyaz Ahmad Najar
Research Scholar, Dept of Urdu
University of Hyderabad
Hyderabad- 500046 (Telangana)
Mob.: 9381749642

عہد وسطیٰ: پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کے چند مضامین کی روشنی میں

مہتاب جہاں

تاریخ اگرچہ ایک خشک موضوع ہے، مگر اس کے ذریعے ماضی کے گذشتہ حالات اور تاریک گوشوں سے آگاہ ہوا جاسکتا ہے اور یہ بھی کہ تاریخ ہمیں ہمارے آباواجداد کی کہانی سناتی ہے۔ ان کے کارناموں اور ناکامیوں سے روشناس کراتی ہے۔ کبھی آنکھ شرم سے جھک جاتی ہے تو کبھی سینہ فخر سے پھولے نہیں سماتا اور کبھی سر کو اونچا کرنے کا جواز مل جاتا ہے۔

تاریخ سے ہمیں بہت کچھ جاننے، سمجھنے، سیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ عبرتناک واقعات ہماری آنکھوں سے بہت سے پردے ہٹا دیتے ہیں تو کہیں سبق آموز قصے بھی سننے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔ تاریخ کی آگاہی سے ہم اپنے آج کو سدھار اور سنوار سکتے ہیں۔ اپنے باپ دادا کی نامکمل اور ادھوری خواہشات کو پورا کر سکتے ہیں اور وہ کام جو انھیں نہیں کرنے چاہیے تھے وہ انھوں نے کیے۔ ان کو مٹایا نہیں جاسکتا مگر ہم خود اس کو نہ کرنے کا آج عزم ضرور کر سکتے ہیں۔

تاریخ کے اگر دوسرے پہلو پر نظر ڈالیں تو یہ صرف بادشاہوں، سلطانوں، نوابوں، جاگیرداروں، شاعروں، محلوں، محفلوں کی داستان نہیں سناتی بلکہ گزرے وقت کا آئینہ ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے جو ایک جیتی جاگتی تصویر کی مانند ہمارے روبرو ہوتا ہے اور اگر ایک باکمال، ذہین، دوراندیش، دقیق النظر تاریخ داں، مورخ ہو تو پھر ماضی نکھر کر سامنے آتا ہے۔

گذشتہ مورخین میں بے شمار اہم نام سرفہرست ہیں۔ ان میں غیر ملکی اور ملکی دونوں شامل ہیں۔ ان کی نگارشات بہت اہم اور کارآمد ہیں۔ مگر بعض جگہ مورخین کی آنکھوں پر تعصب اور جانبداری کا چشمہ بھی نظر آتا ہے جو تاریخ کے روشن چہرے کو مسخ کردیتا ہے اور قاری کے سامنے ایک بدنما تصویر کی طرح پیش کیا جاتا ہے جو تاریخ دانوں کی بے حد خطرناک اور بددیانتی کو ظاہر کرتا ہے مگر ایسے مورخ زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے کیونکہ ان کی تحریروں کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ معاصر تاریخوں سے ان کا موازنہ کیا جاتا ہے مگر کہیں نہ کہیں ایسی تاریخیں، پڑھنے والوں کے ذہنوں کو مشکوک ضرور بنا دیتی ہیں اور قاری جس طرح چاہتا ہے ان کتابوں سے ویسا ہی اثر قبول کرتا ہے۔

یہاں مثال کے طور پر دو کتابوں کا ذکر لازمی معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں کتابیں جو اکبر کے عہد کی اہم تاریخیں ہیں، اکبر نامہ اور آئین اکبری۔ ابوالفضل کی قلم سے تحریر شدہ یہ تاریخیں بہت اہم ہیں اور ان کتابوں کو اکبر کے عہد کی انسائکلو پیڈیا کہا جاتا ہے۔ مگر اس میں صرف اکبر کی بہترین پالیسیوں کا تذکرہ ہے جن کو خوشامد کا پہلو بھی کہا جاسکتا ہے۔ بُری بات کو بھی خوبی کے پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً شراب نوشی کا ذکر وغیرہ۔ مگر اسی زمانے میں ایک شخص پوشیدہ طور پر اکبر بادشاہ کے عہد کے صحیح واقعات و حالات کی سچی تاریخ تحریر کر رہا تھا وہ شخص تھا ملا عبدالقادر بدایونی، اور اس کی تاریخی کتاب تھی تاریخ بدایونی یا منتخب التواریخ۔

اس تاریخ سے ہمیں اکبر کے عہد کے بارے میں صحیح اور درست معلومات فراہم ہوتی ہیں جن کو ابوالفضل اکبر نامہ میں بادشاہ کے خوف سے تحریر نہ کرسکا۔ یا اُن مراعات کے لالچ میں جو اُس کو اس کتاب کے عوض ملنے والی تھیں۔

بہرحال ہندوستان میں کئی بڑے بڑے تعلیمی ادارے ہیں جن کو ہم یونیورسٹی اور کالج کہتے ہیں ان میں کئی شعبہ جات بھی ہوتے ہیں جن میں مختلف کورسیز اور مضامین اور موضوع پڑھائے جاتے ہیں۔ ایک موضوع ہے تاریخ، اس کو کئی لیکچرار اور ٹیچر اور پروفیسر پڑھاتے ہیں اور اس موضوع میں کئی پروفیسرز نے خوب شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں سر جادوناتھ سرکار اور سچد انند سنہا کا نام سرفہرست ہے۔ جو بہترین تاریخ کے استاد کے ساتھ مورخ بھی رہے ہیں۔ کئی نام ان کے علاوہ بھی قابل ذکر ہیں۔ جیسے پروفیسر آر-ایس شرما، پروفیسر ڈی-این-جھا، شری مالی، پروفیسر شکلا، پروفیسر ظہیر حسن جعفری، پروفیسر اوپیندر کور، پروفیسر سنیل کمار، پروفیسر رضوان اللہ (موخر الذکر دونوں کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے) پروفیسر امین، ستیش چندرا، تارا چند، ہربنس مکھیا، پروفیسر نجف حیدر، پروفیسر اشتیاق حسین ظلی، پروفیسر ملک محمد حبیب، محمد مجیب، پروفیسر عرفان حبیب، خلیق احمد نظامی، سید اظہر علی، شیریں موسوی، پروفیسر گپتا، پروفیسر آر سی دتا، پروفیسر حسن عسکری، پروفیسر قیام الدین، پروفیسر امتیاز احمد، پروفیسر شیو کمار سنگھ، پروفیسر پاپیا گھوش، ان تمام تاریخ کے استادوں اور مورخین میں ایک اور نام قابل ذکر ہے، وہ ہے پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کا، جو اس مضمون کا اصل موضوع بھی ہیں۔ یہ نام تاریخ کی دنیا میں ایک درخشاں ستارے کی مانند ہے جو علم و ادب کے آسمان میں سدا چمکتا رہے گا۔

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی صاحب کو اس خاکسار کو دیکھنے کا شرف 2006 میں ایک بین الاقوامی سمینار میں ہوا۔ گورے چٹے، دبلے پتلے، دراز قامت باوقار بے حد وضع قطع کے انسان، منہ میں پان اور چہرے پر ہمیشہ رہنے والی پیاری سی، ہلکی سی ایک مسکراہٹ، گونجتی ہوئی خوبصورت آواز، آپ عہد وسطیٰ کی تاریخ کے ماہر تھے، بلکہ تاریخ کے کسی بھی موضوع پر آپ گھنٹوں بے تکان بول سکتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ تمام واقعات ان کے سامنے رونما ہوئے ہوں۔ تاریخیں، سنین، سب ان کے ذہن میں محفوظ تھے واقعات کو کڑی در کڑی بیان کرتے تھے کہ سن کر عقل حیران ہوتی تھی جب اسٹیج پر جاتے تو وقت کا کوئی حساب کتاب نہ ہوتا تھا اور آپ گھنٹوں ایک موضوع پر بول سکتے تھے۔ مختلف سمیناروں، کانفرنسوں اور ادبی جلسوں میں ان کی شرکت لازمی تھی۔ اکثر لوگ تاریخی موضوعات پر اپنا پرچہ پڑھنے سے گھبراتے اور کتراتے تھے کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہوجائے اور شرمندگی کا باعث نہ بن جائے مگر پروفیسر اقتدار حسین صدیقی صاحب میں انکساری اور نفاست کوٹ کوٹ کر

بھری تھی۔ کبھی کسی بات سے ان کی برتری اور خودستائی ظاہر نہیں ہوئی۔ کبھی کسی بات پر جھنجھلاتے نہیں تھے، ہمیشہ سامنے والے کی تعریف کرتے تھے اور اگر ضرورت ہوتو اچھے مشورے اور حوالے دیتے تھے اور بڑی نرمی سے سامنے والے کی غلطی کو درست کردیا کرتے تھے۔ کسی سمینار میں آپ کی موجودگی طالب علموں، خاص طور پر تاریخ کے طالب علموں کے لیے بڑی اہم ہوتی تھی۔ طالب علموں کے گروپ کے گروپ ان کو گھیرے رہتے اور اپنے سوالات اور شک وشبہات ان سے معلوم کرتے۔ مشورے لیتے، آپ سب کی باتیں مسکرا کر سنتے تھے اور اچھے اور بہترین مشوروں سے نوازتے تھے اور تحقیقی کاموں کے بارے میں معلوم کرتے، مبارک باد دیتے اگر آپ کسی سمینار میں مجلس صدارت میں شامل ہوتے اور کسی نے کوئی اچھا مقالہ پڑھا ہوتا تو بہت خوش ہوتے بے حد تعریفیں کرتے اور کہتے بھئی ہمیں تو اور اس بارے میں معلوم ہی نہیں تھا، آپ کا مضمون بہت اچھا تھا۔ یہ انداز بے حد سادہ تھا ایک عالم ایک مورخ کا۔

آپ کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ خواہ بات فارسی زبان و ادب سے متعلق ہو یا پھر اردو سے، آپ کی معلومات وآگاہی ہر میدان میں زبردست تھی۔ عہد وسطی کی تاریخ میں آپ کو مہارت حاصل تھی۔ مختلف موضوعات پر ایسے نکات پیش کرتے، ایسے ایسے حوالے دیتے کہ تاریخ کے بڑے بڑے جانکار آپ کے قائل نظر آتے تھے۔ ادبی محفلوں کی آپ جان تھے یا یوں کہیں آپ کی موجودگی کسی بھی ادبی جلسے کی اہمیت وافادیت اور رونق کو دوبالا کردیتی تھی۔ طلبا اور نئے تقرر پانے والے اساتذہ کی بہت دلجوئی اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بے حد سلیقے سے بات کرتے تھے۔ اپنی دانائی، معلومات، قابلیت پر غرور کا شائبہ تک نہیں تھا۔ بہت منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے۔ دوسروں کی تحریروں اور کتابوں کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ یہ خاکسار کا ذاتی تجربہ ہے۔

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے طالب علم اور پھر استاد کی حیثیت سے منسلک رہے اور ان کے شعبے نے آپ کی قیادت میں بہت ترقی کی اور مقبول بھی ہوا۔ ان کا تعلق بنیادی طور پر سیوہارا بجنور سے تھا۔ ان کی پیدائش 18 اپریل 1937 کو ضلع بجنور میں ہوئی۔ تعلیمی دور پر نظر ڈالیں تو انھوں نے 1955 میں یوپی بورڈ سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور شعبہ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے آپ نے ایم اے کیا۔ پھر ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شعبے سے منسلک رہے۔ 1964 میں آپ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مگر 1962 میں ہی آپ تاریخ کے شعبے میں بحیثیت لیکچرار مقرر ہوچکے تھے اور درس و تدریس میں مشغول تھے۔ آپ اس شعبے کے ہیڈ، چیئرمین، کوآرڈینیٹر اور اس کے علاوہ سوشل سائنس فیکلٹی آف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈین کے عہدے پر بھی فائز رہے اور شعبے کو اپنی اعلی کارکردگی سے ایک الگ حیثیت سے روشناس کرایا اور آخر کار 1997 میں شعبہ تاریخ سے سبکدوش ہوئے۔ مگر ان کے علمی کام اور سفر رُکے نہیں، وہ بدستور جاری رہے۔ علمی سفر ملکوں ملکوں شہروں شہروں ہوتے رہے۔ کتابیں، مضامین، تقریریں دیتے رہے۔ انگریزی کے علاوہ ان کے کئی مضامین اردو کے اہم مجلات میں بھی شائع ہوتے رہے۔ خاکسار نے ان کے کئی مضامین اردو مجلوں میں پڑھے ہیں۔

اقتدار صاحب نے تقریباً سولہ 16 کتابیں تالیف کیں، جن میں تین کتابیں غالباً اردو زبان میں باقی انگریزی میں ہیں۔ آپ نے بڑے اہم تحقیقی کام انجام دیے جو مختلف میگزین میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر مثلاً پاکستان، لندن، ایران، بنگلہ دیش، ترکی، امریکہ، جورڈن میں مضامین کی شکل میں شائع ہوتے رہے۔ بڑے بڑے اشاعتی اداروں نے آپ کی کتابوں کو شائع کیا۔ اس کے علاوہ آپ کے مضامین جو تاریخ پر مبنی تھے، وہ مختلف دانشناموں اور انسائکلوپیڈیا میں شائع ہوئے چند کے نام درج ذیل ہیں۔

1. انسائکلوپیڈیا آف ایرانیکا، یوایس اے
2. انسائکلوپیڈیا آف اسلام، ترکی، استنبول
3. انسائکلوپیڈیا آف اسلامک سویلائیزیشن این عربیک، جورڈن (اردن فلسطین)
4. انسائکلوپیڈیا آف اسلام (لندن)
5. دانشنامہ (ایران)

وہ عہد وسطی کے ماہر تھے، مگر اس کے علاوہ اسلام، تصوف اور صوفیا کرام کی تاریخ پر بھی گہری نظر تھی اور اردو کے شجرے پر عبور حاصل تھا۔ انھوں نے بے شمار مضامین اردو اور انگریزی زبان میں تحریر کیے جو تشنگان علم کے لیے ایک چشمہ جاری وساری ہیں۔ 'شجرۂ سہروردان کا ایک مضمون بہت اہم ہے۔ جس کے مولف احمد خان اکبر شاہی ہیں۔ اس کی تاریخ کتابت 1596 ہے۔ یہ اکبر کے دور کا شجرہ ہے۔ اقتدار صاحب نے اس پر ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ انھوں نے اس تنقیدی مضمون کو تحریر کرنے میں کئی اہم منابع و مآخذ کا سہارا لیا جو بے حد مقبول اور مستند ہیں مثلاً فوائد الفواد، سیر العارفین، خیر المجالس، اس کے علاوہ تاریخی کتابوں میں منتخب التواریخ، تاریخ مشتاقی اور دیوان امیر خسرو، عین الملک، ماہرو کی انشا ماہرو کے حوالے بھی اس مضمون میں درج ہیں۔

ایک اور اہم مضمون جو اردو زبان میں ہے اس کا عنوان ہے 'تاریخ فیروز شاہی برنی: تجرباتی مطالعہ اسلامی تاریخ نگاری کی روایت کی روشنی میں'' اس مضمون میں انھوں نے عوفی کی کتاب جوامع الحکایت اور طبقات ناصری منہاج السراج کا حوالہ دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کتابوں نے عربی زبان کی اعلی تاریخ نگاری کی روایت کو فارسی میں منتقل کیا اور اس کے بعد سے ہی اہل علم میں تاریخ کے معنی کا شعور پیدا ہوا۔

ہم مسلم حکمرانوں کے اقتدار کی جب ہندوستان میں بات کرتے ہیں تو ان کے ترکی اور فارسی بولنے والے حکمرانوں کے طور پر ہی جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں، اور فارسی اور ترکی کے بارے میں ہی اپنی تحقیق کا دار ومدار متعین کرتے ہیں۔ سلطنت دور ہو خواہ مغلیہ دور۔ صرف فارسی سے متعلق ہی ہماری گفتگو ہوتی ہے۔ مغلیہ دور کے ایک اہم تاجدار اکبر بادشاہ کو فارسی اور سنسکرت و دیگر زبانوں میں تراجم کا سہرا بھی اسی کے سر پر رکھا جاتا ہے۔ یہاں بھی صرف فارسی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کی بات ہوتی ہے۔ مگر یہاں ایک بات بے حد اہم اور قابل غور ہے کہ جو مسلمان حکمران اور ان کے گروہ ہندوستان میں قیام پذیر ہوئے ان کی زبان فارسی اور ترکی تھی مگر وہ زیادہ تر فارسی میں ہی بولتے تھے اور بقول اقتدار صاحب عربی زبان سے نابلد تھے۔ لہذا ان کے مطالعے کے لیے عربی زبان کی بلند پایہ تصنیفات کو فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور اسلامی علوم کے علاوہ دوسرے سیکولر علوم پر بھی کتابیں تصنیف کی گئیں اور ان کے مترجم اور مصنفین فضلا کی اس کاوش سے فارسی ادب میں گراں قدر اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ اس کو بڑا فروغ بھی حاصل ہوا۔ اس ہندوستانی فارسی ادب میں علم وتاریخ پر لکھی گئی کتابیں بہت اہم ہیں اور عربی زبان میں تحریر ہوئی تاریخوں میں جو اعلیٰ تاریخ نگاری کی روایت تھی وہ فارسی تاریخ نگاری میں منتقل ہوگئی۔

ضیاء الدین برنی جو کہ عہد وسطی کے ہندوستان کے یقیناً عظیم ترین مورخ تھے وہ اپنے پیش رووں میں عرب اور غیر عرب مسلم مورخین جو کہ صاحب بصیرت اور علم تاریخ کے صحیح نمائندے تصور کیے جاتے تھے۔ ان سب سے متاثر ہوئے جیسا کہ ان کی تاریخ فیروز شاہی کے مقدمے میں تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے خاص طور سے انھوں نے سید الدین محمد عوفی اور منہاج السراج کے تبحر علمی، وسعت نظر اور نظریہ تاریخ سے بصیرت حاصل

کر کے ان کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھایا اور بحیثیت ایک مفکر مورخ کے آنے والی نسلوں کے لیے اپنا سکہ قائم کیا۔ انھوں نے تاریخ نگاری کو نئی جہتیں عطا کیں۔ بعد کے مورخین نے ان کا تتبع کیا۔

اس مقالے میں اقتدار صاحب نے برنی کی تاریخ فیروز شاہی کے حوالے سے جو فیروز شاہ تغلق کے عہد کی تاریخ ہے سیر حاصل گفتگو کی ہے اور مختلف شواہد کی روشنی میں دیگر قلمی نسخوں سے اس کا تقابلی مطالعہ کیا ہے تاکہ فیروز شاہ تغلق کے عہد کی درست اور صحیح عکاسی ہو سکے۔ اس مضمون میں انھوں نے ضیاء الدین برنی کے خاندانی پس منظر کے علاوہ اس کی دربار شاہی سے وابستگی اس کی سیاسی اور سماجی فکر اور اس کی تاریخ نگاری کی سمجھ اور علم دین کی اہمیت کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ برنی کے مختلف اوصاف بیان ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس کے تخیلات کو بھی پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ فتاویٰ جہانداری جو برنی کی ایک بہت اہم تاریخ ہے۔ اس میں برنی حکمران سلطان محمد بن تغلق کو سیاست اور حکمرانی کے سلسلے میں روایت پرستی کے بجائے بدلے ہوئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق نئے ضوابط اور احکامات وضع کرنے کی ترغیب دی ہے۔ کیوں کہ برنی بھی شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ چودھویں صدی عیسوی کی علم تاریخ میں مرتب کی گئیں تالیفات سرکاری مؤلفین کے قلم سے تھیں اب مؤلفین کا مقصد اپنی تالیفات کو سلطان کے نام معنون کر کے اس کے حضور پیش کرنا تھا۔ انعام واکرام حاصل کرنے کی غرض سے اس لیے انھوں نے اپنی تالیفات میں سلطان کی مدح سرائی کی اور اس کے عیوب اور اس کے عہد کی برائیوں کے ذکر سے گریز کیا۔ اس طرح انھوں نے مورخ کے آداب وفرائض کو قطعاً ملحوظ نہ رکھا۔

اقتدار صاحب کے مطابق یہ کتاب ہی ضیاء الدین برنی کی دربار میں رسائی کا سبب بنی ہوگی۔ اقتدار صاحب نے چند سطور میں ہی برنی کے حالات کا مشاہدہ اور اس کی فکر کے رجحان کو بیان کر دیا ہے۔ 1351 میں سندھ کے کنارے سلطان محمد بن تغلق شاہ کے انتقال کے بعد برنی پر سلطان کے دوسرے ندما کی طرح الزام لگا کہ اس نے مرحوم سلطان کو گمراہ کیا تھا۔ کچھ ندما قتل کر دیے گئے اور کچھ جیل میں ڈال دیے گئے اور برنی کو بھی 'بھٹیر' قلعے کی جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہاں وہ چھ ماہ تک قید رہا جسے روزانہ قتل ہونے کا ڈر لاحق رہتا تھا۔ جب چھ ماہ کے بعد رہائی ملی تو اس نے اپنے آپ کو بے یار و مددگار پایا۔ اس کی جائیداد و املاک ضبط کر لی گئی تھی۔ مایوسی اور قنوطیت کی حالت میں جب کہ اس کی عمر ستر برس ہوگئی تھی۔ بینائی کمزور و کمر میں خم پیدا ہو گیا تھا۔ اس حالت میں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں پناہ ملی اور وہیں رہ کر صحیفۂ محمدی اور تاریخ فیروز شاہی مرتب کی۔ بقول اقتدار صاحب تاریخ فیروز شاہی کی دور حاضر میں قدر و قیمت مزید بڑھ گئی ہے کیونکہ اس میں تنقید سے متعلق نظریے Critical theories میں نئی نئی تبدیلیوں کا رونما ہونا ہے۔ اور اس کے علاوہ اسلام میں تاریخ نگاری کی روایت تاریخ کے طالب علموں اور محققین میں برنی کے فلسفیانہ افکار کی وجہ سے اس کی عظمت بہت بڑھ گئی ہے۔

برنی نے علم تاریخ اور تاریخ نگاری سے متعلق اپنے جن افکار کا اظہار کیا ہے اس سے وہ ایک تاریخ کے فلسفی کے مرتبے پر فائز نظر آتا ہے اور اپنے وقت سے بہت آگے بھی۔ یہاں خاکسار ایک بات پر توجہ دلانا از حد ضروری سمجھتی ہے کہ اقتدار صاحب خود بھی ایک تاریخ کے فلسفی اور تجزیاتی اور تاریخی تنقید کے تمام پہلوؤں اور اصولوں کو بخوبی جانتے تھے۔ تبھی انھوں نے اس لحاظ سے برنی کا تجزیہ کیا۔ ورنہ وہ ظاہری اور تاریخی پس منظر میں بھی برنی کی ایک تصویر قارئین کے روبرو رکھتے۔ ایک جگہ اقتدار صاحب برنی سے متعلق تجزیاتی طور پر بیان کرتے ہیں کہ برنی سیاست کو دین سے علیحدہ کرنے کا قائل نظر آتا ہے۔ اور مزید فرماتے ہیں کہ ان کا (برنی) کا نظریہ سیکولر تھا۔ مگر برنی کو اس کی قیمت بھی چکانی پڑی بعد میں بے یار و مددگار ہو کر۔

اقتدار صاحب نے برنی کی اس کتاب تاریخ فیروز شاہی (1265 تا 1357) کے ایک ایک صفحے کا بہت دقیق النظری اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ مقدمے سے لے کر برنی کے حالات و واقعات اس کی زبوں حالی اور تصنیف و تالیفات برنی اس کے نظریہ فکر و تنقید، اس کی تاریخ نگاری، اس کی روایات و آداب ہر ایک بات کو عمیق نگاہ سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ برنی کا ماننا تھا کہ تاریخی شواہد کو کسی ماضی کی تاریخ لکھنے میں من وعن لکھنا قابل قبول نہیں ہے اس لیے اس کا یہی تنقیدی نظریہ اس کو دوسرے معاصر مورخین میں امتیازی درجے پر بٹھاتا تھا۔

دراصل اقتدار صاحب نے اپنے اس تحقیقی مضمون میں تاریخ فیروز شاہی کے دو ایڈیشنوں کا تنقیدی طور پر موازنہ کیا ہے اور دونوں میں جو اختلاف ہے اس کو اجاگر اور بیان کرنے کی بے حد عمدہ اور کامیاب کاوش ہے۔ مثلاً پہلے اڈیشن میں برنی نے محمد بن تغلق کے عہد کی تاریخ کو ایک عقیدت مند شخص کی طرح پیش کیا ہے نہ رائے عامہ سے متاثر نظر آتا ہے اور نہ کسی دوسری بات سے خائف۔ پہلے ایڈیشن میں تغلق ایک اولوالعزم بادشاہ، عظیم فاتح نظر آتا ہے۔ اس میں برنی ہر بات کو اور ہر واقعے کو سہل انداز میں بیان کرتا ہے۔ کہیں بھی بات کو مبہم انداز میں بیان نہیں کرتا بلکہ ہر بات کو تفصیل سے تحریر کرتا ہے اور اس ایڈیشن میں مارکیٹ کنٹرول کے بارے میں جب ذکر کرتا ہے تو صرف اناج کی قیمتوں کے بارے میں بتاتا ہے

مگر اس کے برعکس دوسرے ایڈیشن میں سلطان کے بارے میں اس کا بیان اور اپروچ دونوں جدا نظر آتے ہیں۔ اس میں وہ سلطان کی دین اور سیاست سے گمراہی کا ذمے دار عقیدت پسند فلاسفہ کو بتاتا ہے، کہ ان کی صحبت میں سلطان علم معقول کا حامی اور علم منقول کا مخالف بن گیا ہے۔ وہ عقیدہ کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ایڈیشن میں وہ خود کو بھی قصوروار ٹھہراتا نظر آتا ہے کہ ہم جیسے علما لوگوں نے طمع اور حرص کے لیے سلطان کے مقرب ہو کر سلطان کو حق بات نہ بتا سکے۔ جان کے خطرے سے جو کہ جانی ہے اور مال کے لالچ میں جو کہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اس ایڈیشن میں اناج کے علاوہ گھوڑے، ٹٹو، گائے، بکری، کپڑا، سستے غلام، باندیاں، گھی، تیل غرض ہر چیز کا ذکر کیا ہے۔

اقتدار صاحب کے تمام مضامین ایسے ہیں جو کہ تاریخ کے اہم پہلوؤں کو تنقیدی نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ ایک عالم کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ مورخ کی بھی ہے۔ ایک اور مضمون کا حوالہ یہاں لازمی معلوم ہوتا ہے۔ جس کا عنوان ہے 'ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے ارتقا کا تاریخی پس منظر' اس میں اقتدار صاحب نے ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے عروج و ترقی میں مسلم فرمانرواؤں کے علاوہ امرا، فضلا، صوفیائے کرام اور شعرا کے تاریخی کردار کے ساتھ ساتھ شہروں اور دہلی کی بولی جانے والی زبان یعنی ہندوی کے اولین دور کی تاریخی اہمیت کا تجزیہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ دیگر تاریخی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً فارسی کے حوالے سے اطلاع دیتے ہیں کہ اس زمانے میں سرکاری ملازمت پانے کے لیے لوگ اپنے بچوں کو فارسی کی تعلیم دلواتے تھے۔ لہٰذا غیر مسلم یا ہندو حضرات بھی اپنے بچوں کو اس غرض سے فارسی پڑھوانے لگے۔ ان میں بھی تلک نام کا ایک شخص تھا جو قاضی ابوالحسن عرف قاضی شیراز کے یہاں ملازم ہوا اور ترقی کرتے کرتے وہ محمود غزنوی کے دربار تک پہنچ گیا اور غزنہ میں ہندوی سے فارسی میں ترجمہ کی غرض سے ملازم ہوا۔ اس کی صلاحیت کی بنا پر محمود نے خود اپنی سرپرستی میں اس کو لے لیا۔ یہ اطلاع بہت اہم ہے جو ہمیں اس مضمون سے دستیاب ہوتی ہے۔ اس مضمون میں اقتدار صاحب نے بہت سے افراد کا ذکر کیا ہے جو ذات میں حقیر تھے مگر انھوں نے اپنی علمی لیاقت کی بنا پر اعلیٰ عہدے پائے۔ اس

کے علاوہ ہندوی زبانوں کا فارسی پر اثر، اس پر بھی معقول اطلاعات فراہم ہوتی ہیں۔

اقتدار صاحب نے ہر موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ دو زبانیں جو ہندستان کی اہم زبانیں ہیں۔ فارسی اور اردو اس میں بھی انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ اردو کے حوالے سے یہ مضمون پیش خدمت ہے جس کا عنوان ہے۔ 'محمد رفیع سودا کے شہر آشوب اور ہجویہ قصائد میں تاریخی حقائق کا تجزیاتی مطالعہ' چونکہ اقتدار صاحب ایک دقیق النظر مورخ تھے اس لیے ہر موضوع اور ہر بات میں تاریخی پہلو تلاش کر لیتے تھے۔ سودا اور شہر آشوب اور ان کے ہجویہ قصائد میں واقعی تاریخی واقعات پنہاں ہیں۔ جس کا انھوں نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔

اردو زبان میں اقتدار صاحب نے بڑے گراں قدر مضامین تحریر کیے۔ ایک مضمون پانی پت کی ثقافتی تاریخ پر مبنی ہے جو ریاست ہریانہ کے شہر پانی پت کے بارے میں بہت اہمیت کا حامل ہے مگر اقتدار صاحب کی اطلاع کے مطابق چودھویں صدی سے پہلے پانی پت کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا یعنی یہ شہر اس وقت تک کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا اور اس شہر کے حوالے سے کسی شخص کا بحیثیت عالم، شاعر یا امیر بھی ذکر نہیں ملتا۔ مگر بلبن کے زمانے میں دہلی کے علاوہ پانی پت میں بھی مستحکم قلعے بنائے گئے تھے۔ طبقات ناصری میں بہت مختصر طور پر پانی پت کا ذکر آیا ہے۔ مگر بلبن کے عہد میں پانی پت کو بہت اہمیت نصیب ہوئی اور چودھویں صدی سے پانی پت کو مذہبی نقطہ نظر سے فوقیت حاصل ہوئی اور صابری بزرگوں کی آماجگاہ بھی بنا، غرض اقتدار صاحب نے اس مقالے میں پانی پت کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں۔

اقتدار صاحب نے بڑے اچھے اہم مضامین اردو زبان میں تحریر کیے جو اس خاکسار نے جمع کیے ہوئے تھے ایک مضمون نظر سے گذرا۔ جس کا عنوان تھا 'عہد غالب کے سیاسی اور سماجی حالات (پس منظر)' اس مقالے میں بھی آپ کی فکر اور تحقیق الگ نوعیت کی ہے۔ آپ کا نقطہ نظر ہر ایک عہد، شاعر، مصنف، کتاب پر بالکل جدا ہے۔ غالب کے عہد کو بھی انھوں نے اسی طرح دیکھا ہے اور پرکھا ہے اور اس عہد کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا ہے۔

ایک بہت اہم کام جو اقتدار صاحب نے کیا، وہ تھا، واقعات دارالحکومت دہلی پر آپ نے بے حد جامع مقدمہ تحریر کیا۔ ایک ایک بات کو وضاحت سے لکھا کہ کسی اور کتاب کو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دہلی کے حوالے سے یہ کتاب بہت اہم اور جامع ہے اور اقتدار صاحب کے اس مقدمے نے کتاب کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

مقدمے میں انھوں نے دہلی کی فن تعمیر، مصوری، فائن آرٹ ہر چیز پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ہر اہم چیز کو واضح کر کے تحریر کیا ہے کہ قاری کو کسی الجھن کا شکار نہ ہونا پڑے۔ جو عمارتوں کی تعمیر اور ان کے محل وقوع پر مبنی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا آخری تحقیقی کام ہے جو مؤلف نے بہت تندہی سے انجام دیا ہے۔ ہر جلد ضخیم اور معلوماتی ہے۔ دہلی عہد وسطی میں سلطنت دہلی قائم ہونے سے پہلے ایک معمولی قصبہ تھا۔ مگر 1391 کے بعد یہ علوم وثقافت کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اور سلاطین کا پایہ تخت ہونے کے باعث حضرت دہلی کہلانے لگا۔ اور یہ احتراماً دارالحکومت کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ اور صرف دہلی ہی نہیں بلکہ جہاں کہیں کسی بھی مسلم نے حکمرانی کی اور سلطان کا لقب اختیار کیا تو اس جگہ کے نام کے ساتھ حضرت لفظ لکھا جانے لگا۔ اور حضرت کی یہ اصطلاح مسلم ممالک میں استعمال ہوتی تھی جیسے فیروزکوہ یا غزنی کوہ کو، حضرت فیروز کوہ اور حضرت غزنی کہتے تھے۔ اس کے علاوہ خاندانِ غلامان کا پہلا سلطان التمش تھا۔ اس کا نام دراصل التتمش تھا مگر اردو کی زیادی تر کتابوں میں التمش لکھا جاتا رہا جو یقینی طور پر درست نہیں کیونکہ معتبر منابع کی روشنی میں اس کا نام کتبات اور سکوں اور اس کے معاصر ادب میں بھی التتمش ہی تحریر و کندہ ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ دہلی کا سلطان بنا تو دہلی علم و ادب کا مرکز بنی اور مہاجر علماء اور فضلاء کا بہت بڑا کارواں یہاں منتقل ہوا۔ اور دہلی پورے ہندوستان کا دارالسلطنت بن گئی۔ جس کی وجہ سے مشرقی ممالک میں دائرہ اسلام کا مرکز بنی اور حضرت دہلی قبۃ الاسلام کہلانے لگی۔ مگر اس کو بھی لوگوں نے مسجد کا نام سمجھ لیا۔ اور بہت سے لوگوں نے تو اس کو قوت الاسلام ہی کہنا شروع کر دیا۔ جو سراسر غلط تھا اور ہے بھی۔ دراصل یہ 'حضرت دہلی' کے لیے استعمال ہوا تھا۔ قدیم جامع مسجد کے ایک کتبہ میں 'جامع مسجد قبۃ الاسلام' کندہ ہے۔ یعنی قبۃ الاسلام کی مسجد، یعنی 'حضرت دہلی' کی جامع مسجد (مہرولی کی جامع مسجد) اس کے علاوہ دوسرے ماخذوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ امیر خسرو کے دیوان دیباچۂ غرۃ الکمال میں بھی اس نے دہلی کو قبۃ الاسلام ہی تحریر کیا ہے۔ یہ ایک مستند ماخذ ہے۔ (غرۃ الکمال، ص 109)

اس مقدمے میں عہد وسطی میں شہروں کے تعمیری طرز اور نئے شہروں کی تعمیرات عمارات کے خوبصورت ڈیزائین، باغات، حوض، نہریں، مدرسے، دارالشفاء، ہسپتال، بیمارستان اور رباط یعنی خانقاہوں یا مغلوں کے عہد میں ان کو سرائے کہا گیا۔ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور کچھ غلط رائج کہانیاں، باتیں، اور اصطلاحات کی نشاندہی کے ساتھ ان کو معتبر ماخذ سے درست تحریر کیا گیا ہے۔ مثلاً 'رباط' کو وسط ایشیا اور ایران میں دسویں صدی عیسوی تک رباط ہی کہتے تھے۔ رباط یعنی مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے عمارتیں تعمیر ہوتی تھیں۔ عرب ممالک میں شہروں کے باہر یا شاہراہوں پر ان کو 'رباط' کہتے تھے۔ مگر گیارھویں صدی میں ان کو 'خانقاہ' کی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔

اب اس مقدمہ میں اقتدار صاحب نے، بشیر الدین احمد دہلوی نے جو غلطیاں کی تھیں، ان کی طرف نشاندہی کی ہے۔ مثلاً کھڑکی کی مسجد، خان جہان وزیر کی مسجد۔ اس کے بارے میں انھوں نے جو اطلاع دی ہے وہ سنہ تاریخ سے متعلق ہے جو غلط ہے۔ مختلف شواہد کی روشنی میں اقتدار صاحب نے اس کو درست کر کے تحریر کیا ہے۔ اور ایک جگہ خان خاناں کے مقبرے کے بارے میں بھی اہم اطلاعات دیتے ہیں۔ ان کے مطابق جو یقینی طور پر درست ہے۔ کہتے ہیں یہ منسوب اور مشہور تو خانخاناں کے نام سے ہے مگر دراصل یہ مقبرہ ان کی اہلیہ کا تھا۔ جس کا ثبوت عبدالرحیم خانخاناں کے ملازم عبدالباقی نہاوندی کی 'مآثر رحیمی' میں ملتا ہے۔ جس میں اس مقبرے کی تمام تفصیلات درج ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سرسید اور پرسی براؤن نے بھی غلط روایت کی بنا پر خانخاناں کا مقبرہ لکھا ہے۔ اس وقت تک مآثر رحیمی شائع نہیں ہوئی تھی اس لیے یہ غلطی سرزد ہوئی۔ اس طرح موٹھ کی مسجد کے بارے میں بشیر الدین صاحب نے مقامی روایات کی بنا پر اس کے بارے میں وہی لکھ دیا جو زبان زد عام تھا۔ جبکہ اس مسجد کو بنوانے والے سکندر لودی کے وزیر مسند عالی میاں بہلول تھے۔ اس میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا تھا جس کے چلانے والے شیخ عبدالقدوس گنگوہی تھے اور ایک وقف بھی قائم کیا گیا تھا جس سے اس کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔

مقدمے کے آخر میں اقتدار صاحب بشیر الدین احمد کو ان کے معاصرین میں سب میں ماڈرن اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مصنف مانتے تھے۔ اور ان کی کتاب کو سیر المنازل اور سرسید کی آثار الصنادید کے مقابلے میں فوقیت دیتے تھے اور ان کو اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کا واقف کار مصنف کہتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا پہلا حصہ جو جلد دوم اور سوم پر مشتمل ہے تاریخ کے اسکالرس میں ہمیشہ مقبول رہا ہے اور تاریخ کے ماخذ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے اور ادب وثقافت کے محققین کے لیے بھی بحیثیت ماخذ بڑا اہم ہے۔

■

Dr. Mahtab Jahan
Asst Professor, Depf of Persian
Delhi University
Delhi - 110007
Mob.:9717412946

اکمل نعیم صدیقی

متوسط اور نچلے طبقے کا میں طرفدار ہوں کہ خود میں انہیں میں سے ہوں

حبیب کیفی

ایسا ہر دور میں ہوتا رہا ہے کہ ظاہری چمک دمک اور عارضی تشہیر سے لاتعلق کچھ لوگ اپنے فن اور اس کی ریاضت میں اس قدر محو رہتے ہیں کہ انہیں دنیاوی کامیابیوں نیز انعام و اکرام کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک بڑی وجہ رہتی ہے کہ ایسے ہی لوگ ڈوب کر سچے موتی لے آیا کرتے ہیں۔ گو کہ ایسے لوگوں کی تعداد ہمیشہ ہی بہت کم رہی ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں اردو اور ہندی کے ادیب و شاعر حبیب کیفی کا شمار بھی ہوتا ہے۔ کیفی پچھلے پچپن برسوں سے بھی زیادہ عرصہ سے افسانہ، ناول، ڈرامہ اور شاعری کے میدان میں سرگرم عمل ہیں۔پیش ہے ان سے اکمل نعیم صدیقی کی خصوصی گفتگو :

اکمل نعیم صدیقی: حبیب کیفی صاحب، شاعروں اور ادیبوں سے بالعموم یہ پوچھا جاتا ہے کہ ان کے ادبی سفر کی ابتدا کیسے ہوئی۔ خود میں بھی آپ کے سامنے یہی سوال رکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں اس کا پس منظر بھی جان لینا چاہوں گا۔

حبیب کیفی: اکمل نعیم صاحب، بیک وقت میں کئی اصناف میں کام کرتا ہوں۔ کیا آپ وضاحت کریں گے کہ کس صنف کی ابتدا کے متعلق آپ جاننا چاہتے ہیں ؟

ان: سب سے پہلے میں افسانے کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔

حبیب کیفی: یہ دسویں یا گیارہویں جماعت کی بات ہے۔ ہندی پڑھانے والے ٹیچر نے اسکول میگزین کے لیے مجھ سے کہانی لکھنے کے لیے کہا۔ میں نے انہیں ایک کہانی لکھ کر دے دی جس کا عنوان ودھوا تھا۔ لیکن اسکول میگزین نہ چھپنے کے سبب کہانی رہ گئی۔ اسکول سے فارغ ہونے کے کوئی دو سال بعد 1964 میں یہ کہانی میں نے عورتوں کے مقامی ماہنامے 'سویم سدھا'، کی ایڈیٹر کو دے دی۔ انھوں نے اسے اپنی میگزین میں شائع کر دیا۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔ تب میں حبیب الرحمٰن حبیب ہوا کرتا تھا۔لیکن اردو میں باقاعدہ افسانے لکھنے کی ابتدا کوئی چار برس بعد 1968 میں ہوئی۔ مارچ کے مہینے میں ایک افسانہ ہو گیا، عنوان تھا وہ تین۔ یہ افسانہ میں نے دہلی کے ادبی ماہنامہ تحریک کو بھجوا دیا جو مئی کے شمارے میں شائع بھی ہو گیا۔ اسے میں نے معمولی بات جانا۔ لیکن یہی بات میرے لیے غیر معمولی ثابت ہوئی جب میں نے تحریک میں قارئین کے مکتوبات والا کالم جون کے شمارے میں دیکھا تو یہ دیکھ کر حیرت انگیز مسرت ہوئی کہ افسانے کی تعریف میں کئی خطوط شائع ہوئے تھے۔ ایک قاری نے تو افسانے کے مرکزی خیال پر بڑی عمدہ تصویر بھی بنا ڈالی تھی۔ یہ سب دیکھ کر میں افسانہ نویسی کی طرف راغب ہو گیا اور یہ سلسلہ چل نکلا۔

بعد میں ہندی کے نامور ادیب اور اول درجے کے افسانہ نگار کملیشور کی رائے اور اپنے عزیز اکشگیا کے مشورے پر میں ہندی میں بھی لکھنے لگا۔ میری کہانیاں مشہور رسائل میں شائع ہو کر سند قبول عام حاصل کرنے لگیں تو بڑی تسلی ملی کہ چلو محنت کام آئی۔ اسی مقام پر میں یہ بتا دوں کہ میرے افسانے کچھ دیگر زبانوں میں منتقل ہو کر شائع ہوتے رہے ہیں تو کچھ افسانوں کو ڈراموں کے قالب میں ڈھال کر انھیں اسٹیج بھی کیا گیا ہے، اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ نیز یہ کہ میرے پانچ افسانوں کو شارٹ فلموں کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ان کے عنوان ہیں؛ دور مغلیہ کی یاد، بھائی، زاہدہ، چھلانگ اور وہ تین۔

رہی بات افسانوں کے پس منظر کی تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کے پسماندہ طبقے اور مڈل کلاس نیز مزدوروں اور دلتوں کی محرومیاں اور ناکامیاں میں اپنے افسانوں میں بیان کرتا ہوں کہ خود میرا تعلق محنت کش طبقے سے ہے۔ اس کا کہیں یہ مطلب نہیں کہ میں کسی خاص نوع سے بندھ کر رہ گیا ہوں۔ اعلی طبقہ، بلکہ راجہ مہاراجہ بھی میرے ادب میں شامل ہیں۔ تاہم حقیقت تو یہ ہے کہ مزدور اور پتھر تراش طبقے میں آنکھ کھولنے نیز استحصال زدہ لوگوں میں سے ہونے کے سبب میں ان ہی کا طرف دار ہوں۔ بتا دوں کہ میرے والد خود بھی پتھر کی کان میں کام کیا کرتے تھے۔ میں جب ایک ہی برس کا تھا تو بہت چھوٹی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ایسے میں مالی اعتبار سے گھر کے حالات نہایت ہی ناسازگار رہے۔ ان حالات میں والدہ نے کھیتوں میں کام کیا اور بعد میں عورتوں کے کپڑے سینے لگیں۔ اسکول جانے کے زمانے میں دونوں بڑے بھائیوں کو گمٹھے پر مزدوری کے لیے جانا پڑا۔ بعد

میں یہ بھی سنگ تراشی کا کام کرنے لگے۔ ہوتے ہوتے یہ دونوں ہی اپنی لگن، محنت اور ذہانت کے سبب بڑے ٹھیکیدار بن گئے اور برسوں پہلے دنیا سے جب گئے تو آسودہ حال تھے۔ مجھے اسکول جانا نصیب ہوا اور اس سے فارغ ہوکر میں مقامی بجلی گھر میں کلرک ہوگیا۔ بتا دوں کہ بھائیوں کی طرح میں نے بھی تھوڑے وقت کے لیے پتھر تراشی کی تھی۔

ادب یا افسانوں کے پس منظر کے ضمن میں یہ بھی کہ بچپن سے ہی مجھے کتابیں اور رسالے پڑھنے کا شوق رہا ہے اور میری یہ خوش بختی رہی کہ شروع میں ہی مجھے اعلیٰ اور معیاری ادب کی کتابیں مل گئیں۔ اردو میں بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو کے افسانے ملے تو ہندی میں پریم چند، الا چند جوشی، ہزاری پرساد دویدی، کملیشور، بھگوتی چرن ورما اور دھرم ویر بھارتی کے ادب سے میں گزرا۔ اسی طرح ٹالسٹائے، گورکی، او ہنری، چے خف، سارتر جیسے عالمی شہرت یافتہ ادبا کو میں نے پڑھا۔ اس طرح ذاتی تجربات، مشاہدات اور مطالعے کے کولاژ کو آپ پس منظر کا نام دے سکتے ہیں۔

ان: بہت خوب کیفی صاحب۔ اچھا، آپ بتائیں کہ آپ نے اب تک کتنے افسانے تخلیق کیے ہیں اور آپ کے اب تک کتنے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں؟

حبیب کیفی: گننے بیٹھوں تو 100 کے آس پاس افسانوں کی تعداد ہوگی۔ افسانوی مجموعوں کی تعداد ہندی میں چار ہے اور اردو میں صفر...

ا ن : آپ کے افسانوں پر کچھ کام بھی ہوا ہے کیا؟ مثلاً کوئی تنقیدی مضمون وغیرہ؟

حبیب کیفی: بتا چکا ہوں کہ دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے علاوہ ڈراموں کے قالب میں بھی انھیں ڈھالا گیا ہے اور شارٹ فلمیں بھی بن رہی ہیں۔ تحقیقی کام کا جہاں تک تعلق ہے تو اب تک ہندی میں چار لوگ کام کر چکے ہیں۔ ان افسانوں کے حوالے کئی بار کئی جگہ دیے جاتے رہے ہیں۔ رہا سوال تنقیدی مضمون کا تو اردو میں تو اب تک نہیں۔ اور مجھے اس کی کوئی شکایت بھی نہیں ہے۔ ہندی میں کئی مضامین ہیں ان افسانوں پر۔

ان : شاعر کی حیثیت سے بھی آپ کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ شاعری کی ابتدا کے تعلق سے بھی کچھ بتائیں؟

ح ک : ایک بار پھر مجھے اسکول کا زمانہ یاد آتا ہے۔ مدرسے میں تھوڑی بہت شناسائی ہوئی تھی اردو سے۔ بعد میں اسکول میں بھی ایک یا دو کلاس میں اردو پڑھنے کا موقع ملا۔ بس اس کے بعد اپنے ذوق اور شوق کے سبب اردو لکھنا پڑھنا سیکھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ہائر سیکنڈری امتحان سے پہلے وداعی پروگرام کے لیے بنا کسی استاد یا رہنما کے میں نے ایک نظم کہہ ڈالی۔ میں نے یہ نظم سنائی تو بہت پسند کی گئی۔ یہ 1961 کی بات ہے۔ بعد میں چائنا سے جنگ ہوئی تو میں نے ایک نظم کہی۔ وطن پرست دوستو، خون دو خون دو... نظم بڑی مقبول ہوئی اور جب یہ ہندی رسائل میں شائع ہوئی تو دور تک مجھے ایک شاعر کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔ بعد میں تو مجھے شعری نشستوں اور مشاعروں میں بھی مدعو کیا جانے لگا۔ میری کوشش یہ رہی کہ میں عام روش سے ہٹ کر شاعری کروں۔ انھی دنوں میں نے غالب، مومن، میر، انشا جیسے کلاسک شعرا کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی تو فیض، مخدوم، ساحر، مجاز اور علی سردار جعفری جیسے ترقی پسند شعرا سے بھی مستفیض ہوا۔ نیز میں نے جدید شاعری کی طرف توجہ دینے کے علاوہ کچھ دیگر زبانوں کے ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے شاعروں کی طرف بھی توجہ دی۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مقامی طور پر میں نے کہنہ مشق شاعر پنڈت موہن لال کول سے بھی مشورہ لیا۔ ہوتے ہوتے کب میرے اشعار اور نظموں کو اہمیت حاصل ہوگئی کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔

اسی مقام پر میں ایک بات بتاتا چلوں کہ اردو کے لاتعداد شاعروں اور درجنوں مستند مشاہیروں کے درمیان ہی مجھے اس بات کی تسلی ہے کہ میرے کچھ اشعار دور دور تک مشہور ہیں۔ شاید نظمیں بھی۔ کوئی پچپن برس پہلے کہی گئی غزل کے دو تین شعر بھی شائقین شاعری کو اب بھی ازبر ہیں۔

ا ن: تاج محل کے تعلق سے آپ کا شعر...

حبیب کیفی: ہاں، اس کا بھی بیک گراؤنڈ طبقاتی ٹھہرا۔ تاج محل پر ساحر لدھیانوی کی نظم دنیا کی پچاس سے زیادہ زبانوں میں منتقل ہوکر عالم گیر ہو چکی ہے۔ پسماندہ اور مزدور طبقے کے تعلق سے نظم کا اختتامیہ شعر ہے۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اسی طرح شکیل بدایونی کے فلمی شعر کو آپ کھائے پیے مست لوگوں کی نمائندگی کرنے والا شعر کہہ سکتے ہیں۔

ایک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

لیکن متوسط طبقے کے لوگوں کی نمائندگی کرنے والا شعر دور تک دکھائی نہیں دیتا، اسی ایک بات کو ذہن میں رکھ کر کوئی آدھی صدی قبل خاکسار نے جو غزل کا شعر کہا وہ کچھ اس طرح سے ہے۔

مانا تجھ کو تاج محل کا ماڈل اچھا لگتا ہے
لیکن یہ بھی کیسے لے دوں اس کے بھی ہیں دام بہت

ا ن: بہت عمدہ، کیفی صاحب آپ کے شعری مجموعوں کی تعداد کتنی ہے؟

حبیب کیفی: راستہ مل جائے گا، عنوان سے ایک شعری مجموعہ 2016 میں منظر عام پر آیا تھا اور راستے چلنے لگیں گے، نام سے اردو غزلوں کا ایک شعری مجموعہ ہندی میں ابھی دو برس پہلے شائع ہوا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ ہندی زبان کے جاننے والے بھی بڑی تعداد میں میری شاعری کو پسند کرتے ہیں۔

ا ن: قارئین کے لیے اپنے چند اشعار عنایت فرمائیں گے آپ؟

حبیب کیفی:

آج پھر تیری گلی میں شخص وہ پایا گیا
جس کو تیرے حکم سے پھانسی پہ لٹکایا گیا

مدت سے قفس میں ہمیں رکھ چھوڑا ہے تم نے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

چراغ ہوں میں سر راہ جلتا رہتا ہوں
جسے بھی چاہیے لے جائے روشنی مجھ سے

ہم تو واقف تھے تیرے انداز سے
دیکھنے والوں نے دیکھے سبز باغ

کترا کے نکل جاتا ہے جو بھیڑ میں اکثر
تنہائی میں مجھ سے وہی رو رو کے ملا ہے

ڈوبنے والے کو پانی میں کبھی مت ڈھونڈنا
ہر کسی کی آنکھ میں وہ تیرتا مل جائے گا

انھیں اشعار کی روشنی میں آپ کو اور ذی شعور قارئین کو میرے شعری مزاج اور معیار کا اندازہ ہوجائے گا۔

ا ن : بہت عمدہ، یقیناً کیفی صاحب، سب جانتے ہیں کہ آپ بیک وقت کئی اصناف ادب میں سرگرم رہتے ہیں۔ آپ بتائیں گے کہ ان دنوں کیا چل رہا ہے؟

ح ک : پچھلے ماہ میں نے اپنا نواں ناول پانی پانی مکمل کر کے پبلشر کو دیا ہے جو جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔ اس کے علاوہ ایک افسانہ ہوا ہے تمنا خانم یہ بھی بہت جلد شائع ہونے والا ہے۔ ان دنوں کچھ ضروری پڑھنے کے علاوہ میں اپنے نئے ناول سنگتراش کی تیاری میں ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ میرا دسواں ناول ہوگا۔ ان شااللہ

ان: کیفی صاحب ایک ناول لکھنے میں تقریباً آپ کو کتنا عرصہ لگ جاتا ہے؟ میرا مطلب ہے آپ کا کتنا وقت صرف ہوجاتا ہے؟

حبیب کیفی: اکمل نعیم صاحب، اس کے متعلق پکے طور پر کوئی کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اپنا پچھلا ناول پانی پانی میں نے کوئی چھ برسوں میں مکمل کیا تو آٹھواں ناول بہ عنوان 'جادوئی آئینہ' چھ ماہ میں ہی مکمل ہوگیا تھا۔ اب جو

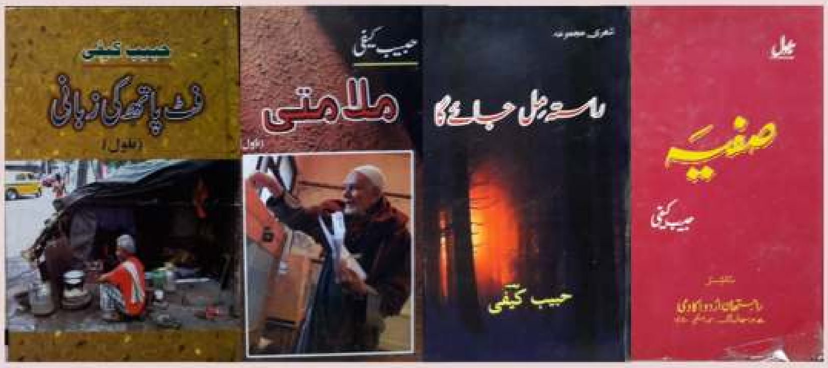

ناول شروع ہونے جا رہا ہے سنگتراش، اس کی بنیاد تقریباً چالیس برس قبل ہی پڑ گئی تھی۔ ہے نا مزے کی بات؟ ہاں، اگر فارمولا یا جاسوسی ناول کی بات ہوتی تو وقت معین بھی ہوتا۔ محنت تو اس میں بھی بہت لگتی ہے لیکن وقت، طوالت اور کردار نیز حالات و مقامات وغیرہ قریب قریب پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ ناول نگار کو ادا کی جانے والی رقم بھی، کیونکہ معاملہ سارا ہی کمرشیل ہوتا ہے۔ پیشگی رقم بھی ملتی ہے ناول نگاروں کو! خوشی کی بات ہوئی نا!

ان: افسانوں سے ناول کی طرف آنا کیوں کر ہوا؟

حبیب کیفی: کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے... والا معاملہ رہا۔ صنف افسانہ کی ایک حد ہوتی ہے۔ محدود دائرے اور کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہہ دینا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ کہنا ہو، کرداروں کو کھول کر پیش کرنا ہو، حالات و ماحول کی بھرپور عکاسی کرنا ہو اور اس بہانے اپنی بات بھی کہنا ہو یعنی ڈھکے چھپے اپنے خیالات کا اظہار بھی کرنا ہو تو یقینی طور پر مصنف کو صنف ناول کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ایسی ہی تمام باتوں کے مدنظر میں نے 1976 میں ایک ناول لکھا انا یک لیکن یہ شائع ہوا 1981 میں۔ یہ میری خوش قسمتی رہی کہ پہلے ہی افسانے کی طرح میرے اس ناول کو بھی بہت پسند کیا گیا اور ہندی میں آئے اس ناول کو راجستھان ساہتیہ اکادمی، اودے پور نے برس 83-1982 کے لیے، 'رانگے راگھو پرسکار' سے نوازا۔

ان: کیفی صاحب، اپنے اس پہلے ناول، انا یک کے پلاٹ وغیرہ کے متعلق کچھ بتائیں۔ یہ بھی بتانے کی زحمت کریں کہ اس کی تحریک آپ کو کہاں سے ملی؟

حبیب کیفی: میں نے آپ سے پہلے بھی ذکر کیا کہ میں مزدوروں اور سنگ تراشوں کے طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے شہر جودھپور کے ارد گرد سیکڑوں کی تعداد میں پتھر کی کانیں ہیں۔ انھیں کانوں میں کام کرنے والوں کے مسئلے مسائل ہیں اس ناول میں۔ ٹھیکیداروں کے کردار بھی یہاں کھلتے ہیں۔ شہری زندگی کے علاوہ اطراف کے گاؤں بھی بولتے ہیں اس میں۔ فرقہ واریت، ذات پات اور بے روزگاری کا سوال بھی اس میں اٹھایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بہت تھوڑے میں ہی سہی، جنگ اور فوجی کا ذکر بھی ناول میں ملے گا۔ ناول مقبول ہوا اور کچھ عرصے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ گیا۔ حوصلہ بڑھا تو افسانے لکھتے ہوئے اور شعر کہتے ہوئے میں اگلے ناول کی پلاننگ کرنے لگا۔

ان: اپنی اس پلاننگ کو آپ نے عملی جامہ کب پہنایا؟ آپ کے اس دوسرے ناول کا موضوع کیا تھا؟

حبیب کیفی: اکمل صاحب، بات یہ ہے کہ، 1979 میں میرا تبادلہ گوڈواڑ کے فالنا بجلی گھر میں ہو گیا۔ یہاں میں پورے چھ برس رہا۔ اس دوران 1983 میں وہیں نوکری کرتے ہوئے میرا دوسرا ناول صفیہ ہوا۔ اس کے موضوع کے متعلق کیا بتاؤں..... یہ ایک ایسی عورت کی داستان ہے جو اپنے رقص اور گانے سے لوگوں کی دلجوئی کرتی ہے اس کے ساتھ ہی دل میں یہ آرزو بھی رکھتی ہے کہ دیگر شریف عورتوں کی طرح شادی کر کے گھر گرہستی میں رچ بس جائے۔ اس کی یہ آرزو پوری بھی ہو جاتی ہے لیکن کئی مشکلات کے بعد وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو پاتی ہے۔ صفیہ کی جدوجہد کو بطور خاص فوکس کیا گیا ہے ناول میں۔ یہ ناول پہلے کلکتہ اب کولکاتا کے ایک ہفتہ وار میں قسط وار مسلسل شائع ہوا اور بعد میں کتابی شکل میں سامنے آیا۔ بہت برس قبل اردو چینل نے صفیہ پر ایک سو چار اپیسوڈ کا سیریل بھی اس شرط پر بنانے کی خواہش ظاہر کی تھی کہ بنیادی طور پر میں انہیں کچھ تبدیلیوں کی اجازت دے دوں۔ لیکن میں نے ان کی شرط کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس طرح بات آئی گئی ہو گئی۔

سیریل کی بات چلی تو بتا دوں کہ کوئی دو دہائی قبل گووند ورما جودھپور ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر ہو کر آئے تھے۔ انھوں نے اور ان کی اہلیہ نے ناول پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا تھا کہ اسے میں ریڈیو ڈرامے کی شکل دے ڈالوں۔ سو میں نے انھیں کے کہے مطابق اپنے اس ناول کو تیرہ اپیسوڈ پر مشتمل ڈرامے کا جامہ دے ڈالا۔ اسے جب قسط وار نشر کیا گیا تو بے حد پسند کیا گیا۔ بعد میں اسے کئی ریڈیو اسٹیشنوں سے سنایا گیا اور کوئی پچھلی دو دہائیوں سے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

ان: آفرین، کیفی صاحب، اگر صفیہ پر ٹی وی سیریل بنتا تو یقینی طور پر بہت پسند کیا جاتا اور مقبول ہوتا۔ صفیہ کے بعد آپ نے کون کون سے ناول لکھے؟ ان کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔

ح ک: میرا تیسرا ناول گمنا رہا جو پالی، مارواڑ کے گوڈواڑ علاقے کے گراسیا ادیباسیوں کو لے کر لکھا گیا۔ فالنا میں قیام کے دوران ان لوگوں کو میں نے قریب سے دیکھا اور جانا تھا۔ فالنا چھوڑنے کے بعد 1994 میں، میں نے اسے تحریر کیا تو یہ ممبئی مہانگر کے ساتھ ہی جے پور کے دینک نوجیوتی کے میور پنکھ میں قسط وار شائع ہوا۔ بعد میں یہ دہلی سے کتابی شکل میں 1999 میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ یہ اسمیا زبان میں بھی منتقل ہوا اور 'برنالی' [دھنک] میں قسط وار چھپنے کے بعد کتابی شکل میں بھی آ گیا۔ یہی ناول اب انگریزی میں بھی ہے اور اس کا ایڈیشن بھی ہوا ہے۔ دو لوگوں نے اس پر تحقیق کی ہے۔ کئی جگہ اس کے حوالے بھی دیے جاتے ہیں۔

گمنا کے بعد میں نے ایک تجرباتی ناول 'رانی صاحبہ' لکھا۔ اسے لکھنے میں میں نے کئی تجربات کیے۔ کہیں اسے میں نے ڈائری اسٹائل میں لکھا تو کہیں اسے ویڈیوگرافی کا نمونہ بنایا۔ کہیں کہیں داستان گو ناول کو آگے بڑھاتا ہے تو کہیں ردی کے صفحات میں یہ ملتا ہے۔ اس کا موضوع ہندوستان پر ایک ڈکٹیٹر کے راج کا تصور کیا گیا ہے۔ اس میں جمہوریت بھی ہے اور سب سے بڑی بات اس میں ایک اچھی اور سچی محبت کی داستان بھی ہے جو دو سطحوں پر چلتی ہے۔ اس ناول کے عنوان کے مطابق راجے رجواڑوں کا ذکر تو اس میں ہے ہی۔ اس ناول پر بھی تحقیقی کام ہو چکا ہے اور اب پھر ہونے والا ہے۔

میرا پانچواں ناول ملامتی نام سے ہے۔ یہ ایک عمر رسیدہ بزرگ کی داستان ہے جو تنہا ہے اور بے یار و مددگار ہو جانے سے پہلے اپنے بچوں، بطور خاص تینوں بیٹوں کو کسی قابل بنا ڈالنے اور ان کے لیے شاندار رہائش گاہوں تک کا انتظام کر کے قلاش ہو چکا ہے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی بیٹا اس بزرگ کی بنیادی ضرورتوں تک کا خیال نہیں کرتا تو بہوؤں کا تو رحم دل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پوتے پوتیوں اور سسرال کی ہو چکی بیٹیوں کو

البتہ احسان علی نامی اس بزرگ کا خیال ضرور ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ دیسی جڑی بوٹیوں میں دلچسپی رکھنے والے احسان علی کو اولاد نرینہ کا ایک نسخہ ہاتھ لگ جاتا ہے جسے وہ دہلی کے ایک نامی دواخانے کو دے ڈالنا چاہتا ہے۔ خط وکتابت کے دوران ہی بزرگ کو اپنا گھر چھوڑ دینے کے لیے مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت اور ضرورت کا پتہ گھر والوں کو اس وقت لگتا ہے جب دواخانے کے نمائندے اس کے یہاں آ کر وہ ایجاد کردہ نسخہ حاصل کر لینے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں اور اس کے عوض بہت بڑی رقم ادا کرنے کی بات چلتی ہے۔

میرا ایک ناول آشرم نام سے بھی ہے جو بہت پہلے لکھا گیا تھا لیکن اس کی اشاعت ابھی دو برس پہلے ہوئی تھی۔ ناول ان لوگوں کو لے کر لکھا گیا جو کبھی شاد وخرم تھے اور مالی اعتبار سے اپنا ایک الگ ہی مقام رکھتے تھے۔ لیکن وقت اور حالات کے پلٹ جانے کے سبب بے یارو مددگار ہو کر آشرم میں رہنے کے لیے مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ اس میں بھی داستان محبت کہی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ابھی انسان اور انسانیت کے زندہ ہونے کی بات بھی زور دے کر کہی گئی ہے۔

اسی طرح میرا ایک اور ناول ہے جادوئی آئینہ۔ ماضی، حال اور مستقبل تینوں ہی زمانوں کو دکھا دینے کی بات اس میں ایک آئینے کے تعلق سے کہی گئی ہے۔ اس بہانے سے کئیوں کے کردار کھل کر سامنے آتے ہیں اور کچھ کردار یاد رہ جانے والے بن گئے ہیں۔ ناول میں جنگ وجدل کو فضول بتایا گیا ہے اور محبت کو ترجیح دی گئی ہے۔ یہاں بطور خاص نوجوانوں کی محبت کی بات ہے۔ یہاں بھی کچھ حد تک سیاست اور مافیا کا ذکر ہے۔ دو برس پہلے آئے اس ناول کی پسندیدگی کی دلیل یہ ہے کہ اس کا نیا ایڈیشن آیا چاہتا ہے۔

اب اپنے حالیہ ناول پانی پانی کی بات۔ یہ ناول ظاہر ہے کہ پانی کی قلت، اس کی بربادی اور فراہمی کو لے کر لکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے متعلق ابھی کچھ کہنا شاید قبل از وقت ہوگا۔ ناول کے تعلق سے ہی میں بتا چکا ہوں کہ اپنے دسویں ناول سنگتراش کی تیاری میں لگا ہوں۔

ان: حبیب صاحب، آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنے اب تک کے تمام ناولوں کے متعلق اس قدر معلومات فراہم کیں۔ یہ جان کر بھی خوشی ہوئی کہ ماشاءاللہ تکان کا کہیں نام ونشان تک نہیں ہے اور آپ افسانوں کے علاوہ ناول بھی لکھ رہے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، آپ کا رجحان ڈراموں کی طرف بھی رہا ہے۔ کچھ ان کے بارے میں بھی بتائیں تو قارئین کو خوشی ہوگی۔

حبیب کیفی: ڈرامے میں نے لکھے ضرور ہیں اور یہ اسٹیج بھی ہوئے ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ پہلا ڈرامہ میں نے 'شراب گھر' نام سے لکھا جو میں نے اپنے ہی ایک افسانے کی بنیاد پر لکھا تھا۔ اسے مشہور ڈراماٹسٹ مرحوم مدن موہن ماتھر کی ہدایت میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ یہ 1975 کی بات ہے۔ ڈرامہ کامیاب رہا اور ناظرین نے پسند کیا تو میں نے ایک فل لینتھ ڈرامہ بہ عنوان 'میں زندہ ہوں' لکھا۔ یہ ڈرامہ مقامی ٹاؤن ہال میں 10 اور 11 ستمبر 1977 کو دو روز اسٹیج ہوا۔ اس کی ہدایت دنیش سارسوت نے دی تھی۔ ڈرامہ میں ارجن دیو چارن، گیتا بھٹا چاریہ، دلیپ پریہار، کرشنا چھنگانی اور ہتیش ویاس جیسے منجھے ہوئے اور نامی اداکاروں نے کام کیا تھا۔ بتا دوں کہ معاملہ پوری طرح کمرشیل تھا اور اسے دیکھنے کے لیے ٹکٹ رکھے گئے تھے۔ ڈرامہ نہایت ہی کامیاب رہا اور مجھ سے مزید ڈراموں کی فرمائشیں کی جانے لگیں۔ لیکن میری کمزوری کہ اس طرف میں نے خاص توجہ نہیں دی۔ ایک صاحب نے تو اسی ڈرامہ میں ناچ گانے ڈال کر اسٹیج کرنے کا آفر دیا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ ظاہر ہے کہ اچھی خاصی رقم کو نظر انداز کر کے میں نے انھیں انکار کر دیا۔ بعد میں یہی ڈرامہ ریڈیو والوں نے مجھ سے لیا اور کسی تبدیلی کے بغیر ریڈیو کے مطابق بنا کر اسے نشر کیا تو یہاں بھی اسے بہت پسند کیا گیا۔ بعد میں یہ ڈرامہ کئی ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کیا گیا اور یہ سلسلہ شاید اب بھی جاری ہے۔

ان: ان دو ڈراموں کے علاوہ آپ کا کوئی اور ڈرامہ بھی ہے جو اسٹیج ہوا ہو؟

حبیب کیفی: نہیں، اس کے بعد میں نے اسٹیج ڈرامہ نہیں لکھا۔ البتہ میرے دو تین افسانوں کو بنیاد بنا کر ڈرامے ضرور لکھے گئے۔

ان: لیکن ریڈیو ڈرامے تو آپ نے لکھے ہی ہیں؟

حبیب کیفی: ہاں، اپنے ہی ناول صفیہ کو میں نے تیرہ اپی سوڈ کے ریڈیو سیریل میں تبدیل کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی میں نے کچھ ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں۔ جیسے میرا، وداع الوداع، کٹہرے، سویم ور وغیرہ۔ تعجب کے ساتھ ہی مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ صفیہ سیریل اور میں زندہ ہوں کی طرح اتنے برس بعد بھی ان ڈراموں کو گاہے بگاہے ریڈیو سے سنایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسٹیج ڈراموں اور ریڈیو ڈراموں کو لکھنے کی طرف طبیعت اب مائل نہیں ہوتی۔ یہ ایک حقیقت ہے۔

ان: کیا آپ نے کبھی فلموں کے لیے لکھنے کے بارے میں نہیں سوچا؟

حبیب کیفی: بتا دوں کہ کسی کے در پر جانا میری فطرت میں نہیں ہے۔ دو بار مجھے ممبئی بلایا گیا لیکن بات نہیں بنی۔ اس سلسلے میں بس اتنا ہی بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ دو فلموں کے منظر نامے اور مکالمے میں نے لکھے۔ یہ بھی ٹیلی فلمیں رہیں۔ فرینڈز فرسٹ اور جیسل رانی تولادے۔ ستر کی دہائی میں البتہ فلموں پر میں نے بڑی حد تک لکھا تھا۔

ان: اس کے علاوہ کوئی اور تجربہ؟

حبیب کیفی: صحافت کا تجربہ ضرور ہے۔ کچھ اخباروں میں کالم اور ایڈیٹوریل لکھے۔ کچھ پرچوں اور رسالوں کے مخصوص نمبر نکلے تو مہمان مدیر ہوا۔ اور ہاں، رٹائرمنٹ کے بعد پانچ برس تک روزنامہ 'دینک بھاسکر' کے مقامی ایڈیٹوریل میں کام بھی کیا۔

ان: آپ مختلف اصناف میں تخلیقی کام کرتے رہے ہیں اور کر بھی رہے ہیں، آپ کے مطابق کیا ان تمام اصناف کے مابین کوئی باہمی تعلق یا رشتہ بھی ہوتا ہے یا نہیں؟

حبیب کیفی: پہلے پہل میں یہ سمجھتا تھا کہ ہر صنف اپنے آپ میں مکمل اور آزاد ہوا کرتی ہے۔ لیکن جب میں شاعری سے افسانے کی طرف اور افسانوں سے ناول کی سمت اور اس کے ساتھ ہی ڈراموں کی طرف بڑھا نیز ان تمام اصناف پر بیک وقت کام کرنے لگا تو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اسی کے تحت میں نے جانا کہ کوئی بھی ادبی صنف اپنے آپ میں مکمل نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسی ڈور بھی ہوا کرتی ہے جو انہیں آپس میں باندھے رکھتی ہے۔ اسی لیے تو بسا اوقات اچھی نثر کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ واہ! یہ تو عمدہ شاعری ہوگئی۔ اسی طرح بیانیہ کو بھی شاعری کے زمرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ افسانے اور ناول کے رشتے کے متعلق تو عرض کر بھی چکا ہوں..... کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے۔ اس سے آگے کی بات کریں تو پائیں گے کہ موسیقی اور مصوری تک کا ادب کی ان اصناف سے رشتہ نکل آتا ہے۔

ان: آپ کا بہت بہت شکریہ حبیب کیفی صاحب کہ آپ نے اس قیمتی ملاقات کے لیے وقت دیا۔

حبیب کیفی: آپ کا بھی شکریہ اکمل نعیم صاحب کہ بڑی حد تک آپ نے میرے تخلیق کار کو کھولنے کی کامیاب کوشش کی۔

■

Akmal Naeem Siddiqui
G Sector, Pratap Nagar
Jodhpur- 342003 (Rajasthan)
Mob.: 9413844624
Email: vedandquraan@gmail.com

Habib Kaifi
72, Lala Lajpat Rai Colony,
5th Chopasani Road, Eidgah,
Jodhpur (Raj.) 342003

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

الف لیلہ و لیلہ (جلد اول، دوم، سوم، چہارم)

مترجم: ابوالحسن منصور احمد

صفحات: 368 (اوّل)، 465 (دوم)، 429 (سوم)، 347 (چہارم)

قیمت: 1185/روپے (مکمل سیٹ)

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر یوسف رامپوری، محلّہ ٹنڈولہ ٹانڈہ رامپور، یوپی

ایک زمانہ تھا جب لوگ داستانیں سنتے سناتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ داستانیں کہنے اور لکھنے کا سلسلہ تقریباً ہر زبان میں ہوا کرتا تھا، جو داستانیں زیادہ دلچسپ ہوتیں، وہ زبانوں اور ملکوں کی حدوں کو پار کرتے ہوئے دنیا بھر میں مشہور ہو جاتیں اور عوام الناس کے درمیان خوب پڑھی اور سنی جاتیں۔ ایسی داستانوں کی ایک طویل فہرست ہے جنھیں عالمی شہرت حاصل ہوئی اور ان کے تراجم دنیا کی بہت سی زبانوں میں کیے گئے۔ 'الف لیلہ و لیلہ' کا شمار بھی ایسی ہی داستانوں میں ہوتا ہے جنھیں شہرت دوام حاصل ہوئی اور جن کے تراجم دنیا کی بیشتر زبانوں میں کیے گئے۔ اگرچہ داستان 'الف لیلہ و لیلہ' سیکڑوں، ہزاروں سال قبل کہی یا لکھی گئی تھی، مگر اس کی مقبولیت میں کئی زمانے گزرنے کے بعد بھی کمی نہیں آئی ہے۔ آج جب کہ داستانوی عہد گزر چکا ہے اس کی جگہ سائنسی دور نے لے لی ہے۔ ہر چیز کو سائنٹفک میزانوں اور پیمانوں پر تولنے اور ناپنے کی کوشش کی جارہی ہے، تب بھی 'الف لیلہ و لیلہ' کا قصہ چہار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ اس پر فلمیں اور سیریزیں تیار کی جارہی ہیں جنھیں بڑے شوق کے ساتھ دنیا بھر میں دیکھا جارہا ہے۔

اردو کے داستانوی ادب پر طائرانہ نگاہ ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اردو میں داستانوں کا ایک بڑا سرمایہ موجود ہے۔ اس سرمایے میں بہت سی طبع زاد داستانیں ہیں اور بہت سی تراجم پر مبنی۔ اردو میں داستانوں کے ترجمہ کی روایت کئی سو سال سے چلی آرہی ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں بھی کئی شہرۂ آفاق داستانوں کے ترجمے کیے گئے، جن میں 'باغ و بہار' کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد اور بھی کئی اداروں نے ترجمے کے کام میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور بشمول داستانوں کے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ یہ ترجمہ شدہ کتابیں اور داستانیں وقتاً فوقتاً مختلف اداروں سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ موجودہ عہد میں جو ادارے طبع زاد کہانیوں کے ساتھ ترجمہ شدہ اردو داستانوں کی طباعت و اشاعت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سرفہرست ہے۔ اس ادارے میں قدیم داستانوں کی اشاعت کا کام تیزی کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ 'کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان' کے بعد قومی اردو کونسل سے 'الف لیلہ و لیلہ' کی سات جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

'الف لیلہ و لیلہ' بنیادی طور پر عربی قصہ ہے۔ اسے صدیوں پہلے عرب قصہ گویوں نے تخلیق کیا تھا۔ اول اول اس قصے کو عرب معاشرے میں پذیرائی حاصل ہوئی مگر چونکہ یہ قصہ بذاتہ اس قدر دلچسپ تھا کہ اس کی گونج عرب خطوں سے آگے دوسرے ممالک و اقوام تک پہنچی اور انھوں نے بھی اسے پسند کیا اور اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کرکے اس سے حظ حاصل کیا۔ اردو میں 'الف لیلہ و لیلہ' کے مختلف تراجم کیے گئے، لیکن پیش نظر ترجمہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد نے کیا ہے۔ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد عربی فارسی سمیت دنیا کی کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ وہ اور بھی کئی مشہور کتابوں کے مترجم ہیں۔

پیش نظر ترجمہ 'الف لیلہ و لیلہ' کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ اس لیے اس ترجمہ کو سمجھنا اردو سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھنے والوں کے لیے آسان ہے۔ اس ترجمہ میں مشکل لفظوں، محاوروں اور مشکل ترکیبوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس ترجمہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں خیال آرائی سے بھی اجتناب برتا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصے کے بیان میں کہیں بھی طوالت نظر نہیں آتی۔ طوالت سے گریز کرنے کے سبب کہانیوں میں اختصار بھی پیدا ہوگیا ہے۔ گویا کہ الف لیلہ و لیلہ جیسی طویل داستان جسے ایک ہزار ایک راتوں میں پیش کیا گیا تھا، وہ اتنی مختصر ہوگئی ہے کہ اسے چند دنوں یا ہفتوں میں پڑھا جاسکتا ہے۔ موجودہ عہد کی مناسبت کی وجہ سے یہ اختصار اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے لیے مترجم مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کاغذ بھی معیاری ہے اور طباعت بھی صاف ستھری ہے۔ اس کے باوجود قیمت نہایت مناسب متعین کی گئی ہے تاکہ ہر شخص اور ہر طالب علم اسے خرید سکے۔ ہر جلد میں 'پیش لفظ' موجود ہے جسے قومی اردو کونسل کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے لکھا ہے۔ ہر جلد میں کہانیوں کی فہرست پیش کی گئی ہے تاکہ قارئین پہلی نظر میں ہی یہ جان سکیں کہ کون سی کہانی کس صفحہ سے شروع ہورہی ہے۔ ایسے ہی وہ قارئین جو بالاستیعاب پوری داستان کے مطالعہ کا وقت نہیں رکھتے یا انھوں نے پہلے کچھ کہانیوں کو پڑھ رکھا ہے، ان سے گریز کرکے اپنی پسند کی کہانیاں پڑھ

سکیں۔قصہ بیان کرتے وقت مترجم نے پہلی رات، دوسری رات، تیسری رات کی سرخیاں بھی قائم کی ہیں اوران راتوں میں جو کہانیاں رقم کی گئیں، ان کے عنوانات بھی قائم کیے ہیں۔ قصے کا آغاز بسم اللہ اور خطبہ کے بعد ان سطور سے کیا گیا ہے:

’’اب جاننا چاہیے کہ اگلے لوگوں کے حالات ہم پچھلوں کے لیے ایک عبرت ہیں۔انسان کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔گزشتہ نسلوں کی کہانیاں پڑھ کر عبرت حاصل کرنی چاہیے۔پاک ہے وہ ذات جس نے پرانے لوگوں کی کہانیاں نئے لوگوں کی عبرت کے لیے بنائیں۔منجملہ عبرت آمیز کہانیوں کے وہ کہانیاں ہیں جن کا نام ’الف لیلہ ولیلہ‘ ہے اور جن میں بڑے بڑے شاندار حالات اور مثالیں بیان کی گئی ہیں۔‘‘

’الف لیلہ ولیلہ‘ کے پیش نظر ترجمے کو اردو زبان کی اشاعت کے نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ داستانیں ہمیشہ زبانوں کی ترویج واشاعت کا موثر ذریعہ ثابت ہوئی ہیں،اسی لیے فورٹ ولیم کالج میں اردو سکھانے کے لیے داستانیں لکھنے یا داستانوں کے ترجمے پر زور دیا گیا۔کیونکہ دلچسپ داستانیں قارئین کو اپنے آپ سے باندھ کر رکھتی ہیں اور وہ انھیں دلچسپی سے پڑھتے چلے جاتے ہیں،اسی درمیان وہ خواہی نہ خواہی زبان بھی سیکھتے چلے جاتے ہیں۔خشک تحریروں کا دیر تک پڑھنا آسان نہیں ہوتا،اس کے برعکس داستانوں یا کہانیوں کا مطالعہ طبیعت پر گراں نہیں گزرتا۔اردو زبان سیکھنے کے لیے آج بھی اس طریقے کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ طالب علموں کو داستانیں،افسانے اور ناول پڑھنے چاہئیں، یقیناً داستانوی ادب اردو زبان سے طلبا کو ہم آہنگ کرنے اور ان کی زبان کو بہتر بنانے میں معاون ثابت ہوگا۔اس طور پر دیکھا جائے تو قومی اردو کونسل کا قدیم داستانوں کی اشاعت کا عمل یقیناً مستحسن ہے۔اس سے زبان کے فروغ کی راہیں کھلیں گی۔پیش نظر ترجمہ میں زبان بھی آسان ہے اور قصے کی دلچسپی میں بھی کو فرق نہیں آیا ہے۔اس لیے اس کا مطالعہ دلچسپی اور افادیت سے خالی نہ ہوگا۔’الف لیلہ ولیلہ‘ میں ازمنۂ قدیم کی تہذیب ومعاشرت کی جھلکیاں بھی موجود ہیں،اس لیے قدیم زمانہ کے لوگوں کے رہن سہن، عادات واطوار اور تہذیبی ومعاشرتی حالات کا اندازہ بھی اس کتاب کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔گویا کہ یہ کتاب عہد جدید کے لوگوں کو عہدِ قدیم کی سیر بھی کراتی ہے۔ میرے خیال سے اردو کے قارئین اور طلبا کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔

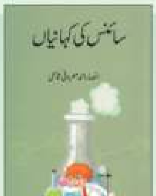

سائنس کی کھانیاں

مصنف: انصار احمد معروفی قاسمی

صفحات: 85، قیمت: 25روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد شاداب شمیم، D-35،فورتھ فلور،شاہین باغ، جامعہ نگر،نئی دہلی

’سائنس کی کہانیاں‘ انصار احمد معروفی قاسمی کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔اس میں 36 کہانیاں ہیں۔ان کہانیوں میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ زبان اور اسلوب سادہ ہو، جسے بچے بآسانی سمجھ سکیں۔اردو میں بچوں کے لیے سائنسی ادب پر کئی ادیبوں جیسے خلیل احمد، ڈاکٹر اسلم پرویز اور اندر جیت لال وغیرہ نے خامہ فرسائی کی ہے اور بچوں کے ذہن کے مطابق آسان زبان اور اسلوب میں کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں،موجودہ وقت میں بچوں کے لیے سائنسی مضامین اور کہانیاں تحریر کرنا وقت کا تقاضہ ہے۔یہ اکیسویں صدی ہے جسے سائنس اور ٹکنالوجی کا دور بھی کہا جاتا ہے۔اس کتاب کے ابتدائیے میں مصنف لکھتے ہیں’’سائنس کی کہانیاں بچوں کے لیے جمادات سے متعلق سائنسی کہانیوں کا مجموعہ ہے،جمادات بے جان چیز کو کہتے ہیں، جس میں بڑھنے کی قدرت نہ ہو، جیسے مٹی، دھات، سونا وغیرہ۔‘‘ جمادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ساری کہانیاں تحریر کی گئی ہیں۔

پہلی کہانی ’زمین کا بستر‘ ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے زمین کو بستر کی طرح پھیلا دیا ہے اوراس کے نیچے بہت سی معدنیات جیسے لوہا، کوئلہ، چونا اور دیگر قیمتی چیزیں رکھی ہیں، جو کہ ہماری زندگی میں بہت آسانیاں پیدا کرتی ہیں۔اس کے مثبت استعمال سے ہم اپنی زندگی کو خوش گوار بنا سکتے ہیں۔زمین کی اہمیت اور اس کی خوبیوں کو اس کہانی کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔دوسری کہانی خاکساری ہے،اس کہانی کے عنوان سے ہی واضح ہے کہ اس میں خاکساری وانکساری کا درس دیا گیا ہے۔انا،غرور و تکبر ایک ناپسندیدہ چیز ہے،خدا بھی اسے پسند نہیں کرتا ہے۔اپنے علم و ہنر یا دیگر کوئی اور چیز پر کبھی بھی غرور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ چیزیں انسان کو دھیرے دھیرے تباہ و برباد کرتی ہیں۔اس کہانی کا مقصد اور پیغام واضح ہے کہ کبھی بھی غرور نہیں کرنا چاہیے اور چونکہ انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے اس لیے اس میں عجز وانکساری ہونی چاہیے۔جس طرح مٹی میں نرمی وخاکساری ہے تو وہی صفات ہمارے اندر بھی ہونی ضروری ہے اور جب یہ خصوصیات ہوں گی تو یقیناً کامیابی وکامرانی ہمارے قدم چومے گی۔

ایک کہانی ’کچا گھر اور اردو نقل‘ کے عنوان سے ہے۔یہ کہانی مختصر ہونے کے باوجود بہت ہی اچھا پیغام دے رہی ہے۔اس کہانی میں بچہ جب اردو نقل لکھ رہا تھا تو اچانک اس کے مٹی اور پھوس کے بنے ہوئے مکان سے پانی ٹپکنے لگا جس سے کہ اس کی کاپی خراب ہوگئی۔بچہ اپنے والد سے ضد کرنے لگا کہ اس کا گھر پختہ کیوں نہیں ہے اور ہمارے گھر میں پانی کیوں ٹپک رہا ہے۔ پھر وہ سیمنٹ، بالو اور لوہے وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہے،اس کے والد بتاتے ہیں کہ سیمنٹ کس طرح بنتا ہے اور اس کو بنانے کے لیے کیا کیا چیزیں استعمال کی جاتی ہیں، اس طرح گفتگو کے انداز میں یہ بتا دیا گیا کہ سیمنٹ کس طرح تیار ہوتا ہے اور اس کی خاصیت کیا ہے اور بھی کہانیاں جیسے مٹی کے محاورے، زمین کو گھومنے کا شوق، ہماری زمین، خشکی اور برتری، مٹی کے سنگ، آواز کیوں اور کیسے، ضروری سوالات، نئی سائیکل اور سڑک، کوئلہ سینٹر، شاعر یا سائنس داں، پتھر اور تاج محل، چاول میں کنکر، المونیم اور برتن، چمکتی ابرک وغیرہ بہت اچھی ہیں، اور جمادات کے ذریعے بچوں کی سوچ اور ان کے ذہن میں پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے سوالات کا بڑی خوبصورتی سے جواب دیا گیا ہے۔ان کہانیوں میں بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔عام طور پر بچوں کے سوالات کو لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں جو کہ مناسب نہیں ہے،ضروری ہے کہ بچوں کے ذہن میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا تشفی بخش جواب سائنٹفک انداز میں دیا جائے۔اس کتاب میں زیادہ تر اسی طرح کے سوالات کے جواب کو کہانی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے،جس سے بچے بآسانی جمادات سے متعلق بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

تاج محل اور اردو ادب: تاریخی و ادبی پس منظر سے

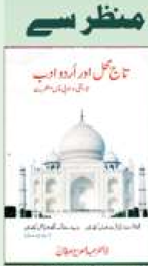

مصنف: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان
صفات: 228، قیمت: 144 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان
مبصر: ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی
نیا بازار، کامٹی۔ 441001، ناگپور (مہاراشٹر)

تاریخ کا طالب علم، محقق اور عام لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ شاہجہاں کی بیگم کا نام ممتاز محل تھا۔ مغل حکمراں شاہجہاں کا قیام برہانپور میں اپنی بیگم ممتاز محل کے ساتھ رہا۔ ممتاز محل کا حالتِ جنگ ہو یا امن کے ایام شاہجہاں کے ساتھ قیام ہوا کرتا تھا۔ اسی برہانپور میں ایک رات ممتاز محل وضع حمل کے دوران وفات پا گئیں۔ موت سے قبل شاہجہاں اپنی شریک حیات کے پاس حاضر ہوئے۔ ملکہ ممتاز نے انھیں جو بھی وصیت کی وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ بہرحال ممتاز کی وفات سے متعلق جو بھی حقائق ہیں ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان نے تاریخی حوالے سے پیش کیے ہیں۔ ملکہ ممتاز محل کی رحلت 17 ذیقعدہ 1040ھ میں بمقام شاہی قلعہ برہانپور میں ہوئی۔ ملکہ کی تدفین اول بمقام زین آباد، تاپتی ندی کے کنارے باغ عالم آرا میں ہوئی اور وہ مخصوص جگہ پاس باغ کہلاتی ہے۔ ڈاکٹر عرفان نے اس مقام کا منظر نامہ اس طرح پیش کیا ہے۔ 'چار دیواری کے احاطہ کے اندر ایک بوسیدہ عمارت، ایک مسجد اور ایک حوض ہے۔ دروازے کے نیچے ایک تہہ خانہ کا راستہ ہے... ایک خالی قبر ہے۔ یہی ممتاز محل کا عارضی مدفن ہے۔' ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان نے وہاں کی موجودہ حالت کا نقشہ بالکل صحیح پیش کیا ہے... وہاں کئی بار حاضری اور ایصال ثواب کا موقع مل چکا ہے۔ آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کو وہاں بہت کچھ دیکھنے کا موقع ملتا، سمجھنے اور حالات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ملکہ جس کا مدفن بعد میں تاج محل آگرہ بنا وہ کبھی اسی سرزمین پائین باغ زین آباد میں چھ ماہ تک مدفون رہ کر شاہی حکم کے مطابق اس کی نعش آگرہ منتقل کی گئی۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ 17 جمادی الاول 1041ھ مطابق یکم دسمبر 1631 زین آباد سے نعش آگرہ کے لیے بھیجی گئی۔ آگرہ 19 دسمبر 1631 مطابق 15 جمادی الثانی 1040ھ پہنچی۔ جہاں تک تعمیر تاج کا تعلق ہے ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان نے بحوالہ محمد صالح جس کی تصنیف شاہجہاں نامہ ہے تحریر کرتے ہیں: 5 جلوس میں جمنا کے کنارے جنوب کی طرف اس مقبرہ کی بنیاد رکھی گئی اور معماروں نے خوب گہری سنگین بنیادیں بھرنے کے بعد اس کی کرسی رکھی۔ پہلے 374 گز لمبا 140 گز چوڑا چبوترہ سولہ گز تک اٹھایا۔ اسی پر گز بھر کی کرسی دے کر بغدادی وضع ہشت پہلو مقبرہ تعمیر کیا۔ ڈاکٹر عرفان نے تاج روضہ کی تعمیر سے متعلق تمام تفصیلات بڑے تحقیقی انداز میں پیش کی ہیں۔ مکرانہ راجستھان سے سنگ مرمر کی سپلائی اور دیگر متعلقہ اہم باتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ملک و بیرون ملک کے باکمال معمار اور فنکار اس کی تعمیر میں حصہ لیتے رہے اور 22 سال کے عرصہ میں یہ مشہور زمانہ روضہ تاج محل مکمل ہو کر شاہ جہاں کے دور سے آج تک دنیا والوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا اور دعوتِ دیدار دے رہا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے بہت خوب ترجمانی کی ہے۔

وہ تاجدار شاہ جہاں صاحب سریر — بنوایا ہے انھوں نے لگا سیم و زر کثیر
جو دیکھتا ہے اس کے یہ ہوتا ہے دل پذیر — تعریف اس مکاں کی میں کیا کروں نظیر

اردو زبان و شاعری سے تاج محل کا کتنا گہرا رشتہ ہے، ڈاکٹر عرفان نے اس کی بھرپور نمائندگی کا فریضہ ادا کیا ہے۔ جن شعرا نے تاج محل پر جو بھی اشعار یا نظمیں تحریر فرمائیں وہ بھی اس کتاب کا اہم حصہ ہے۔

افتخار امام صدیقی مدیر شاعر ممبئی کی نظم 'تاج محل' کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

کوئی اس کا ثانی نہیں تھا، نہ ہے نہ ہوگا — ایک روشن کہانی دی ہے تاج نے

عبدالحفیظ انصاری برہانپوری کی نظم برہانپور اور تاج محل اور ممتاز محل کی برہانپور سے وابستگی ملاحظہ فرمائیں۔

دنیا سے مٹ سکا نہ کبھی دو دلوں کا پیار — ہے تاج لازوال محبت کی یادگار

محسن عباس محسن نے اسے کرشمہ کہا ہے۔

کرشمہ یہ بھی محبت کی ہے عقیدت کا — کہ پتھروں میں دھڑکتا ہے دل محبت کا
اے تاج تیری زمانے میں اب مثال نہیں — حسیں بہت ہیں مگر تجھ سا با جمال نہیں

عنوان چشتی نے کہا ہے۔

بولتے لگتا ہے فن تاج محل کی صورت — دست جمنا میں محبت کے کنول کی صورت
ہند و ایران کی تہذیب کا سنگم ہے یہ — کتنا بیدار نظر آتا ہے احساس جمال

سیماب اکبر آبادی فضا اور تاج محل کی دل نشینی کے تعلق سے کہتے ہیں۔

فضائے تاج تری دل نشین معلوم ہوتی ہے — میں یہ سچ کہہ دوں مجھے جنت یہیں معلوم ہوتی ہے
تیری تعمیر دیتی ہے نگاہوں کو سکوں کیا کیا — تیری تصویر کتنی دل نشیں معلوم ہوتی ہے

ان شعرا کے علاوہ سید علمدار حسین، سید کمال الدین ذاکر، راغب نوری، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، محمد افضل خاں، قیصر شمیم، محسن، احمد جلیسیری، احمد وصی، اسد رضا، امیر الدین امیر، تابش عظیم آبادی، رعنا سحری، دل تاج محلی، ڈاکٹر واصف خان یار، امجد حیدرآبادی، انس مسرور انصاری، رفیق شاہین، دیپک انجم، رضا حسن خان، جبین جوہر، ساحر تاج، شکیل بدایونی حافظ بھاگل پوری، حبیب سیفی، اکرم، اقبال اشہر، انجم آرا انجم، رئیس الدین رئیس، ایم آئی ساجد، ساحر کھتری، امر عظیم آبادی، ڈاکٹر عتیق خان وغیرہ نے بھی تاج محل پر جو کچھ کہا شامل کتاب ہے۔

ڈاکٹر عرفان نے بڑی محنت و مشقت کے بعد 'تاج محل اور اردو ادب' نامی کتاب کو زیور طباعت سے آراستہ کرکے اہل اردو کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ ان کا بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق کو عام فہم زبان میں بڑے شاندار انداز میں پیش کیا ہے۔ تاریخ اور تاریخی معلومات کو جب عوامی زبان میں پیش کیا جاتا ہے تب اس کی اہمیت، افادیت اور مقبولیت کا پرچم لہراتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان اس سلسلے میں پوری طرح کامیاب و کامران ہیں۔

کشکول اردو ادب

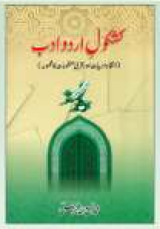

مصنف: محمد مطیع اللہ نازش
صفات: 384، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: حقانی القاسمی، نئی دہلی

'کشکول اردو ادب' اڈیشا سے تعلق رکھنے والے محمد مطیع اللہ نازش کے 'انتقادِ ادبیات اور نثری منظومات کا مجموعہ' ہے۔ اس میں مختلف اصنافِ ادب کے حوالے سے تحریریں ہیں جن میں سفرنامے، مرقع نگاری، خودنوشت، مکتوب نگاری، سانیٹ، ترائیلے، مزاح، ماہیے، دوہا وغیرہ شامل ہیں۔ اصنافِ ادب کے حوالے سے کتب و رسائل میں تحریروں

کی مسلسل اور متواتر اشاعت ہوتی رہی ہے۔ مطیع اللہ نازش کے یہ تمام مضامین بھی مختلف اصناف ادب کے تعلق سے روشنی بہم پہنچاتے ہیں تاہم اس کتاب کا حاصل وہ مضامین ہیں جو اڈیشا کے ادبی منظرنامے کے حوالے سے ہیں کیونکہ یہ پہلو ایسا ہے جس سے اڈیشا سے دور رہنے والے بیشتر افراد کم واقف ہیں۔ انھوں نے اڈیشا کو اپنی تحقیق وتنقید کا محور و مرکز بنایا ہے۔ اس تعلق سے ان کی ایک کتاب 'اڈیشا میں اردو نثر نگاری' شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں بھی ان کے دو مضامین شامل ہیں۔ انھوں نے بڑی اہم بات یہ لکھی ہے کہ ''اڈیشہ کی سرزمین آریائی اور دراوڑ کلچر کا امتزاج ہے اور یہاں اردو شاعری کا آغاز 1667 میں مرزا عبدالقادر بیدل کے قیامِ کٹک سے ہوتا ہے۔ انھوں نے پہلے دور میں بہت سے شاعروں کے نام لکھے ہیں جن میں ایک نام ہردے رام جودت کا ہے اور دورِ اول کی آخری کڑی کے طور پر امجد نجمی کا نام تحریر کیا ہے۔ دوسرے دور میں بھی بہت سے معتبر نام ہیں جن میں ایک اہم نام ڈاکٹر کرامت علی کرامت کا ہے۔ تیسرے دور میں بہت سے شعرا ہیں جنھوں نے شعر وسخن کو نئے زاویوں اور جہات سے روشناس بھی کرایا ہے۔ انھوں نے 2007 کے بعد شائع شدہ تقریباً 87 اردو مطبوعات کا ذکر کیا ہے۔ یہ اہم اور معلوماتی ہے جس سے وہاں اردو ادب کی سمت اور پیش رفت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ جن شعرا کے مجموعے شائع نہیں ہوئے ان کا بھی ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اڑیا زبان والی یہ سرزمین بھی اردو کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوئی۔ ان میں بہت سے شعرا ایسے ہیں جن کا تعلق مدارس سے ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ یہ وہ شعرا ہیں جن کے کلام میں فنی اور فکری پختگی بھی ہے۔

مطیع اللہ نازش نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے اڈیشا کے شاعروں کا بھی ذکر کیا ہے، خاص طور پر آزاد غزل، سہرا، رباعیات، ترائیلے، ہائیکو، نثری نظم، طنز ومزاح، دکنی اردو، ان تمام حوالوں سے انھوں نے اڈیشا میں اردو شاعری کا مربوط اور مبسوط ذکر کیا ہے۔ گوکہ اڈیشا میں اردو کے حوالے سے کئی اہم تحقیقی وتنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر مطیع اللہ نازش کے اس مجموعے میں کچھ نئے ناموں کا اضافہ بھی ہے۔ ان کا ایک اور اہم مضمون وفیات نگاری کے حوالے سے ہے جس میں انھوں نے البغوی کی کتاب 'وفات الشیوخ' اور ابن خلکان کی 'وفیات الاعیان' کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب آٹھ جلدوں میں بیروت سے شائع ہوئی۔ اردو میں بھی وفیات نگاری کا ایک سلسلہ سا رہا ہے۔ انھوں نے بہت ساری کتابوں کے نام لکھے ہیں جن میں ہم نفسان رفتہ (رشید احمد صدیقی)، یادرفتگاں (سید سلیمان ندوی) عظمت رفتہ (ضیاء الدین برنی)، یادرفتگاں (ماہر القادری)، وفیات ماجدی (عبدالماجد دریابادی)، کاروان رفتہ (ڈاکٹر محمد ایوب قادری)، متاع رفتگاں (شاہ معین الدین احمد ندوی)، وہ صورتیں الٰہی (مالک رام) قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے وفیاتِ مشاہیر بہار (مرتب: سید شاہد اقبال) اور وفیاتِ مشاہیر اردو (بشارت علی فروغ) کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے قطعاتِ تاریخ لکھنے والے اڑیسہ کے شاعروں کے نام اور نمونے بھی درج کیے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ادبی تاریخ نویسی پر بھی بہت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے علاقائی اردو ادب کی تاریخوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' کو انھوں نے اس سلسلے کی اولین کتاب قرار دیا ہے۔ رام بابو سکسینہ کی انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب کے علاوہ احسن مارہروی کی 'تاریخ نثر اردو'، اعجاز حسین کی 'مختصر تاریخ ادب اردو'، حامد حسن قادری کی 'داستانِ تاریخ اردو' کے علاوہ سید احتشام حسین کی کتاب 'اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس'، ڈاکٹر انصار اللہ نظر کی 'تاریخ ادب'، محمد صادق کی انگریزی میں لکھی تاریخ اور جمیل جالبی کی 'تاریخ ادب اردو'، گیان چند جین اور سیدہ جعفر کی 'تاریخ ادب اردو' وغیرہ کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون واقعی بہت معلوماتی ہے۔ انھوں نے تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ترقی پسند ادب، فن ترجمہ، قومی یکجہتی میں اردو ادب کا کردار، ترقی پسند ادب کے ارتقا میں اردو نثر نگاروں کا حصہ، اردو کے فروغ میں مدارس دینیہ کا کردار وغیرہ جیسے قیمتی مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔ یہ تمام مضامین یقینی طور پر ہمارے ذہنوں کو روشن کرنے والے ہیں۔ اس سے ان کی مطالعاتی وسعت اور ادبی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں کرامت علی کرامت، عبدالمتین جامی، علیم صبا نویدی کی تقریظات بھی ہیں جن سے کتاب کی وقعت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے یہ تمام مضامین علمی، تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے ہیں مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ انھوں نے بہت سے مضامین میں لفظ انشائیہ کا استعمال کیوں کیا ہے جب کہ وہ انشائیہ نہیں مضامین ہیں۔ اب انشائیہ ایک الگ صنف کی حیثیت سے متعارف ہے جس کے اجزا اور عناصر انشا پردازی سے مختلف ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ انھوں نے 'انشائیہ' کو Essay کے مفہوم میں استعمال کیا ہو۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مولوی محمد مطیع اللہ نازش کی یہ کتاب اردو زبان وادب کے اہم زاویوں اور جہات کے احاطے کے ساتھ ساتھ اڈیشا کے ادبی منظرنامے سے متعارف کراتی ہے۔ بلالیت ولعل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ 'کشکول اردو ادب' میں علوم و ادبیات کا بیش بہا خزینہ ہے۔

ابلاغیات

صحافت: دو صدی کا احتساب (1822-2022)

مرتبین: صفدر امام قادری، راج دیو کمار، محمد مرشد
صفحات: 752، قیمت: 1200 روپے
ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی
مبصر: محمد ولی اللہ قادری، استاد، گورنمنٹ انٹر کالج (ضلع اسکول)، چھپرا، بہار 841301

'صحافت: دوصدی کا احتساب' اردو کے محقق اور ناقد صفدر امام قادری نے ترتیب دی ہے جب کہ محمد مرشد اور راج دیو کمار نے ترتیب وتدوین میں دست تعاون پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں ساٹھ لوگوں کے ستر مقالات شامل ہیں۔ سب سے زیادہ چار مقالات صفدر امام قادری کے شامل ہیں جب کہ سہیل انجم، سہیل وحید اور سلمان فیصل کے دو دو مقالات اور ساجد ذکی فہمی کے تین مضامین شامل ہیں۔ سیمنار کے مقالات کے علاوہ بعض جدید وقدیم مقالے ماخوذ ہیں۔ ماخوذ مقالوں کا انتخاب بہت غور وفکر سے کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب ضخامت کو بڑھانے کے لیے نہیں ہوا ہے بلکہ عہدِ حاضر کی اہم ضرورت کے لیے کیا گیا ہے تاکہ نئی نسل سمجھ سکے کہ اردو صحافت پر ہمارے اسلاف نے کس قدر تحقیق وتنقید کا فریضہ انجام دیا اور اسلاف کے فیض کے بغیر ہم اردو صحافت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

کتاب میں مضامین کی ترتیب چوبیس ذیلی عناوین کے تحت ہوئی ہے۔ کلیدی خطبہ کے علاوہ قومی صحافت کا نقاش اول کے تحت دو جب کہ 'انوکھا خدمت گار'، صحافتی قوانین تاریخی لمحہ: 1822، ظرافت کی درس گاہ، مذہبی صحافت، اودھ پنچ اور سرکاری خفیہ فائل کے تحت ایک ایک مضمون شامل ہے۔ اسی طرح انیسویں صدی میں اردو صحافت کے تحت سات، چند قدیم اخبارات کے ضمن میں پانچ، نئی بیداری کا مغنی: سرسید احمد خاں کے تحت چار، جنگ آزادی اور نئی قومیت میں دو، مثالی مدیران میں پانچ، اردو کا مکمل صحافی: ابوالکلام آزاد اور چند اہم اخبارات چار، ادبی رسائل کے ضمن میں سات، صحافتی

زبان میں تین، ویب انقلاب اور اردو صحافت کے تحت دو، تانیثی جہات، علاقائی صحافت میں دو، صحافت اور ادب میں دو، نیا ڈسکورس میں چھ اور 'صحافت: جدید و قدیم فن اور دائرے' کے تحت چار مضامین کی شمولیت ہوئی ہے۔ عناوین کی رنگارنگی سے ہی کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مضمون نگار کی حیثیت سے کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو حیرت انگیز خوشی محسوس ہوتی ہے کہ نئی نسل کے مضمون نگاروں نے ہمیں خاص طور پر متوجہ کیا ہے جن میں ڈاکٹر تسلیم عارف، محمد مرجان علی، ڈاکٹر الفیہ نوری، شگفتہ ناز، ڈاکٹر افشاں بانو وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب کا آغاز احمد جاوید کے کلیدی خطبہ سے ہوا ہے۔ یہ کلیدی خطبہ 'اردو صحافت کے اہم موڑ: دو صدی کا احتساب' عنوان سے ہے۔ احمد جاوید نے اردو صحافت کے عروج و زوال اور ان کے اسباب کا لیکھا جوکھا پیش کیا ہے۔

ہمارے ملک میں 75 ویں یوم آزادی کی مناسبت سے مہا اتسو کا اہتمام ہو رہا ہے۔ اس تناظر میں اس کتاب کو دیکھا جائے تو بھی اس کی اہمیت و افادیت واضح ہو جاتی ہے۔ اس کا واضح ثبوت مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کے لیے اکیاون صفحات مختص کرنا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا ابو الکلام آزاد کا مضمون فن اخبار نویسی خاص طور پر متوجہ کرتا ہے۔ اس باب میں شافع قدوائی کا مضمون قومی بیداری کے فروغ میں اخبار 'الہلال' کا حصہ ہر چند قابل مطالعہ ہے لیکن قاری کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا نظریہ قومیت ان کی صحافت پر فوقیت لے جاتا ہے۔ 1947 کی آزادی کی بات ہو اور 1857 کی تحریک آزادی پر بالکل توجہ نہ دی جائے، یہ بات بھی قابل مذمت ہے۔ پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر کے سلسلے میں شامل مضمون میں صفدر امام قادری نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے:

''بالعموم ہم 1947 پر زیادہ مرکوز رہتے ہیں مگر یہ ایک سچائی ہے کہ 1857 کے جاں باز اگر اپنی جانوں کو نہیں لٹاتے تو پتا نہیں کہ ہمیں آزادی ملتی بھی یا نہیں اور ہمارے صحافت پیشہ افراد ضرورت پڑنے پر مادر وطن کے لیے انسانوں اور لفظوں کی حرمت بچانے کے مقصد سے جان لٹانا سیکھ پاتے یا نہیں۔'' (ص 59-58)

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں گنگا جمنی تہذیب کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ اگر ایک طرف منشی نول کشور کی خدمات کا جائزہ لیا گیا تو دوسری طرف چار چار برادرانِ وطن کے مضامین کی شمولیت ہوئی ہے۔ 'منشی نول کشور کا طباعتی مشن اور اشاعت قرآن' کے عنوان سے محمد ذاکر حسین کا مضمون بہت ہی عمدہ اور قابل مطالعہ ہے۔ او پی بھٹناگر، نند کشور وکرم، منی بھوشن کمار اور رتن لال کھتہ کے مضامین اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ اردو زبان میں جمہوریت کا عنصر آج بھی غالب ہے۔ راج دیو کمار اور منی بھوشن کمار جیسے غیر مسلم نوجوان قلم کاروں کو دیکھ کر ہمارے طلبا و طالبات کو رشک کرنا چاہیے۔

سوشل میڈیا کے حوالے سے اردو صحافت کا جائزہ بھی اس کتاب میں لیا گیا ہے۔ قمر اعظم صدیقی کا مضمون 'اردو میں سرگرم ویب سائٹس اور پورٹل ایک تجزیاتی مطالعہ' اور سلمان فیصل کا مضمون 'سوشل میڈیا اور اردو' زیرِ تبصرہ کتاب کی عصری اہمیت و افادیت کو دوبالا کر رہے ہیں۔ قمر اعظم صدیقی نے چوبیس پورٹل کا جائزہ لے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور اخیر میں اہم ویب سائٹس اور پورٹل کے رابطے نمبر بھی درج کر دیے ہیں تا کہ ان تک رسائی حاصل کرنے میں دشواری نہ ہو۔ سلمان فیصل نے بھی اپنے مضمون میں عنوان کا حق ادا کر دیا ہے۔ دونوں مضامین کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو صحافت نئی ایجادات کے فیوض حاصل کرنے اور ان کو عام کرنے میں دوسری زبانوں سے پیچھے نہیں ہے۔

کتاب میں شامل بعض مضامین تشنہ بھی ہیں۔ اس سلسلے میں سہیل انجم کا مضمون 'ہندستان میں علما کی صحافتی خدمات' سرفہرست ہے۔ پورے مضمون میں اہل سنت و جماعت کے علما کی صحافتی خدمات کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ علامہ ارشد القادری کا نام 'جام نور' کے حوالے سے لیا گیا ہے لیکن 'جام نور' پر کوئی تبصرہ نہیں ہے۔ حالانکہ اہل سنت کی طرف سے ماہنامہ 'اعلیٰ حضرت'، ماہنامہ 'سنی دنیا' (بریلی شریف)، ماہنامہ 'کنز الایمان' دہلی، ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور وغیرہ ایسے رسالے ہیں جن کے تذکرہ اور خدمات کے اعتراف کے بغیر مذہبی صحافت کی تاریخ ادھوری رہے گی۔

اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ مستقبل قریب میں ہی اس کتاب کو ماخذ کے طور پر قبول کیے جانے کی راقم الحروف کو امید ہے۔ اس قدر معیاری کتاب کی تیاری کے لیے مرتبین صفدر امام قادری، راج دیو کمار اور محمد مرشد اور ناشر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہمیں یقینِ کامل ہے کہ اردو دنیا میں اِس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

خاکے

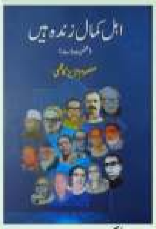

اہل کمال زندہ ہیں

مصنف: معصوم عزیز کاظمی

صفحات: 416، قیمت: 300 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ 110002

مبصر: احمد صغیر، گیا بہار

'اہل کمال زندہ ہیں' معصوم عزیز کاظمی کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن مصنف نے خاکے نہ لکھ کر شخصیت نامے لکھا ہے۔ خاکہ یا شخصیت نامہ ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی شخص کے حقیقی خد و خال قارئین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں ایک جیتی جاگتی حقیقی شخصیت کی دلکش اور دلچسپ پیرائے میں تصویر کشی کی جاتی ہے۔ خاکہ نگار واقعات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات و قیاسات کو بھی شامل کرتا ہے۔ خاکہ نگاری کی اس تعریف کو سامنے رکھ کر جب ہم معصوم عزیز کاظمی کے خاکوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ مصنف نے خاکہ نگاری کی تعریف کی مکمل پاسداری کی ہے اور جن شخصیات پر بھی قلم اٹھایا ہے ان کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔

'اہل کمال زندہ ہیں' میں کل 17 خاکے ہیں۔ جن شخصیات پر خاکے لکھے گئے ہیں ان کے نام ہیں امداد امام اثر، کلیم الدین احمد، انجم مانپوری، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر، ڈاکٹر سید محمد حسنین، عبدالمغنی، پرویز شاہدی، کلیم عاجز، کلام حیدری، وہاب اشرفی، حفیظ بنارسی، رمز عظیم آبادی، احمد یوسف، ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی، ڈاکٹر اے۔ آر۔ کاظمی وغیرہ۔

معصوم عزیز کاظمی نے لکھا ہے کہ ''اس مجموعہ میں شامل جن گرامی قدر شخصیات کے خاکے یا شخصیت نامے شامل ہیں ان میں امداد امام اثر کو چھوڑ کر مجھے تمام شخصیات کے آستانے پر متعدد بار حاضر ہونے کا، ذہن و دل کو روشن کرنے کا موقع ملا ہے''۔ ظاہر ہے مصنف جن فنکاروں سے ملا ان سے گفتگو کی، ان کے بارے میں معلومات فراہم کی، ان کے مزاج، اطوار کے بارے میں جانا ان کی علمیت کا اندازہ لگایا ان کے ادبی کارناموں کے بارے میں جانا۔ اس طرح اس شخصیت کا ایک پورا خاکہ مصنف کے ذہن میں بن گیا اور تب اس کا خاکہ کھینچا اور ایسا کھینچا کہ اس کی پوری تصویر کشی ہو گئی۔ انجم مانپوری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''انجم مانپوری کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ سماجی حیثیت کے علاوہ ان کی

ادبی حیثیت بھی مستحکم تھی۔ وہ مجلّہ اور مشاعرے کی جان اور شان ہوا کرتے تھے۔ قدرت نے ان کی فطرت میں طنز وظرافت کا شعور بخشا تھا۔ سن شعور سے ہی وہ شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی، زندہ دلی اور خوش مزاجی کی بنا پر مجلس میں ممتاز رہے۔ ایک نشست میں کسی نے کہا عورت مثل شعر ہے۔ انجم مانپوری نے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ لا کر تصحیح کی اور کہا کہ عورت ایک مصرعہ ہے اور وہ شعر اس وقت بنتی ہے جب دوسرا مصرعہ حاصل ہو جائے۔ ان کی شخصیت اور سراپا انوکھا اور بے مثل تھا۔''

'اہل کمال زندہ ہیں' کی خوبی یہ ہے کہ اس میں جس فنکار پر بھی قلم اُٹھایا گیا ہے اس کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ اسے ہم صرف خاکہ نہیں کہہ سکتے۔ خاکہ میں صرف فنکار کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ لیکن معصوم عزیز کاظمی نے نہ صرف متعلقہ شخصیت کی تصویر کشی کی ہے بلکہ اس کے ادبی کارناموں کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس طرح یہ خاکہ نما مضمون ہو گیا ہے۔ یعنی مصنف کے ساتھ ان کی تصنیفات کا بھی مکمل تعارف بھی ہے۔ اس طرح ان فنکاروں کے بارے میں مکمل معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ جس شخصیت پر قلم اُٹھایا گیا ہے اس سے وابستہ ان واقعات کا بھی ذکر ہے جو زندگی میں درپیش آئے جیسے کلیم الدین احمد کے تنقیدی افکار پر تاج پیامی نے ایک کتاب 'صاعقۂ طور' لکھا اور جب کلیم الدین احمد نے اسے پڑھا تو معصوم عزیز کاظمی سے کہا کہ کتاب کے مصنف تضادات کے شکار ہیں۔ پتھر پھینکنے کا شوق ہے لیکن وہ شاید بھول بیٹھے ہیں کہ خود ان کے گھر شیشے کے ہیں، یا پھر محمد حسنین سے جب معصوم کاظمی نے ملاقات کی اور عبدالمغنی کی کتاب 'اقبال اور عالمی ادب' کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ عبدالمغنی کی کتاب کا عنوان ہی غلط تھا اور وہ عالمی ادب میں اقبال کا مقام متعین کرنے کے اہل نہیں تھے۔ ان کا سوال تھا کہ پروفیسر عبدالمغنی کو کتنی عالمی زبانوں سے واقفیت ہے؟ اگر وہ فرنچ، ہبرو، اٹالین، اسپینش، سنسکرت، پالی، تامل، تلگو اور افریقی زبانوں سے واقف نہیں ہیں تو پھر اقبال کے دیگر زبانوں کے شعرا سے تقابلی مطالعے کی گنجائش کہاں بنتی ہے!

'اہل کمال زندہ ہیں' میں جن 17 شخصیات پر قلم اُٹھایا گیا ہے، ان میں سے کسی کا بھی خاکہ نما مضمون پڑھ لیجیے آپ کو اس فنکار سے پوری واقفیت ہو جائے گی نیز ادیبوں کی چپقلش 17 ادبی معرکے اور تیر و نشتر کے وار بھی نظر آئیں گے۔ اس طرح یہ کتاب ایک الگ نوعیت کی ہے۔ اردو ادب میں اس کتاب کی پذیرائی ہونی چاہئے تا کہ معصوم عزیز کاظمی اس کی دوسری جلد بھی جلد منظرِ عام پر لا سکیں۔

ترتیب

سجاد حیدر یلدرم کلام اور اصحاب قلم کی نظر میں

مرتب: ڈاکٹر قریشی عتیق احمد

صفحات: 498، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: مرزا ورلڈ بک ہاؤس، قیصر کالونی، اورنگ آباد

مبصر: ڈاکٹر سہیم الدین خلیل الدین صدیقی (اورنگ آباد، دکن)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، شیواجی کالج، ہنگولی 431513

'سجاد حیدر یلدرم کلام اور اصحاب قلم کی نظر میں' ڈاکٹر قریشی عتیق احمد نے ترتیب دی ہے۔ اس کتاب میں عرض مرتب کو ملا کر 32 مضامین شامل ہیں جن کو مرتب نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے جیسے کتاب کے عنوان سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ایک حصہ میں سجاد حیدر یلدرم کا کلام اور دوسرے حصہ میں سجاد حیدر یلدرم کے کلام پر اصحاب قلم کی رائیں پیش کی گئی ہوگی۔ البتہ اس کتاب میں شامل مضامین میں سید سجاد حیدر یلدرم، تصانیف یلدرم اور اہل قلم کے تاثرات از مرتب رقم ہیں جبکہ سید سجاد حیدر یلدرم، سفینۂ غم دل اور جہاں پھول کھلتے ہیں از قرۃ العین حیدر، یلدرم از نذر سجاد حیدر، سجاد حیدر یلدرم از مولانا سید سلیمان ندوی (مرحوم)، ایک دل کش شخصیت از خواجہ غلام السیدین، سجاد حیدر یلدرم از شوکت تھانوی، سجاد حیدر یلدرم مرحوم از سر سید رضا علی (مرحوم)، یلدرم کی یاد میں از رشید احمد صدیقی، سجاد...... یلدرم از قاضی عبدالغفار (مرحوم)، سید سجاد حیدر از پطرس بخاری (مرحوم)، سجاد حیدر یلدرم از سر سید رضا علی (مرحوم)، سید سجاد حیدر یلدرم، یلدرم بحیثیت شاعر از پرنسپل مشتاق احمد زاہدی (مرحوم)، یاد یلدرم از جلیل قدوائی، انشائے سجاد از امتیاز علی تاج، یلدرم ان کے ساتھی اور رومانی افسانہ نگاری از نیاز فتح پوری و سید احتشام حسین، اردو انشائیے لطیف یلدرم اور ان کے ساتھی از ڈاکٹر سیدہ جعفر، چند لمحے سجاد حیدر کے ساتھ از صلاح الدین احمد، خیالستان از غلام بھیک نیرنگ، یلدرم رومانی نثر کا ایک معمار از اسلوب احمد رضا، سید سجاد حیدر از سید اظہار الحسن، شعر یلدرم از سید مبارز الدین رفعت قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ یلدرم کے قلم سے لکھے ہوئے کل بیس مضامین بعنوان، ناول نویسی، مسئلہ ازدواج پر تعلیم یافتہ نوجوان کے خیالات، مولانا حالی کی شاعری پر مولوی محبوب الرحمٰن کی تنقید، اولڈ بوائے ٹائپ میں، ہندوستانی اکیڈیمی کے اجلاس 1938 کا خطبہ، قوت، احمد علی گڑھ کا ایک قصہ، آشیاں مستقبل، تقریظ برزود پشیماں، ظالم محبت، فتح اندلس، اردو لٹریچر اور تعلیم یافتہ مسلمان، نشہ کی پہلی ترنگ، اے مادر وطن!، سرسری انصاف، سفر حجاز، فطرت جواں مردی اور سنجرو غزالی۔ چار مکاتیب بنام نقاد کے ایڈیٹر جناب دلگیر، جلیل قدوائی، تاجور نجیب آبادی اور قاضی عبدالغفار اور کلام یلدرم شامل کتاب ہیں جن کو عالی جناب مرتب ڈاکٹر عتیق احمد نے مذکور بالا دو حصوں میں جبکہ راقم الحروف کے مطابق یہ کتاب چار حصوں میں تقسیم ہے، جن میں اوّل مضامین یلدرم، دوّم مکاتیب یلدرم، سوم کلام یلدرم اور چہارم مضامین اصحاب قلم کے عنوان سے ہیں۔ اس میں پہلا، دوسرا اور تیسرا تینوں حصے یلدرم کے قلم سے لکھے ہوئے تمام مضامین، مکاتیب اور کلام شاعری پر مشتمل ہیں۔ حصہ چہارم اصحاب قلم کے مضامین پر مشتمل ہے جس میں جلیل قدوائی صاحب کا انتظاریہ بھی شامل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں ڈاکٹر عتیق احمد نے سجاد حیدر یلدرم کی انشا پردازی کے علاوہ ان کی افسانہ نگاری اور شاعری پر خوبصورت بحث کی ہے نیز ان کی عملی زندگی، ادبی افکار، رومانیت جیسے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ نیز بڑے بڑے اہل قلم افراد کے موصوف سے متعلق نظریات کو بھی قلمبند کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی ہے، بلکہ کتاب ہذا میں یلدرم کی ہشت پہلو شخصیت کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے پیش کی گئی ہے اور ان کے ہم عصر ادبا و شعرا کے نظریات و اہل قلم کی نگارشات کو اس کتاب میں شامل کر کے یلدرم کو خیراج تحسین پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

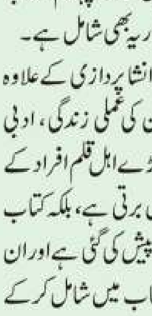

طالب رزاقی فن و شخصیت کے آئینے میں

مرتب: تشکیل انور رزاقی

صفحات: 216، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021

مبصر: محمد سعید اختر

ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس

محمد قطب الدین حسن المعروف طالب رزاقی (1921-1975) کا شمار اردو کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری کے توسط سے اردو دنیا میں جگہ

بنائی۔انھوں نے اردو شعروادب کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی۔غزل گو کی حیثیت سے ان کی اصل پہچان ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'طالب رزاقی فن وشخصیت کے آئینے میں' ان پر لکھے گئے '35' مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے میں 12 مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو طالب رزاقی کی شخصیت و سوانح پر مشتمل ہیں۔ دوسرے حصے میں 12 مضامین ان کی شاعری سے متعلق ہیں۔تیسرے حصے میں وہ قطعات اور نظمیں شامل کتاب ہیں جو طالب رزاقی کی وفات کے بعد لکھے گئے تھے۔اس کتاب کے کچھ مضامین طالب رزاقی کی زندگی میں ہی لکھے گئے تھے جب کہ بعض مضامین ان کے انتقال کے بعد لکھے گئے ہیں۔

کتاب کے مرتب 'تشکیل انور رزاقی' طالب رزاقی کے فرزند ہیں۔انھوں نے نہ صرف اس کتاب کو مرتب کیا بلکہ ابتدائی تحریر حرف آغاز کے عنوان سے لکھی جو پر مغز اور معلوماتی ہے۔اس تحریر میں کتاب میں شامل مضامین کی نوعیت اور بعض دیگر امور پر نہایت کارآمد گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون نصیرالدین ہاشمی کا ہے۔انھوں نے طالب رزاقی کی سوانح و شخصیت سے متعلق ایک مختصر تحریر اپنی مشہور زمانہ کتاب 'دکن میں اردو' میں لکھا تھا۔اس وقت طالب رزاقی کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ان کا کلام تخیل اور بلند پروازی کے سبب ایک خاص احساس کا حامل ہو گیا تھا۔ان کے کلام میں ندرت اور موسیقیت کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔نصیرالدین ہاشمی نے ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ مضمون کے اختتام پر ان کے اشعار کا انتخاب بھی شامل کیا تھا جس کی وجہ سے اس مضمون کی افادیت دوچند ہو گئی تھی۔

کتاب کا دوسرا مضمون 'حیدرآباد کے شاعر انتخاب کلام 1900 سے 1958 مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد کی کتاب سے اخذ کیا گیا ہے۔ تیسرا مضمون 'امجد سے شاذ تک 1947 سے 1987 دکن کے نمائندہ شعرا کا تعارف اور کلام' سے لیا گیا ہے۔ عابد علی خاں نے لکھا ہے کہ غزل کو ان کے مزاج سے وابستگی تھی۔فکر کی سنجیدگی، عروض وقواعد پر عبور اور زبان کی لطافت کے سبب ان کے کلام میں تاثیر اور دلکشی پیدا ہو گئی۔

صلاح الدین نیر کا مضمون 'طالب رزاقی، مشاعروں کے لیے ناگزیر استاد شاعر' بہت اہم ہے۔اس مضمون میں ان کی شاعرانہ خوبیوں کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور ان کا شمار حیدرآباد کے ان شعرا میں کیا ہے جنھوں نے اپنی صلاحیت کی بنا پر اپنی شاعرانہ حیثیت کو مستحکم کیا اور حیدرآباد کی ادبی وشعری تاریخ میں دیگر مقبول شاعروں کے ساتھ ان کا نام اور کلام بھی محفوظ ہے۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اپنے مضمون 'طالب رازاقی... فکر بلیغ کا شاعر' میں ان کی شخصیت اور شاعری پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ طالب رزاقی کی غزل گوئی دراصل اپنے عصر کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاناں، روایات کی پاسداری، موضوعات کی فراوانی وغیرہ کا انداز واضح ہوتا ہے۔قمر جلالی نے اپنے مضمون 'طالب رزاقی کچھ باتیں کچھ یادیں' میں طالب رزاقی کے بیٹے کو دعاؤں سے نوازا اور پھر ان کی شخصیت کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔

عارف جمال کا مضمون 'تہذیبی عناصر اور جمالیاتی احساسات کا شاعر طالب رزاقی' ہے۔اس مضمون میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی غزلوں میں تہذیبی عناصر اور جمالیاتی احساس کے لطیف امتزاج نے ان کی غزلوں میں نئے رنگ وآہنگ بھر دیے تھے۔ پروفیسر فاطمہ بیگم پروین کا مضمون 'ایک صاحب دل شاعر طالب رزاقی' اہمیت کا حامل ہے۔اس مضمون میں انھوں نے صرف اور صرف ان کی شاعری کو موضوع بحث بنایا ہے اور اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی چار غزلوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

ان مضامین کے علاوہ کتاب کے مشمولات میں 'طالب رزاقی صاحب کمال شاعر از رحمت یوسف زئی، طالب رزاقی کی شاعری از علیم صبا نویدی، نشاطِ غم کا شاعر از مومن خاں شوق، جذبوں کو زبان دینے والا شاعر از محمد ضیاؤ الدین نیر، طالب رزاقی کی شخصیت اور فن از ڈاکٹر ناقد رزاقی، انتالیسویں برسی پر خراج از تشکیل انور رزاقی وغیرہ اہم ہیں۔

تشکیل انور رزاقی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے والد محترم کو اردو دنیا میں دوبارہ متعارف کرایا اور انھیں اردو ادب میں وہ مقام دلانے کی کوشش کی ہے جس کے وہ حقدار ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں نہ صرف مقبولیت حاصل کرے گی بلکہ طالب رزاقی کے فن کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔ کتاب کی قیمت بھی مناسب ہے۔امید ہے قارئین پسندیدگی کا اظہار کریں گے۔

سید محمود احمد کریمی: فکرونظر کے آئینے میں

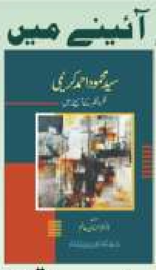

مرتب: ڈاکٹر احسان عالم

صفحات: 160، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ

مبصر: غلام نبی کمار

کمار محلّہ، چرار شریف، بڈگام (جموں وکشمیر)

ڈاکٹر احسان عالم نے پیش نظر کتاب جس شخصیت پر ترتیب دی ہے ان کا تعلق دربھنگہ سے ہے جو بہار کا ایک معروف شہر ہے۔ جہاں سے علم وادب کے کئی شہسواروں نے جنم لیا ہے اور جن کے علمی وادبی کارناموں سے ہندوپاک کا ادبی حلقہ بھرپور فیض یاب ہو رہا ہے۔خوش آئند بات یہ ہے کہ سید محمود احمد کریمی جنھیں وراثت میں نوابی شان وشوکت ملی ہے وہ بھی اس ذخیرے میں اضافہ کرکے اپنا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر احسان عالم مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے محمود احمد کریمی کی پارکھی نظر کو سمجھا اور ان کی تحریروں کو اولین فرصت میں ترتیب وتہذیب کی زینت سے آراستہ کیا۔ ایسا نہ کرتے تو شاید یہ تحریریں بکھری پڑی رہتیں۔ان کے مصنف ابھی باحیات ہیں جو تاحال مشق سخن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ بزرگ ہیں اس لیے بروقت مناسب مشورے بہت کارگر ثابت ہوتے ہیں۔اگر کسی ادیب یا قلم کار کی پذیرائی اس کی زندگی میں ہو تو وہ اسے اپنا بڑا سرمایہ تصور کرتا ہے اور ایسا ہونے سے اس کی ہمت بڑھ جاتی ہے اور کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

'سید محمود احمد کریمی فکرونظر کے آئینے میں' کتاب حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ابتداً مرتب کا مختصر تعارف اور اس کے بعد محمود احمد کریمی کا سوانحی خاکہ دیا گیا ہے۔ سید محمود احمد کریمی کی پیدائش 26/فروری 1934 کو موضع پیغمبر پور، پرگنہ بھروسہ، ضلع دربھنگہ میں الحاج مولوی عزیز احمد اور الحاج بی بی خدیجۃ الکبریٰ کے گھر ہوئی۔اس مختصر سے خاکے میں محمود احمد کریمی کی تعلیم وتربیت اور ادبی مشغولیت کا پتہ چلتا ہے۔

عرض مرتب میں احسان عالم نے موصوف کے مضامین اور ان کی ترجمہ شدہ کتابوں پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔جس سے ان مضامین کی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ شیخ مجدد کا تصور توحید، اقبال کا تصور خودی، پیغمبر پور اسٹیٹ کی ادبی اور ثقافتی خدمات، دور ہا باید، تنقید کے ضمن میں، ظفر کی شاعری زندان میں، تعلیم کی افادیت وغیرہ ان کے قابل ذکر مضامین ہیں۔ جب کہ ان ترجمہ شدہ کتابوں میں عضویاتی غزلیں (OrganWise Ghazlen)، ہر سانس محمد پڑھتی ہے (Encomium to Holy Prophet)، بکھری اکائیاں (Assortment of Short Stories)، قصیدہ بردہ (Qasidah

(Burdah)، قربتوں کی دھوپ (Proxymal Warmath)، کچھ محفلِ خوباں کی (Closet of Beauties)، سورۃ یٰسین شریف (Surah Yasin Sharif) اور شبنمی لمس کے بعد (After Dewy Palpability) شامل ہیں۔

کتاب کے مشمولات میں ابتداً پروفیسر طرزی کی سید محمود احمد کریمی کی شخصیت اور فن سے متعلق سات مختلف پہلوؤں پر الگ الگ منظومات ہیں جو ان کی فنی، فکری، ادبی، نظریاتی اور مذہبی عناصر کی غماز ہیں۔ انھوں نے محمود احمد کریمی کو بحیثیت مترجم، اقبال شناس اور زبان شناس کے طور پر بہترین خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ حیدر وارثی نے بھی تین منظومات سپردِ قرطاس کیے ہیں۔ جن میں سے ایک منظوم 'ہر سانس محمدؐ پڑھتی ہے' کی تعریف و تحسین کے سلسلے میں منظوم کی گئی ہے۔ جب کہ دیگر دو ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے تعلق سے منظوم ہوئی ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون پروفیسر شاکر خلیق کا تحریر کردہ ہے جس میں انھوں نے موصوف کے ساتھ اپنی نسبت کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی اردو، عربی، فارسی اور انگریزی دانی کا اعتراف کیا ہے۔ شاکر خلیق نے اپنے شعری مجموعے 'اعتراف جنوں' کی چند غزلوں کا انگریزی ترجمہ کی بات بھی کہی ہے جو محمود احمد کریمی نے 1994 میں کیا تھا۔ نور شاہ نے 'زاویہ نظر کی آگہی' پر ایک مختصر نوٹ لکھا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین زور کاشمیری نے ''محمود احمد کریمی کی ترجمہ نگاری اور اقبال شناسی'' پر توجہ مرکوز کی ہے۔ ایک پہلو پر لکھتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ بہرحال انھوں نے ان کے چند انگریزی ترجموں اور اقبال شناسی کا مختصراً اعتراف کیا ہے۔ مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی کی دو تحریریں بعنوان 'محمود احمد کریمی کے مقالے اور انگریزی ترجمے' اور 'زاویہ نظر کی آگہی' شامل ہیں۔ حلیم صابر نے 'ترجمہ نگاری میں سید محمود احمد کریمی کی مہارت' کو موضوع بنایا ہے جس میں انھوں نے چند اشعار کے انگریزی ترجمے کا حوالہ دیا ہے۔ نسیم محمد جان کے مضمون کا عنوان 'عضویاتی غزلیں کا انگریزی ترجمہ' ہے لیکن تمہید کو چھوڑ کر ایک فقرہ بھی عنوان کے تعلق سے نہیں لکھا گیا ہے۔ عشرت بیتاب کا مضمون 'مناظر عاشق ہرگانوی کی کہانیوں کا ترجمہ: ایک مطالعہ' بھی تعارفی نوعیت کا ہے۔ ڈاکٹر احسان عالم کے چار مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں پہلے میں 'عضویاتی غزلیں' دوسرے میں 'بکھری اکائیاں' (افسانے)، تیسرے میں 'ہر سانس محمدؐ پڑھتی ہے' اور چوتھے میں 'زاویہ نظر کی آگہی' پر گفتگو کی گئی ہے۔ اول لذکر تین کتابیں مناظر عاشق ہرگانوی کی ہیں جن کا ترجمہ محمود احمد کریمی نے انگریزی میں کیا ہے۔ مظفر نازنین کے دو مضامین 'عزت مآب سید محمود احمد کریمی صاحب کی عظیم شخصیت' اور 'نابغۂ روزگار شخصیت سید محمود احمد کریمی کی شاہ کار تخلیق' کے علاوہ جن کے مضامین شامل کتاب ہیں ان میں ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ایم نصر اللہ نصر، صفی الرحمٰن راعین، سلمان عبدالصمد، ڈاکٹر منصور خوشتر، انور آفاقی، سکندر علی شکن، عبدالرحیم برہولیاوی، عطیہ نور، ثریا شاہد، ڈاکٹر ریحان احمد قادری وغیرہ کے اسمِ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

فکشن

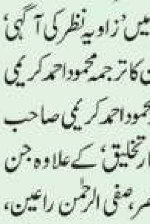

اندر کا آدمی (افسانچوں کا مجموعہ)

مصنف/ ناشر: سید محمد نعمت اللہ

صفات: 139، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021

مبصر: محمد علیم اسماعیل

وارڈ نمبر 15، پولیس اسٹیشن کے پیچھے، ناندورہ، مہاراشٹر

سید محمد نعمت اللہ، آسنسول مغربی بنگال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے افسانچوں کا مجموعہ 'اندر کا آدمی' منظرِ عام پر آیا ہے جو ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ کم ظرف، اپنا خون، پتے کی بات، تیسرا نابینا، پہلا مکتب اور اسی نوعیت کے دوسرے افسانچے سید محمد نعمت اللہ کو ایک اچھے، باشعور اور سنجیدہ افسانچہ نگار کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ایک اچھا افسانچہ قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے، قاری کی دنیا ہی بدل دیتا ہے اور ایسا ہی کچھ سید محمد نعمت اللہ کے ساتھ ہوا۔ اپنی بات میں وہ لکھتے ہیں: ''افسانچہ نگاری سے قبل مختلف اخبارات کے لیے مراسلے لکھنا میرا ادبی شغل تھا، ایک دن کسی اخبار کے گوشۂ ادب میں ایک افسانچے کی قرأت کا اتفاق ہوا جس نے میرے اعصاب کو یک لخت جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ افسانچہ کیا تھا ایک دھماکہ تھا۔ جس کی دھمک نے میرے دل و دماغ کو متزلزل ہی نہیں کیا بلکہ اپنی فنی جہتوں پر غور و فکر کرنے کی دعوت بھی دے دی، مجھے احساس ہوا کہ میں مراسلہ نگاری میں سماجی، معاشرتی، قومی، سیاسی یا مذہبی مسائل کے جن مشاہدات کو اپنے قلم سے صفحہ قرطاس پر بکھیرتا ہوں اسی طرح تو افسانچوں کے لیے بھی موضوعات ہیں، البتہ افسانچہ کے اجزائے ترکیبی مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا میرا رجحان افسانچہ نگاری کی طرف اس وقت مائل ہوگیا تھا۔''

زیرِ نظر مجموعے میں 111 افسانچے اور ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری، رونق جمال، اثر بہرائچ اور مسعود حیدر کے مضامین شامل ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ مضامین کی تعداد کچھ زیادہ ہوگئی ہے لیکن سبھی مضامین سید محمد نعمت اللہ کے فن پر اچھی گفتگو کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

فلیپ پر مشہور و معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق کے تاثرات دیے گئے ہیں۔ سلام بن رزاق فرماتے ہیں: ''نعمت اللہ اپنے افسانچوں کے موضوعات آس پاس کی زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور قاری کو منظر آشنا ماحول اور مانوس کرداروں سے روشناس کراتے ہیں۔ ان کے افسانچوں میں تحیر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے جو قاری کو باندھے رکھتا ہے۔ یہ افسانچے عام واقعات پر مبنی عام لوگوں کے لیے عام زبان میں لکھے گئے ہیں۔ امید ہے کہ ادبی حلقے میں ان افسانچوں کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔''

افسانچہ تخلیق کرنا ایک مشکل فن ہے لیکن کچھ سہل پسند لوگوں نے اسے آسان سمجھ لیا ہے۔ وہ افسانچے کے فن کو سمجھے بغیر چند سطریں لکھ کر خود کو افسانچہ نگاروں کی فہرست میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ سید محمد نعمت اللہ کو فنِ افسانچہ کا شعور ہے۔ ان کے افسانچے سماج کے مختلف مسائل کو پر اثر طریقے سے پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانچوں کی بنت، عنوان اور پنچ لائن افسانچے کے پیغام کو تخلیقی پیرائے میں قارئین پر وا کرتے ہیں۔

افسانچہ 'پہلا مکتب' میں سماج کے ایک ایسے مسئلے کو پیش کیا گیا ہے جسے ہر کوئی کبھی نہ کبھی دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے۔ اس مسئلے کو اس افسانچے میں اتنے اچھوتے انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ''پاپا! وہ دیکھیے!! کمینہ جا رہا ہے۔'' ایک چھوٹی سی بچی کی زبان سے ادا ہوا یہ جملہ پورے افسانچے کی جان ہے۔ یہی سے تجسس شروع ہوتا ہے جو آخر میں ختم ہوتا ہے۔

افسانچہ 'کم ظرف' میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے والے ایک شخص کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا ہے۔ ہر انسان کے چہرے پر نقاب ہوتا ہے اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک انسان کے کئی چہرے ہوتے ہیں جو وقت وقت پر سامنے آتے ہیں۔ اور ایسا ہی اس افسانچے میں ہوا ہے۔ افسانچے کی شروعات، درمیان اور اس کا اختتام بالکل مناسب ہے۔ اس کہانی میں اتنے ہی الفاظ خرچ کیے گئے ہیں جتنے کی ضرورت تھیں۔ لفظوں کو بلاضرورت پانی کی طرح خرچ نہیں کیا گیا ہے، اور اختتام بھی اچھا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید محمد نعمت اللہ افسانچہ نگاری کے فن کو بخوبی سمجھتے ہیں۔

افسانچہ 'اپنا خون' بھی قاری کو چونکانے میں کامیاب ہے۔ نہایت ہی کم لفظوں

میں ایک بڑی کہانی بیان ہوئی ہے۔ منو بائی اور سیٹھ جی کے مکالموں پر مشتمل یہ کہانی چونکاتی بھی ہے اور سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔

افسانچہ 'پتے کی بات' میں آج کے نوجوانوں پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔ کہانی کچھ اس طرح ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوتے ہی مسجد میں بچوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے جو خوب شور شرابا کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر امام صاحب نمازیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ چھوٹے بچوں کو مسجد نہ لائیں۔ تب مؤذن صاحب کہتے ہیں: ''امام صاحب چھوڑیے انھیں، یہ تو ابھی بچے ہیں، بڑے ہوں گے تو خود ہی مسجد کا راستہ بھول جائیں گے۔''

افسانچہ 'تیسرا نابینا' ایک اچھا افسانچہ ہے۔ موضوع پرانا ہے لیکن پیشکش میں ندرت ہے۔ اس افسانچے کا عنوان بڑا معنی خیز ہے، جس میں پوری کہانی پوشیدہ ہے۔

سید محمد نعمت اللہ کے کچھ افسانچے ایسے بھی ہیں جنھوں نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ایک قلم کار کی سبھی کہانیاں شاہکار نہیں ہوتیں، اور سبھی کہانیاں ہر کسی کو یکساں طور پر متاثر بھی نہیں کرتیں۔ قارئین اور سامعین کا مزاج ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سید محمد نعمت اللہ کے یہاں اچھی اور متاثر کرنے والی کہانیوں کا تناسب زیادہ ہے۔

شاعری

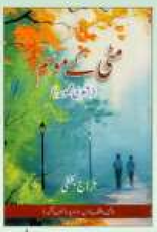

مٹی کے موسم

شاعر: بلراج بخشی

صفحات: 202، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: اوشین پبلشنگ ہاؤس، اُدھم پور (جموں وکشمیر)

مبصر: ساحر داؤد نگری، 275/6، للتا 1009 پارک، لکشمی نگر، دہلی

بلراج بخشی ہمارے عہد کے انتہائی فعال اور ذی شعور قلم کار ہیں۔ وہ کئی علمی وادبی، تحریکوں اور سرگرمیوں نیز اردو رسالوں سے وابستہ رہے ہیں۔ وہ مشہور افسانہ نگار، نظم گو غزل گو اور ناقد ہیں۔ وہ اردو ادب کی متعدد جہات پر زبردست قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی ادبی کتب اردو دنیا میں خاصی پذیرائی حاصل کرچکی ہیں۔ بلراج بخشی کی شعری تخلیقات ملک کے مقتدر مجلّات میں شائع ہوتی رہی ہیں اور تنقیدی حوالوں میں بھی شامل رہتی ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں پروفیسر قدوس جاوید کا خیال یہ ہے:

''ان کی غزلوں میں کلاسیکی غزل کی شعریات کا التزام بھی واضح ہے۔ الفاظ کے لسانی برتاؤ، مضمون آفرینی، معنوی تہہ داری اور غزل کی داخلی ہیئت کی تازہ کاری کی بنا پر ان کی غزلوں میں ایک سرکش انفرادیت ہے۔ بلراج بخشی کی شاعری کے اندرون سے مرتعش لے اور موسیقی کا سازینہ ان کی غزلیہ شاعری کا وہ جلی دستخط ہے جس کے بغیر غزل محض انشائیہ ہوکر رہ جاتی ہے...''

چند اشعار اس تعلق سے ملاحظہ فرمائیں۔

نہ درد جائے نہ ان کے نشاں مٹیں دل سے　　کہاں سے ڈھونڈ کے یہ زخم لائے جاتے ہیں
وہ مجھ سے زیادہ میرے پاس تھا　　عجب فاصلے درمیاں آگئے

اس مجموعے میں غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کی بہت سی نظمیں بھی شامل ہیں۔ نروان، راہ بے مفر، جبر، ابدی آزادی کا لمحہ، انکشاف، قرض، مجبوری، سفر، سند افتخار، میرے گناہ سبھی، قوس، ڈر، اعراف، عرفان، وصل، اگر، تعزیت نامہ، بوجھ، تشنگی، فیصلہ ان عنوانات کے تحت بہت سی خوبصورت نظمیں ہیں۔ نظم 'مٹی کے موسم' ملاحظہ فرمائیں۔

بدلتے ہوئے موسموں سے مجھے ہے شکایت/ کہ دہراؤ کا یہ تسلسل بھی/ بے رنگ یکسانیت کے سوا اور کیا ہے/ کہ مٹی کے موسم/ وہی گرمیاں، سردیاں/ اور خزائیں بہاریں/ جو یکساں تناسب سے/ مجھ کو پکاریں/ بدلتے ہوئے موسموں سے مری التجا ہے/ اگر ہوسکے تو مرے گھر کے آنگن میں/ ہر روز ایسی شعائیں اتاریں/ جو پہلے کی ساری شعاؤں سے ہوں مختلف اور نئی/ میری آنکھوں میں بھر دیں نئے رنگ/ جو سات رنگوں کی فہرست میں بھی نہ ہوں/ رات دن کا یہ لاانتہا سلسلہ

ان کی نظموں کے حوالے سے کوثر مظہری کا یہ خیال بہت عمدہ ہے کہ:

''بلراج بخشی کی نظموں میں ایک اعلیٰ دانشورانہ سنجیدگی اور آشوب آگہی کا شعور ہے۔''

بلراج بخشی کو جدید غزل کی جمالیات سے آگہی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک نیا جہان نظر آتا ہے۔ ان کے خیال میں بڑی وسعت ہے۔ ان کا شعری اسلوب بھی بہت مستحکم اور کشش سے بھرپور ہے۔ کرشن کمار طور نے ان کی لفظیات وتراکیب کے حوالے سے بہت صحیح اشارہ کیا ہے کہ:

''بلراج بخشی کے کتنے ہی الفاظ اور ترکیبیں ایسی ہیں جو تازہ عصری حسیت کے مرکزی دائرۂ انعکاس میں موجود ہیں۔ ان کا حیرت انگیز فلسفیانہ انداز فکر اور انوکھا مگر پراثر اظہار ان کی شاعری میں جھلکتا اور چھلکتا نظر آتا ہے۔ ان کی جدت طرازی کا حسن محض زبان کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ اپنے خیالات اور طرز عمل سے بھی اسے بصری، سمعی اور حسی پیکر عطا کرتے ہیں۔''

ان کی چند غزلوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیں جو مذکورہ بالا ناقدین کے خیالات کی تصدیق کرتے ہیں۔

کہاں عنوان ایک باب کا میں　　سرورق ہوگیا کتاب کا میں
کام آجائیں گے کئی لشکر　　ایسی جنگ وجدل ہو تم جاناں
حیا پروردائیں قاتلانہ　　وفا لیکن حسینوں میں نہیں ہے
تمام شہر میں اعلان کردیا تم نے　　میں قرض لے کے بھلا کب مکرنے والا تھا
مٹھیوں میں سمیٹ کر مجھ کو　　چٹکیوں میں اڑاؤ گے بھائی
آؤ دل کے چراغ سے کھیلیں　　میں جلاؤں گا تم بجھایا کرو

زندگی کو شاعر نے نہایت قریب سے دیکھا ہے اور زندگی میں در آنے والے تجربات کی انھوں نے اپنی شاعری میں تجسیم کی ہے۔ ان کے اشعار پاکیزگی، شائستگی اور متانت کی قوس قزح میں لپٹے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اچھے اشعار پڑھنے کا اگر دل کرے تو 'مٹی کے موسم' کا مطالعہ ضرور کریں۔

خوابوں کے مرثیے

مصنف: سفیر صدیقی

صفحات: 126، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: ایس ایم حسینی، 04 ندوہ کیمپس، ڈالی گنج لکھنؤ

'کوزۂ فکر' کے بعد 'خوابوں کے مرثیے' سفیر صدیقی کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جس کا انتساب 'زندگی کے نام' کرکے کم لفظوں میں بڑی بات کہہ دی ہے، پیش لفظ کی ابتدائی سطریں ہی ایک اچھے قاری کو متوجہ کرنے کے لیے کافی ہیں، سفیر نے خواب اور موت پر گفتگو کرتے ہوئے پیش لفظ کے اختتام پر تمام محبین کا شکریہ ادا کیا ہے، پروفیسر خالد جاوید صاحب نے دیباچہ میں سفیر کی شاعری پر جس انداز میں گفتگو کی ہے وہ 'موت کی کتاب' کے خالق سے ہی ممکن ہوسکتی تھی جو سفیر کے لیے یقیناً خوش بختی کی بات ہے۔

سفیر کے کلام میں ایسی مقناطیسیت ہے جو ہمیشہ اپنی جانب کھینچ لیتی ہے، زندگی جینے اور اسے گزرنے کے حوالوں کی طرف جس نظر سے سفیر دیکھتا ہے وہ شاعری میں کمیاب ہے، شاعری میں 'دیوار' کا ذکر کثرت سے ملتا ہے جو بہت سوں کے دکھ اور تنہائی کی ساتھی بھی ہے اور خود کلامی کا سب سے آسان ذریعہ بھی جسے ہمیشہ سے مختلف انداز اور رنگ ڈھنگ میں شعری پیکر کے حوالہ کیا جاتا رہا ہے، لیکن دیوار کے ساتھ شاعروں کے اس یکطرفہ رویہ اور خود دیوار کی اذیت کا پہلا خیال شاید سفیر صدیقی کو ہی آیا اور پورا کلام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں سے اس شعر کی توقع کی جاسکتی ہے۔

خون کے دھبوں سے کھینچا ہے ترے چہرے کا خط
عشق نے کیا ظلم ڈھایا بے ضرر دیوار پر

غم میں مسکرا دینے کی روایت بہت عام ہو چکی ہے لیکن اس مضمون کو سفیر نے ایک نئے لباس میں بہت خوبصورتی سے شعر کا حصہ بنایا ہے۔

وہ اشک جس کے تبسم پہ مر مٹے گا جہاں   سفید پڑتی ہوئی آنکھ سے رواں ہوگا

سفیر کی ہر غزل موت کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے جیسے سفیر کی شخصیت شاعری کے بنا ایک ڈھانچہ جس کا دکھ، رنج والم اور تنہائی سے ایک اٹوٹ رشتہ اور گہری وابستگی ہے، سفیر کو دکھوں کا خاتمہ یا زخم کی دوا اور اس کا بھر جانا بھی گوارہ نہیں، وہ موت کے زانو پر سر رکھ کر زندگی کا لطف لینا جانتا ہے، سفیر نے موت کو ایک کردار بنا کر پیش کیا ہے جو مختلف شکلوں اور صورتوں میں نئے نئے طریقوں سے خود کو ظاہر کرتی ہے کہ موت نے محبوب کی شکل اختیار کر لی ہے ایک ایسا محبوب جس کا ہجر دائمی نہیں، اسی لیے غم کی انتہا موت کو قرار دیا ہے اور جسم ایک ثانوی حیثیت کا حامل ہے جو جاں پر محض بوجھ کے سوا کچھ نہیں، اس مجموعہ میں موت وحیات کی کشاکش اپنے عروج پر نظر آتی ہے، سفیر مرنے کے روایتی انداز سے ہٹ کر موت بھی چاہتے ہیں تو نئے ڈھنگ سے، ملاحظہ ہو۔

شیشۂ خواب کو دے ماریں کسی پتھر پر   اور اس شور کی جھلائی ہوئی لے سے مریں
کوئی آواز تو تھی خواہ مری آہ سہی   اب تو سناٹا ہے بس، زخم کے بھر جانے سے
مرتے رہتے ہیں ہر ایک پل کہ نہ مر جائیں کہیں   جینے والوں کا عجب عشق ہے مر جانے سے

سفیر کے اشعار میں زندگی چلتی پھرتی اور کبھی کبھی پنکھے سے جھولتی نظر آتی ہے، پنکھا، رسی، کرسی، دوپٹہ کو سفیر نے خودکشی کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے، رات، خواب اور اداسی کا تعلق سفیر کی شاعری سے اٹوٹ ہے، سفیر موت کو سحر نو سے تعبیر کرتے ہیں اور ایک نئی زندگی کا آغاز بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔

ایک عدد موت عمر بھر کے ساتھ   یعنی سو شامیں اک سحر کے ساتھ

موت اور خودکشی کا تصور انسان کے دماغ میں اسی وقت اپنے ہاتھ پیر نکالتا ہے جب تمام راہیں مسدود، زندگی کے رپورٹ کارڈ پر منفی نتائج کی بھرمار ہو، سفیر نے اس مضمون کو شعر میں کس طرح منتقل کیا ہے، دیکھنے کی چیز ہے۔

موت کے خط مجھے یوں ہی نہیں آئے ہوں گے
زندگی نے مرے کچھ خواب چرائے ہوں گے

خوابوں کے مرثیے پڑھ کر ایک بات تو طے ہو جاتی ہے کہ سفیر موت کا نہیں درحقیقت زندگی کا شاعر ہے جسے زندگی گزارنے کا نہیں بلکہ بھرپور طور پر جینے کا ڈھنگ بھی معلوم ہے لیکن وہ موت کی بات اس لیے کرتا ہے کہ زندگی موت کے بغیر چہ معنی دارد، سفیر موت کی ترغیب نہیں دیتا ہے بلکہ اپنے اشعار کے ذریعہ زندگی سے ناامید لوگوں کے اندر زندگی جینے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے اور اس طرح موت کی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے موت کا خوف ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پکار اٹھتا ہے۔

رتجگوں سے تنگ آ کر خواب خودکشی کرلیں   اس سے لاکھ بہتر ہے ہم ہی زندگی کرلیں

پھر اگلے ہی لمحے ان کی ایک غزل کا یہ شعر اس خیال کی تردید کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن ایک باشعور قاری اس میں پوشیدہ لطیف طنز کا ادراک بآسانی کرسکتا ہے۔

کیا کہا! موت ہے علاج عشق!   چل تو پھر مر کے دیکھتے ہیں

اردو شاعری ہجر ووصال کی کشمکش سے بھری ہوئی ہے لیکن محبوب کے وصل میں اذیت کے پہلو کو بہت کم لوگوں نے شعری پیکر عطا کیا ہے، سفیر کا یہ شعر پیش خدمت ہے۔

رکیے! یاد آرہا ہے آپ کا ساتھ   ہاں! وہی نا! عذاب سا تھا جو

گھر سے دوری ومجبوری بھی سفیر کی غزل کا وہ حصہ ہے جو اسے بہت خوبصورت بناتا ہے، سفیر کی شاعری میں احتجاجی کیفیت اور جذبات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے اور انسانوں کی مردہ ضمیری اور بے حسی کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے، مشکل سے مشکل اور پیچیدہ مضمون کو سفیر صدیقی جس سہولت سے اپنی شاعری میں ادا کرتے ہیں وہ لائق ستائش بھی ہے اور باعث حیرت بھی، کچھ اشعار ایسے ہیں کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

کس قدر ضدی ہے امید کا مارا ہوا شخص   عمر بھر مر کے بھی مر جانے کا قائل نہ ہوا
اپنے اندر لیے پھرتا ہے ہر اک شخص سفیر   وہ صحیفہ جو کسی اور پہ نازل نہ ہوا

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم وہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

عالمی اردو نامہ

سرسید احمد خاں: افکار و نظریات

دوشنبہ، تاجکستان: انڈیا اسٹڈی سینٹر، تاجک نیشنل یونیورسٹی کے زیر اہتمام سرسید ڈے سے قبل 'سرسید احمد خاں: افکار و نظریات' کے موضوع پر ایک خصوصی لیکچر کا

انعقاد کیا گیا جسے وزیٹنگ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے پیش کیا۔ تقریب کی صدارت پدم شری پروفیسر، رجبوف حبیب اللہ نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو زبان و ادب، تعلیم اور فکر و فلسفہ کے تعلق سے سرسید احمد کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ تاجکستان کی قومی زبان تاجک میں بھی ان کی شخصیت اور کارنامہ پر کتابیں دستیاب ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ پروفیسر مشتاق صدف نے 'سرسید احمد خاں: افکار و نظریات' کے موضوع پر خصوصی لکچر پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرسید نے ملک میں اتحاد پسندی، رواداری اور حب الوطنی کے جذبے کو زندگی بھر فروغ دینے کا کام کیا۔ ڈاکٹر صدف نے کہا کہ سرسید نے دو قومی نظریے کی کبھی حمایت نہیں کی۔ وہ ہمیشہ اپنے ملک ہندوستان کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ انھوں نے ملی شناخت کو قائم رکھنے کے لیے ہندو مسلم کے باہمی افہام و تفہیم کی ضرورت پر زور دیا۔ جلسہ کے آغاز میں شعبۂ اردو ہندی کے چیئرمین پروفیسر قربانوف حیدر نے بھی سرسید احمد خاں کی عظیم شخصیت اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی، نیز ڈاکٹر مشتاق صدف کے خطبہ کو طلبہ و طالبات اور اساتذہ کے لیے کارآمد بتایا۔ اس موقعے پر طلبہ و طالبات کے ساتھ شعبہ کے اساتذہ محترمہ زرینہ، علی خان، محترمہ صباحت، محترمہ استد بی بی اور محترمہ شیرین نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اکتوبر 2022

عالمی کتاب میلہ، ریاض نے 2 گنیز ورلڈ ریکارڈ اپنے نام کر لیے

ریاض: ریاض انٹرنیشنل بک فیئر 2022 نے گنیز ورلڈ ریکارڈز کے دو ریکارڈ اپنے نام کر لیے۔ ایک تو 7 ہزار سے زیادہ کتابوں پر مشتمل سب سے بڑا لفظ 'ترجم' بنایا اور دوسرا دنیا کی سب سے بڑی پاپ اَپ کتاب پیش کی گئی۔ ادب، اشاعت و ترجمہ اتھارٹی نے گنیز ورلڈ ریکارڈ کے دو سرٹیفکیٹ حاصل کیے۔ اس دوران سرکاری اور سماجی شخصیات بھی موجود تھیں۔ کتابوں پر مشتمل سب سے بڑے لفظ کے لیے 'ترجم' کے لفظ کا انتخاب اس لیے کیا گیا، تاکہ ترجمہ کی ملکوں اور تہذیبوں کے درمیان پل کا کردار ادا کرنے کی اہمیت اجاگر کی جا سکے، جب کہ سب سے بڑی پاپ اَپ کتاب کے ریکارڈ کو بچوں کی زندگیوں

میں کتابوں کی اہمیت بتانے کے لیے چنا گیا۔ یہ کتاب بچوں کو راغب کرنے والے پانچ پاپ اَپ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان صفحات کو مصنفہ فاطمہ یعقوب خوجہ نے لکھا ہے اور مصورہ ندی عبدالعزیز الموسیٰ نے تیار کیا ہے۔ گنیز ورلڈ ریکارڈز بک میں ان دونوں ریکارڈز کا اندراج سعودی ادب، اشاعت اور ترجمہ اتھارٹی کے تناظر میں کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اکتوبر 2022

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

گاندھی جی کا فلسفۂ حیات ہر زمانے اور ملک کے لیے کارگر ہے: پروفیسر شیخ عقیل احمد

قیامِ افریقہ کے دوران اردو کے متعلق مہاتما گاندھی کے نظریے کی تشکیل' کے عنوان سے خصوصی لیکچر

نئی دھلی: مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش کی مناسبت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ایک خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا، جس کا موضوع 'مہاتما گاندھی کی لسانی اساس کی تلاش: قیامِ افریقہ کے دوران اردو کے متعلق ان کے نظریے کی تشکیل' تھا۔ یہ لیکچر سپریم کورٹ کے سینئر وکیل اور دانشور جناب انل نوریا نے دیا۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل نے گاندھی جی کے سیاسی وسماجی افکار اور فلسفے پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی پوری دنیا کے لیے اخلاق اور روحانی انقلاب کے پیغمبر تھے لیکن ہمارے ملک کے لیے یوں بہت خاص تھے کہ گاندھی

نے ہمارے ثقافتی اور روحانی ورثے کو یکجا کر کے اس کی مدد سے ہندوستان کے ہر فرد کو ایک مثالی انسان بنا کر ہندوستانی تہذیب کو ایک نئی تہذیب میں تبدیل کر دیا جو ایک بہت بڑا تہذیبی انقلاب تھا۔ پروفیسر عقیل احمد نے مزید کہا کہ گاندھی جی کا فلسفہ دراصل فلسفۂ حیات ہے اور یہ کسی ایک ملک یا کسی خاص زمانے کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر زمانے اور ہر ملک کے لیے ہے۔ اس لیے گاندھی جی کی شخصیت عالمگیر ہے۔ ان کے فلسفے کی بنیاد بہت مضبوط ہے۔ ان کے فلسفے کو اگر ایک وسیع ڈھانچہ مان لیا جائے تو اس کی بنیاد مذہب ہے اور باقی منزلوں کا تعلق سیاسی، سماجی، معاشی امور سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عمل وکردار کی پاکیزگی اور وقار وخودداری پر زور دیتے تھے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ گاندھی جی کے تمام تر فلسفے پر سچائی کا غلبہ ہے، ان کی تمام زندگی ہی سچائی کی تلاش وتحقیق میں گزری اور ان کی تمام سرگرمیوں کا محور یہی تھا، اسی طرح سیاست کو انھوں نے انسانیت، ملک وقوم کی خدمت کا ذریعہ سمجھا۔ مہاتما گاندھی سیاست کو وقت گزاری کا سامان نہیں سمجھتے تھے بلکہ سیاست کو ایشور کی خدمت کا ذریعہ سمجھتے تھے اور راشٹر کو 'بھگوان' سے تعبیر کرتے تھے۔ ملک کی خدمت کو اپنا فریضہ اول بتاتے تھے، دراصل یہ ہزاروں سالہ ہندوستانی کلچر کا حصہ ہے، جس میں اپنے راشٹر کا ہر ذرہ لائق پرستش ہے اور اس کا تحفظ کرنا ہمارا فرض ہے۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے مختلف مذہبی طبقات پر مشتمل ہندوستان سماج کو متحد کیا۔ گاندھی جی فرد کی تعمیر وترقی پر زیادہ زور دیتے تھے۔ انھوں نے سوراج کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ ہندوستان کے ہر گاؤں اور دور سرحد پر کھڑے ہر شخص کو انصاف ملے، ہر شخص کو ترقی کرنے کا موقع ملے تاکہ ہر شخص مرکزی دھارے میں شامل ہو کر خود بھی ملک کی ترقی میں اہم کردار نبھا سکے۔ مہاتما گاندھی چاہتے تھے کہ ہر فرد اپنے اندر اخلاقی اور روحانی قدروں کو بیدار کرے اور ملک کی ترقی میں روحانی قدروں کے ساتھ مادی ترقی بھی کرنے میں اپنا رول ادا کرے۔ تبھی ملک کی صحیح معنوں میں ترقی ہوگی۔ وزیر اعظم عالی جناب نریندر مودی جی کی نیشنل تعلیمی پالیسی میں گاندھی جی کے اس نظریے کو خاص طور پر اپنایا گیا ہے اور اس میں نئی نسل کو جدید تعلیم کے ساتھ ہندوستانی تہذیب وثقافت سے لیس کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے۔

سپریم کورٹ کے سینئر وکیل اور کئی کتابوں کے مصنف جناب انل نوریا نے اپنے خصوصی لیکچر میں قیامِ افریقہ کے دوران گاندھی جی کے اردو سے قائم ہونے والے رشتے اور مرحلہ وار اس میں ہونے والی ترقی پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی 1893 میں ایک مسلم موکل کی دعوت پر جنوبی افریقہ گئے تھے اور وہاں جن ہندوستانیوں سے ان کا سابقہ پڑا ان میں انگریزی کے علاوہ گجراتی، ہندی، تمل اور اردو والے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اسی دوران اردو سیکھی اور باضابطہ اردو کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ وہیں رہتے ہوئے انھوں نے ایک اخبار 'انڈین اوپینین' نکالا جس کے کچھ صفحات انگریزی کے علاوہ گجراتی، تمل اور اردو میں بھی ہوتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ افریقہ میں مقیم ہندوستانی شہریوں کی ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی، جس کے سرکلر گاندھی جی کی ہدایت پر انگریزی، گجراتی، تمل اور اردو میں بھی جاری کیے جاتے تھے۔ گاندھی جی اپنی انگریزی تحریروں میں بھی اردو اور عربی کے الفاظ استعمال کرتے تھے اور ان کا یہ ماننا تھا کہ اپنی زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ کو شامل کرنا اور انھیں استعمال کرنا چاہیے، اس سے زبانیں ترقی کرتی ہیں۔ انھوں نے قیامِ افریقہ کے دوران متعدد اردو شخصیات جیسے خواجہ الطاف حسین حالی اور معروف سیاست داں بدرالدین طیب جی پر جو مضامین لکھے ان میں حالی کی شاعری اور بدرالدین طیب جی کی دانشوری اور علمیت کے ساتھ خصوصاً

ان کی اردو دانی اور اردو خطابت کو قابلِ تحسین قرار دیا۔ اگر ہم زبانوں کے تعلق سے گاندھی جی کے نظریے پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بعد میں ہندوستان میں اردو اور ہندی کو ملا کر جس ہندوستانی زبان کو اپنانے کی وکالت کی، اس کی بنیاد جنوبی افریقہ میں ہی پڑ چکی تھی، اس تعلق سے ان کی تحریروں سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ خاصی دلچسپ ہیں۔

آخر میں پروفیسر ابن کنول نے اظہار خیال کرتے ہوئے اس لیکچر کو غیر معمولی افادیت کا حامل قرار دیا اور اس کے انعقاد پر قومی اردو کونسل کو مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) کے اظہار تشکر پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقعے پر کونسل کا تمام عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 اکتوبر 2022

مودی جی ہندوستان کو مثالی ریاست بنانے کے لیے شب و روز کوشاں ہیں: پروفیسر شیخ عقیل احمد

وزیر اعظم کے یومِ پیدائش کی مناسبت سے قومی اردو کونسل میں تہنیتی تقریب کا انعقاد

نئی دھلی: وزیر اعظم نریندر مودی کے 72 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ جنم دن کے مبارک موقعے پر میں وزیر اعظم شری نریندر مودی کو اپنی اور کونسل کی جانب سے تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور صحت و عافیت کے ساتھ ان کی درازی عمر کے لیے دعا گو ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مودی

کی شخصیت ایسی بااثر ہے، جس سے پوری دنیا مسحور ہے۔ مودی آج کی تاریخ میں ایک Phenomenon بن چکے ہیں۔ جس طرح سمندر کی لہریں ہوتی ہیں، جو مسلسل جاری و رساری رہتی ہیں اسی طرح مودی کی کارکردگی مسلسل جاری ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ جو لوگ مودی جی کو قریب سے جانتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ مودی اس فلاسفر کنگ کی طرح ہیں، جس کا ذکر افلاطون نے اپنی کتاب میں کیا ہے، ایک ایسا شخص جو اقتدار سے وابستہ ہونے کے باوجود اس سے الگ رہتا ہے، اس کے اندر اقتدار کا غرور نہیں ہوتا اور وہ اقتدار کو صرف عوام کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مودی جی کے اندر یہی صفت پائی جاتی ہے۔ سچائی، اعلی ذہانت، ایمان داری، صبر و استقامت، جانکاریوں کے حصول کا جذبہ مودی کی شخصیت کے لازمی عناصر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک مثالی ریاست کا قیام ان کا مقصد ہے، وہ اس ملک کے ہر شخص کو خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔

پروفیسر عقیل نے کہا کہ سوامی وویکانند کی حب الوطنی مثالی ہے۔ سوامی جی کو اس بات کا یقین تھا کہ مستقبل بھارت کا ہے، جس کا اظہار انھوں نے مشی گن یونیورسٹی میں مذاکرے کے دوران کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ''موجودہ حالات بھلے ہی آپ کے حق میں نہ ہوں لیکن اکیسویں صدی بھارت کی ہوگی۔'' مودی جی ان کے اس خواب کو تعبیر دینے کی ہر ممکن تدبیر کر رہے ہیں۔ اگر کوئی بھارت راشٹر اور سوامی وویکانند کو سمجھنا چاہتا ہے تو اسے مودی کی شخصیت اور ان کی زندگی کو سمجھنا چاہیے۔ انھیں مودی جی اپنا آئیڈیل مانتے ہیں۔ انھی کے اصولوں پر عمل کر کے وہ اس ملک کو ترقی کی اونچائی تک لے جانا چاہتے ہیں۔

شیخ عقیل نے کہا کہ مودی جی نے 2014 میں حکومت میں آتے ہی صفائی کی تحریک شروع کی جس سے ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اس سوچھتا ابھیان کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ انسان اپنا بدن اور کپڑا یا صرف اپنے گھر اور آس پاس کے ماحول کو صاف ستھرا رکھے، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان کا دل اس کی روح بھی صاف اور پاکیزہ ہو۔ جب انسان کی روح میں صفائی ہوگی تبھی اس کا ذہن اپنے یا اپنی قوم و ملک کے بارے میں تعمیری انداز میں سوچے گا اور پھر اس پر عمل کرے گا۔ اسی طرح مودی جی کا یہ نظریہ ہے کہ بھارت کی اصل ترقی و خوشحالی تبھی ہو سکتی ہے جب اس ملک کے آخری کنارے پر کھڑا آدمی بھی خوشحال ہو، اسی لیے انھوں نے ملک کے عام لوگوں کی فلاح و خوشحالی کے لیے بے شمار اسکیمیں شروع کی ہیں جن سے ملک کے ہر طبقے کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ مودی جی ایک صوفی منش آدمی ہیں، پاور کی شان شوکت اور بھوگ ولاس کی زندگی جینے کے بجائے وہ سادہ زندگی جیتے ہیں، ان کا دورِ حکمرانی ہندوستان میں سوشل ٹرانسفارمیشن کا دور ہے، وہ اس ملک میں ایک ہمہ گیر سماجی انقلاب چاہتے ہیں، وہ اس ملک کی مادی ترقی کے ساتھ روحانی ترقی بھی چاہتے ہیں اور اسی کے لیے وہ دن رات کام کر رہے ہیں۔ مودی کے کاموں کا جائزہ صرف مادی اعتبار سے نہیں لیا جا سکتا، ان کے کاموں کا جائزہ مابعد الطبیعاتی فریم ورک میں ہی لیا جا سکتا ہے۔ وہ ہندوستان کی ہزاروں سالہ قدیم ثقافتی روایات کا تحفظ اور بھارت کی شان و شوکت کو پوری دنیا میں نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے مودی جی نے نیشنل ایجوکیشن پالیسی میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور اخلاقی قدروں پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ مودی کا جو طرز حکومت ہے وہ ہندوستان کے ماضی سے جڑا ہوا ہے اور ہندوستان کو ماضی سے مستقبل کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ یوگا کو بھی انھوں نے اسی وجہ سے پوری دنیا میں متعارف کروایا ہے، جس کا مقصد صرف جسمانی ورزش نہیں، بلکہ انسان کو نیچر سے جوڑنا اور اس کے اندر کے روحانی عناصر کو بیدار کرنا ہے۔ آخر میں شیخ عقیل نے کہا کہ مودی جی نے حکمرانی کا جو راستہ اختیار کیا ہے، اس میں ہزاروں پھول بکھرے ہوئے ہیں اور وہ سچائی، اعلیٰ فکر، ایمان داری، نظم و نسق، افادیت، علم، حکمت اور گڈ گورننس کے پھول ہیں۔ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) شمع کوثر یزدانی نے بھی وزیر اعظم کو جنم دن پر مبارکباد پیش کی اور تمام شرکائے پروگرام کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کونسل کا تمام عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 ستمبر 2022

نئی نسل ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے افکار و خیالات کو آئیڈیل بنائے: پروفیسر شیخ عقیل احمد

سابق صدر جمہوریہ کے یوم پیدائش پر 'ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے سماجی و سائنسی افکار' کے عنوان سے مسابقۂ مضمون نگاری

نئی دھلی: ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام ایک سچے دیش بھکت اور سماجی و مذہبی ہم آہنگی کا استعارہ تھے۔ وہ ہندوستان میں سائنسی و روحانی ترقی کے خواہاں تھے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے سابق صدر جمہوریہ ہند اور عظیم سائنس داں ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے یوم پیدائش کے موقع پر انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا۔ شیخ عقیل نے کہا کہ ان کے نزدیک تعلیم کی غیر معمولی اہمیت تھی اور وہ بھارت کے تمام طبقات کی تعلیم پر زور دیتے تھے، اسی وجہ سے 15 اکتوبر کو World Student's Day کے طور بھی منایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے بھارت کے نوجوانوں اور خاص طور پر طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''خواب وہ نہیں ہیں، جو آپ سوتے ہوئے دیکھتے ہیں، بلکہ وہ ہیں، جو آپ کو سونے نہیں دیتے۔'' انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر کلام کا نظریہ یہ تھا کہ اساتذہ معاشرے کے معمار ہوتے ہیں اور معاشرہ اسی وقت تعلیم یافتہ بن سکتا ہے جب طلبا کو اپنے مضامین میں مہارت حاصل ہو۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ ہمیں طلبا کو زندگی کا وژن فراہم کرنا ہے اور انھیں بنیادی اخلاقی اقدار سے لیس کرنا ہے۔

ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے ان وقیع خیالات کو عملی جامہ پہنانے اور طلبا کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دینے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے گزشتہ سال کی طرح امسال بھی 18 سال تک کے طلبا و طالبات کے لیے مسابقۂ مضمون نویسی کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے، جس کا عنوان ہے 'ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے سماجی و سائنسی افکار'۔ اس مسابقے کے تعلق سے ضروری تفصیلات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں ہندوستان کے تمام نوجوان طلبا و طالبات سے اپیل کرتا ہوں کہ اس مسابقے میں ضرور حصہ لیں اور ساتھ ہی ڈاکٹر کلام کے افکار و تصورات کو اپنی زندگی اور کیریئر میں شامل کرنے کی کوشش کریں، تاکہ ایسے ہندوستان کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈال سکیں، جس کا خواب ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے دیکھا تھا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 اکتوبر 2022

کرافٹ ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام تقسیم اسناد برائے طلبا و طالبات

سری نگر: ایک پروقار تقریب میں پرشانت گوئل، (پرنسپل سکریٹری، صنعت و تجارت) جموں وکشمیر حکومت، پروفیسر عقیل احمد ڈائرکٹر، (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) اور محمود احمد شاہ، (ڈائرکٹر ہینڈی کرافٹ اینڈ ہینڈلوم) نے چھ مہینے کے پیپر میشی کورس میں تربیت حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کو سرٹیفکیٹ اور آرٹیسن کارڈ تقسیم کیے۔ 07 اکتوبر 2022 کو کشمیر ہاٹ میں اس تقریب کا انعقاد کیا گیا۔

ان کورسز نے خواتین کو بااختیار بنانے اور مختلف فنون اور دستکاریوں میں ان کی مہارت کو یقینی بنانے، انھیں باوقار طریقے سے روزی روٹی کمانے کے قابل بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ حال ہی میں ختم ہونے والے اس کورس میں 78 طالبات اور 2 طلبہ شریک تھے۔ اپنے مینڈیٹ کے مطابق کرافٹ ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ نے نوشیرہ اور آبرو ویمن ویلفیئر سوسائٹی شادی پورہ، میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام پیپر میشی میں چھ ماہ کے سرٹیفکیٹ کورس کا انعقاد کیا تھا۔ اس کورس کو اردو زبان میں تیار کیا گیا ہے تاکہ کاغذی مشین کے روایتی آرائشی فن اور دستکاری کو محفوظ کیا جاسکے اور ساتھ ہی ساتھ کاغذی مشین کی صنعت سے وابستہ اردو سے محبت کرنے والے افراد کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔

این سی پی یو ایل اسکل ڈیولپمنٹ اور ٹریننگ سینٹرز کے قیام میں مدد کرتا ہے۔ پیپر میشی کورس کا مقصد روزگار کے مواقع پیدا کرنا اور آرٹ اینڈ کرافٹ کے ذریعے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور اس کا فروغ کرنا ہے۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پرشانت گوئل نے اس کورس میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کو مبارکباد دی اور مختلف دستکاریوں کو فروغ دینے میں دستکاری اور ہینڈلوم ڈیپارٹمنٹ اور کرافٹ ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ کی کوششوں کی تعریف کی۔

پروفیسر عقیل احمد (ڈائریکٹر این سی پی یو ایل) نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کرافٹ ڈولپمنٹ کے کورسز پر اطمینان کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ این سی پی یو ایل، کرافٹ ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے آنے والے دنوں میں مزید کورسز کو متعارف کروائے گا، جیسے فن خطاطی اور دیگر مختلف دستکاری وغیرہ۔

ہینڈی کرافٹ اینڈ ہینڈلوم اینڈ کرافٹ ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر محمود احمد شاہ نے ہینڈی کرافٹ اینڈ ہینڈلوم ڈپارٹمنٹ کی جانب سے اس وقت چلائے جانے والے مختلف پروگراموں کے ساتھ ساتھ ان کورسز کے اہداف کے بارے میں بھی تفصیل فراہم کی جو اس وقت کرافٹ ڈولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے چلائے جارہے ہیں۔

گریٹر کشمیر، 13 اکتوبر 2022

جمیل اختر شفیق کے شعری مجموعے 'رقصِ سفر' کا اجرا

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں نوجوان شاعر جمیل اختر شفیق کے شعری مجموعہ 'رقص سفر' کے اجرا کی تقریب منعقد ہوئی، جس کی صدارت کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں جمیل اختر شفیق کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جمیل اختر نوعمری میں ہی بہترین شاعری کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری حقیقت سے بہت قریب ہے اور وہ گرد و پیش کے واقعات و احوال کو بہت خوبصورتی سے شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ ان کے یہاں نغمگی کی بھی کمی نہیں ہے، فنی اعتبار سے بھی ان کے اشعار میں پختگی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا شعری و ادبی مستقبل تابناک ہوگا۔

پروفیسر ابن کنول نے خصوصاً جمیل اختر کی شاعری کی سادگی اور بے تکلفانہ اندازِ اظہار کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری سہلِ ممتنع کی شاعری ہے، جو آسان نہیں ہوتی، اس کے لیے غیر معمولی فنی قدرت اور مسلسل ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

پروفیسر صفدر امام قادری نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جمیل اختر شفیق نئی نسل کے ایسے خوش نصیب شاعر ہیں جن کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے لیے مشکل ترکیبات اور عربی و فارسی الفاظ کے بجائے بہت سادہ اور بے تکلف ترکیبات و تعبیرات کا استعمال کیا ہے اور سادہ لفظوں میں بھی بڑی باوزن اور بامعنی شاعری کر رہے ہیں۔ احتجاج کی لے اور نغمگی بھی ان کی شاعری کے اہم عناصر ہیں، جو انھیں سامعین و قارئین سے بہت آسانی کے ساتھ مربوط کر دیتے ہیں۔

حقانی القاسمی نے منفرد انداز میں اس تقریب کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ جمیل اختر نئی عمر کے پختہ ذہن شاعر ہیں، ان کے بہت سے اشعار فکر و خیال کے نئے دریچے روشن کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عموماً نئی نسل کے تخلیق کاروں اور فن کاروں کے تئیں منفی رویے کا اظہار کیا جاتا ہے، جو درست نہیں ہے، جمیل اختر شفیق جیسے فنکاروں کو دیکھ اور سن کر محسوس ہوتا ہے کہ نئی نسل بہت غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل ہے اور اگر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو یہی مستقبل میں ادب و تخلیق کے بڑے کارنامے انجام دیں گے۔

ان حضرات کے علاوہ جمیل اختر شفیق کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر دہلی یونیورسٹی شعبۂ عربی کے گیسٹ فیکلٹی ڈاکٹر جسیم الدین، ڈاکٹر آفتاب منیری اور دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ سکالر اشرف یاسین نے بھی اظہار خیال کیا اور ان کے شعری اوصاف و امتیازات پر روشنی ڈالی۔ آخر میں جمیل اختر شفیق نے اس خوب صورت تقریب کے انعقاد کے لیے قومی اردو کونسل خصوصاً ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد اور دیگر معاونین کا شکریہ ادا کیا اور حاضرین کی فرمائش پر اپنی غزلوں کے منتخب اشعار بھی سنائے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 ستمبر 2022

مقیم ممتاز شاعر عبید اعظمی اور ان کے رفقا کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں ممبئی میں مقیم معروف شاعر اور ماہر عروض عبید اعظم اعظمی، فروغ اردو کے لیے سرگرم سید زاہد علی اور معروف صحافی امتیاز خلیل کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ مہمانوں کا خیر مقدم

کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے ان کا تعارف بھی کروایا، خصوصاً عبید اعظم اعظمی کی ادبی و شعری خدمات کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عبید اعظم اعظمی اردو زبان کے جینئس شاعر، نغمہ نگار اور ماہر عروض ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شاعری بہ طور خود ایک مشکل فن ہے، مگر ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کی کئی نئی بحریں بھی ایجاد کی ہیں، ممبئی یونیورسٹی میں ادب و شعر کے طلبہ کے درمیان ان کے لیکچرز بھی ہوتے رہتے ہیں، اب تک ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا ایک بڑا کام 'خرمن' کے نام سے مضطر خیرآبادی کے کلام کی تدوین ہے، جو آٹھ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ مختلف دستاویزی فلموں کے لیے نغمے لکھ چکے ہیں۔ کئی ادیبوں اور فنکاروں پر ہونے والے شوز میں اینکرنگ کر چکے ہیں۔ دسیوں ایوارڈ سے نوازے جا چکے ہیں، کئی اہم ادبی و ثقافتی اداروں سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ دوسرے مہمان سید زاہد علی کی اردو زبان سے محبت کو قابل تحسین قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ رضا کارانہ طور پر اردو کے فروغ میں سرگرم ہیں، اردو کتاب میلوں کے انعقاد میں پیش پیش رہتے ہیں اور لاکھوں کی اردو کتابوں کی فروخت کا ذریعہ بنتے ہیں، ایسے لوگ یقیناً قابل ستائش ہیں۔ تیسرے مہمان معروف صحافی امتیاز خلیل کی اردو زبان سے محبت اور اس کے فروغ کے تئیں ان کے جوش و جذبے کا شیخ عقیل احمد نے خصوصی تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ امتیاز صاحب غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کے حامل ہیں، پچھلے سال مالیگاؤں اردو کتاب میلے کے کامیاب انعقاد میں ان کا بہت اہم رول رہا ہے اور اپنے طور پر وہ اردو کے کاز کے لیے جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ شیخ عقیل احمد نے کہا کہ جب تک اردو زبان کو ایسے بے لوث خادم میسر ہیں ہماری زبان پھلتی پھولتی رہے گی اور اس کا دائرہ بڑھتا رہے گا۔

اس موقعے پر عبید اعظم اعظمی کے ذریعے لکھا گیا قومی اردو کونسل کا ترانہ بھی پروفیسر شیخ عقیل احمد کو پیش کیا گیا، جس کے لیے انھوں نے موصوف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا اور انھوں نے اپنے منتخب کلام سے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔ مہمانوں نے اس پروگرام کے انعقاد کے لیے کونسل کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ قومی اردو کونسل اردو کے فروغ کے لیے مؤثر کوششیں کر رہی ہے، جس کے لیے ڈائرکٹر صاحب خصوصاً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ عام اردو والوں کو بھی کونسل کے قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہیے تاکہ کونسل کی اسکیموں اور فروغ اردو کے منصوبوں کا فائدہ مرکزی علاقوں کے علاوہ ملک کی دور دراز کی اردو آبادی تک بھی پہنچے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 ستمبر 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

گاندھی نامہ پر قومی سمینار

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے ستیہ وتی کالج میں گاندھی اسٹڈی سرکل وستیہ وتی کالج شعبۂ اردو کے مشترکہ تعاون

سے گاندھی نامہ پر قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے شرکت کی جب کہ مہمان اعزازی کے طور پر مصنفہ ڈاکٹر رخشندہ جلیل موجود تھیں۔ سمینار کی نظامت کے فرائض پروفیسر پلوی پرساد نے بخوبی انجام دیے اور پروگرام کے نظم ونسق میں ڈاکٹر قمرالحسن پیش پیش رہے۔ اس دوران ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے اکبرالہ آبادی کے شعری مجموعہ گاندھی نامہ پر گفتگو کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ مہاتما گاندھی کے فکروخیالات اور تعلیمات پوری دنیا کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ان کی ظلم و جبر کے خلاف عدم تشدد کی تحریک نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ افریقہ ہو امریکہ ہو چاہے انگلینڈ سبھی نے گاندھی جی کی جدوجہد، کوششوں کو مانا۔ وہ ایک عالمی شہرت یافتہ سیاست داں، مصلح سماج اور ماہر تعلیم تھے۔ افریقہ کے صدر نیلسن منڈیلا نے گاندھی جی سے متاثر ہوکر ہی امتیازی نسل کے خلاف تحریک عدم تشدد شروع کی تھی، دنیا کے بیشتر لوگ مہاتما گاندھی کو ایک عظیم سیاست داں اور معاشرتی اصلاح کار کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں سرفہرست ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ صرف ایک کامیاب سیاست داں ہی نہیں تھے، بلکہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک بھی تھے۔ اہم شرکا میں انیتا سنکاریا، سورج گپتا، مردلا بھاٹیا، ششی شیکھر پرساد سنگھ، وریندر سنگھ، ڈاکٹر ندیم احمد، فرح جاوید اور نازیہ کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 ستمبر 2022

دھلی

اردو ہندوستانی زبان

نئی دھلی: ہندوستان کی آزادی اور اس کی ترقی میں اردو کی شراکت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بھارت میں اب بھی پاکستان سے زیادہ اردو بولنے والے ہیں۔ یہ مسئلہ یک روزہ قومی اردو سمینار دہلی میں سامنے آیا۔ انڈو اسلامک ہیریٹیج سنٹر (IIHC) کی جانب سے انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں یکم اکتوبر 2022 بروز ہفتہ 'اردو ہندوستانی زبان' پر سمینار صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک چلا۔ اس موقعے

پر 15 صحافیوں کو 'تہذیب اردو' ایوارڈ سے نوازا گیا۔

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن کے ڈائریکٹر جنرل سنجے دویدی نے کہا کہ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے اور اس میں کبھی کوئی شک نہیں رہا ہے۔ اگر ملک تقسیم نہ ہوا ہوتا تو نزاع کی یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ تقسیم سے پہلے اردو اخبارات کے زیادہ تر مالکان، مدیران، ناشرین اور ہرکارے ہندو تھے اور انہی ہندو مالکان کے اردو اخبارات نے آزادی کے لیے انقلاب و سرفروشی کی آواز بلند کی جس میں ایسی آگ ہوتی تھی کہ اس کی تپش سے محفوظ رہنے کے لیے انگریز حکومت مالکان اور مدیروں کو پھانسی دے ڈالتی اور آج بھی بہت سے صحافتی اداروں کے مالکان ہندو ہیں۔

مہمان خصوصی سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی مارہروی صاحب نے اپنے کلیدی خطاب میں کہا کہ زبانیں اپنے چاہنے والوں کی بدولت زندہ رہتی ہیں جس کے لیے مادی دولت کی ضرورت کم ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مخالفین کے نزدیک بھی یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ 'بہت سی خوبیاں ہیں اردو زبان میں' جس کا اظہار ہر ہندوستانی کی گفتگو، اظہار خیال اور خطاب سے ہو جاتا ہے۔

آئی آئی ایچ سی کے ڈائریکٹر پروفیسر لیاقت حسین معینی نے کہا کہ حضرت امیر خسرو نے اردو کو طاقت دی اور صوفیہ کرام نے اردو کو مقامی آبادی اور عوام وخواص سے جوڑ دیا۔ 'اردو ہندوستانی زبان' کے تناظر میں منشی نول کشور کی طباعتی اور اشاعتی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا یعنی اردو فقط زبان نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کا نام ہے۔

صدر اجلاس پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو میرے نزدیک ثقافت اور ماں کا درجہ رکھتی ہے، ماں، ملک اور مادری زبان کا تعلق معدہ سے نہیں بلکہ دل سے ہے اور دل سے رہا ہے۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا لیکن مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان مکالمے کے لیے ہوتی ہے، جھگڑے کے لیے نہیں۔

آئی آئی ایچ سی کے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر شجاعت علی قادری نے کہا کہ وہ جغرافیائی حصہ جسے اردو کا مادر وطن کہا جاتا ہے، تقسیم وطن کے بعد بھی ہندوستان میں موجود ہے آج بھی پاکستان کی صرف 8 فیصد آبادی اردو بولتی ہے۔

مہمانوں کا استقبال ڈاکٹر شجاعت علی قادری (ڈپٹی ڈائریکٹر IIHC) نے کیا۔ کنوینر مولانا محمد ظفرالدین برکاتی اور معروف ناظم اجلاس ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے نظامت کی۔

سمینار میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ اکرام الدین صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین کالج دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر اعلم شمس صاحب، بنارس ہندو یونیورسٹی سے ڈاکٹر رشی کمار شرما، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈاکٹر واحد نظیر اور محترمہ ڈاکٹر حنا آفرین، پاٹلی پترا یونیورسٹی پٹنہ سے

پروفیسر صفدر امام قادری، جامعہ ہمدرد سے پروفیسر غلام یحییٰ انجم مصباحی اور ڈاکٹر محمد احمد نعیمی، کشمیر سے صوفی منظور ظہور چشتی، قومی اردو کونسل دہلی سے حقانی القاسمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹر سید سراج اجملی اور ڈاکٹر اشہر قدیر صاحبان، ہری دیو جوشی جرنلزم یونیورسٹی جے پور سے ڈاکٹر اخلاق احمد عثمانی، معروف صحافی احمد جاوید صاحب اور شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی سے سید علی رضوی، کالم نویس صحافی ڈاکٹر ابھے کمار جی، معروف قلم کار سہیل انجم صاحب، مولانا غلام مصطفیٰ نعیمی اتراکھنڈ وغیرہ شامل رہے۔

الوداعی اجلاس میں اردو زبان کی خدمت کے اعزاز میں پندرہ صحافیوں، قلم کاروں، ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور محبان اردو کو پروفیسر لیاقت حسین معینی صاحب اور ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ ناول نگار قلم کار مصنف و شاعر سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی مارہروی صاحب کے ہاتھوں سے 'تہذیب اردو ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ ایوارڈ یافتگان میں خورشید ربانی (چیف ایڈیٹر تہذیب ٹی وی)، ڈاکٹر یامین انصاری (ریزیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ انقلاب)، طارق فریدی (ایڈیٹر اینڈ ہیڈ زی سلام چینل، عبدالماجد نظامی (گروپ ایڈیٹر راشٹریہ سہارا اردو)، سہیل اختر قاسمی (آزاد صحافی، نیوز 18 والے)، ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (معروف نقیب و ناظم اجلاس)، معین شاداب (ناظم و شاعر: اینکر پروڈیوسر سہارا سے)، نواب علی اختر (ڈیسک ایڈیٹر روز نامہ صحافت نئی دہلی)، فیض عالم فیضی (بھارتیہ براڈ کاسٹنگ گروپ نئی دہلی)، محمد سالم (پروڈیوسر دوردرشن دہلی)، ڈاکٹر ابھے کمار (کالم نویس، آزاد صحافی)، توفیق رضوی (پروڈیوسر اے این آئی دہلی)، منظور ظہور چشتی (صوفی میڈیا نیٹ ورک کشمیر)، مولانا محمد قمر انجم فیضی (ایڈیٹر 'جام میر' صحافی روزنامہ شان سدھارتھ لکھنؤ) کے نام شامل ہیں۔

پریس ریلیز: ظفرالدین برکاتی، دہلی، 13 اکتوبر 2022

مولوی محمد باقر یادگاری خطبہ

نئی دھلی: ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں جام شہادت نوش کرنے والے عظیم صحافی مولوی محمد باقر کے یوم شہادت پر یہاں پریس کلب آف انڈیا میں یادگاری خطبہ کے دوران ممتاز ادیب اور ڈرامہ نویس پروفیسر اصغر وجاہت نے کہا کہ مولوی محمد باقر کی عظیم قربانی کو یاد رکھنے کے ساتھ ہمیں اس کردار کو بھی زندہ کرنا چاہیے جو اردو زبان نے ملک کی آزادی کی لڑائی میں ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تاریخ ہمارے گھر کا پتہ ہوتی ہے، اگر ہم نے اسے فراموش کر دیا تو ہم اپنے گھر تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ قبل ازیں تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ بڑی ولولہ انگیز رہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولوی محمد باقر ہندوستان میں کسی بھی زبان کے پہلے صحافی تھے جنھیں انگریزوں نے سزائے موت دی تھی، انھیں پھانسی پر نہیں چڑھایا گیا بلکہ آج ہی کے دن 16 ستمبر کو دہلی میں خونی دروازہ کے پاس توپ کے دہانے پر رکھ کر اڑا دیا گیا اور ان کے جسم کے چیتھڑے اڑ گئے، اس وقت ان کی عمر 77 برس تھی۔ معصوم مرادآبادی نے کہا کہ تحریک آزادی میں مولوی محمد باقر کا کردار صرف ایک اخبار نویس کا کردار نہیں ہے بلکہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے معاون کے طور پر جو کردار ادا کیا ہے وہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ عربی اور فارسی کے بڑے اسکالر تھے، کئی انگریزوں کو انھوں نے عربی اور فارسی پڑھائی تھی۔

یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر اصغر وجاہت نے کہا کہ مولوی محمد باقر کی عظیم قربانی کو یاد کرنے کے ساتھ ہمیں کچھ اہم نکات پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے، تحریک آزادی میں اردو کی اہمیت اور اس کے تعاون کو آج کی نئی نسل نہیں جانتی۔ انھوں نے کہا کہ مولوی محمد باقر کے حوالے سے پریس کلب نے جو پروگرام رکھا ہے اس کو بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے، ہندی اور دیگر زبانوں میں بھی ان کی قربانی کو یاد کیا جائے تاکہ وہ ان کی قربانی لوگوں کے سامنے آسکے یہ بڑی اہم بات ہوگی۔ مولوی باقر کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ انسانیت نواز تھے، یہ جانتے ہوئے کہ انگریزوں کے خلاف ہم لڑائی لڑ رہے ہیں انھوں نے دلی کالج کے وائس پرنسپل ٹیلر کی جان بچانے کی کوشش کی، ان کی کوشش یہ ثابت کرتی ہے کہ ان کا وژن کتنا بڑا تھا۔

پریس کلب آف انڈیا کے صدر اوما کانت لکھیڑا نے کہا کہ میں نے معصوم مرادآبادی کی کتاب میں مولوی محمد باقر کی قربانی کے بارے میں پڑھا، ان کے بارے میں پڑھ کر میں بہت جذباتی ہوا، اور میں نے فیصلہ کیا کہ ان کی قربانی کو ہم آنے والی نسلوں تک لے کر جائیں گے اور ہر سال پریس کلب آف انڈیا کی جانب سے 16 ستمبر یوم شہادت پر ان کے نام سے یادگاری خطبہ کا اہتمام کیا جائے گا اور مولوی محمد باقر کے نام سے ایوارڈ بھی تقسیم کیے جائیں گے، اس کام کے لیے کلب کی مینجمنٹ کمیٹی نے ایک جیوری تشکیل دی ہے جس کی سربراہی پروفیسر اصغر وجاہت کریں گے۔ اس موقع پر اے یو آصف، عبدالباری مسعود، شبیہ احمد، ڈاکٹر سلیم قدوائی، ڈاکٹر سید احمد خان نے بھی اظہار خیال کیا۔ یادگاری خطبہ میں بڑی تعداد میں صحافیوں اور دانشوروں نے شرکت کی، ان میں شہباز حسیبی، مجیب الدین خاں، انگریزی صحافی فراز احمد، ایس کے پانڈے، شاہد عباس، جاوید اختر، رؤف رامش وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز: معصوم مرادآبادی، دہلی، 16 ستمبر 2022

معاشرے میں میڈیا کا کردار

نئی دھلی: دہلی کے دینی و عصری ادارہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیا میں اپنی روایت کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر کوثر نیازی کی معرفت سے جامعہ ہذا کے پرنسپل مولانا محمد عابد علی نظامی ازہری کی قیادت میں 'معاشرے میں میڈیا و صحافت کا کردار' ایک محاضرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی محمد مناظر عالم (پروڈیوسر ٹی وی، 9 بھارت ورش ہندی چینل) بحیثیت لیکچر رمدعو تھے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر مشرف عالم (اسسٹنٹ پروفیسر دہلی یونیورسٹی) نے طلبہ جامعہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صحافت کو جمہوریت کا ستون کہا جاتا ہے، اگر صحافت اپنا کام شفافیت اور صداقت کے ساتھ انجام دے تو ہی جمہوریت کا نظام بہتر طریقے سے چل سکتا ہے۔ بعدہ مہمان خصوصی محمد مناظر عالم نے اپنے لیکچر کے دوران کہا کہ آج کے اس دور میں سوشل میڈیا کا بہت محتاط ہو کر استعمال کرنے کی ضرورت ہے، کسی بھی حساس مسئلے میں جذبات میں آکر اپنا ردعمل ظاہر کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مزید آپ نے صحافت کے اقسام الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا وغیرہ کی مختصر وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس زمانہ میں جس

ایجاد و اختراع نے انقلاب برپا کیا ہوا ہے اور جس نے دنیا کو گویا ہر ایک سے جوڑ دیا ہے وہ سوشل میڈیا ہے۔ اخیر میں طلبہ کو سوالات و جوبات کے لیے وقت دیا گیا اور یہ سلسلہ کافی دراز رہا۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 ستمبر 2022

مسلمان، ہندو دھرم اور ہندوستانیت

نئی دھلی: خسرو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے تعاون سے کانفرنس ہال میں یک روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ 'مسلمان: ہندو دھرم اور ہندوستانیت' کے عنوان سے منعقدہ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن کے ڈائرکٹر جنرل پروفیسر سنجے دویدی نے کہا کہ توڑنے والوں کے مقابلے میں ملک کے اندر جوڑنے والی طاقتیں زیادہ ہیں لیکن کچھ لوگ یہ کوششیں کرتے رہتے ہیں کہ اتحاد او اتفاق ختم ہوجائے، ان کو شکست دینے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریب آئیں اور اس طرح کے پروگراموں کا انعقاد کریں۔ اس سے قبل استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ تمام دوریاں غلط فہمیوں کی وجہ سے پیدا ہورہی ہیں، اسی لیے ہم نے کوشش کی ہے کہ 'مسلمان: ہندو دھرم اور ہندوستانیت' کے حوالے سے یہ سمینار کریں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندو دھرم کے مذہبی صحیفوں کے جو تراجم کیے اور ہندو دھرم کو متعارف کرانے میں جو کام کیا ہے اور ہندوستانیت کے فروغ میں اور استحکام میں ان کی جو خدمات ہیں ان کو منظر عام پر لایا جائے اور ان کو بتایا جائے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز ادیب شمیم طارق نے کہا کہ ہندوستان، ہندوستانیت اور ہندوستان میں بسنے والی جماعتیں، اقوام ہر زمانے میں لاشعوری طور پر متحد رہی ہیں۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے آئی پی ایس اجے چودھری نے کہا کہ بنیادی طور پر ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اتحاد و اتفاق کے اندر ہی ہمارے ملک کی بہبود و بھلائی ہے، میری تعلیم علی گڑھ میں ہوئی وہاں مجھے جو مسلمانوں سے پیار ملا وہ غیر معمولی تھا۔ افتتاحی اجلاس کے آخر میں خسرو فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر سراج الدین قریشی نے تمام مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ خسرو فاؤنڈیشن ملک میں پھیلنے والی نفرت کی فضا کو محبت میں تبدیل کرنے کے لیے اس طرح کے پروگرام کو وقت کی ضرورت مانتا ہے اسی حوالے سے ہم نے یہ پروگرام رکھا ہے تاکہ عوام کو صحیح تصویر کا رخ دکھایا جاسکے۔

پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر جے ایس راجپوت اور پروفیسر اقتدار محمد خان نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی، اجے مالویہ، صفدر امام قادری اور پروفیسر محمد اقبال نے مقالات پیش کیے۔ نظامت عامر فہیم نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول اور پروفیسر ابن کنول نے کی۔ چندر بھان خیال، فاروق ارگلی، حقانی القاسمی، ظفر دارک قاسمی اور کامران واسع نے مقالات پیش کیے، جب کہ نظامت اشرف الکوثر نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 ستمبر 2022

حکیم عبدالحمید میموریل لیکچر

نئی دھلی: جامعہ ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمید کے یوم پیدائش کے موقعے پر جامعہ ہمدرد کی جانب سے امسال بھی حکیم عبدالحمید میموریل لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس کا موضوع 'تعلقات کا دائرہ، تبادلے اور مواقع، ہندوستان کا قریبی اور توسیعی پڑوس' تھا جسے ممتاز کلیدی اسپیکر دیپا گوپالن وادھوا، آئی ایف ایس (ریٹائرڈ)، کیریئر ڈپلومیٹ، جاپان، سویڈن اور قطر میں سابق سفیر نے پیش کیا۔ پروگرام کا آغاز مہمان خصوصی جامعہ ہمدرد کے چانسلر حماد احمد، دیپا گوپالن وادھوا اور دیگر معززین کے استقبال سے ہوا۔ افتتاحی خطاب کے بعد جامعہ ہمدرد کے سینٹر فار ماس کمیونی کیشن اینڈ میڈیا اسٹڈیز کی جانب سے مرحوم حکیم عبدالحمید کی زندگی اور میراث پر ایک فلم پیش کی گئی۔ اس کے بعد طلبا نے یونیورسٹی ترانہ پیش کیا۔ ڈاکٹر زینت اقبال نے مہمانِ خصوصی کا تعارف پیش کیا۔ یادگاری لیکچر تعلقات کا دائرہ، تبادلے اور مواقع - ہندوستان کے قریبی اور توسیعی پڑوس' کے عنوان کے ساتھ آگے بڑھا۔ دیپا گوپالن وادھوا نے اپنے لیکچر میں ہندوستان کے پڑوس اور اس کے اردگرد کے مسائل جیسے باہمی تعلقات، بیرونی سلامتی کے معاملات، نقل مکانی کے مسائل وغیرہ پر روشنی ڈالی۔ محترمہ وادھوا نے ہندوستانی حکومت کی طرف سے اپنے پڑوس میں تعلقات کو فروغ دینے کے لیے کیے گئے حالیہ پالیسی اقدامات پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے حکیم عبدالحمید مرحوم کی زندگی اور میراث کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم حمید صاحب کی زندگی اور میراث آج کی دنیا میں بھی کارگر ہے۔ صدارتی تقریر جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر (ڈاکٹر) ایم افشار عالم نے کی جس میں انھوں نے حکیم عبدالحمید مرحوم کی تحریک اور خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ جامعہ ہمدرد کے یوم تاسیس کے اس مبارک موقعے پر جامعہ کے وائس چانسلر نے چانسلر حماد احمد اور ساجد احمد، سکریٹری، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن (انڈیا) کی موجودگی میں ریسرچ مینجمنٹ سسٹم (آر ایم ایس) کا آغاز کیا۔ پروگرام کا اختتام سید سعود اختر، رجسٹرار، جامعہ ہمدرد کے اظہار تشکر سے ہوا۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 ستمبر 2022

غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام حکیم عبدالحمید میموریل لیکچر

نئی دھلی: حکیم عبدالحمید کے یوم پیدائش کے موقعے پر غالب اکیڈمی میں 'حکیم عبدالحمید یادگاری خطبہ' کا انعقاد

کیا گیا۔ اس موقعے پر کلیدی مقرر دہلی یونیورسٹی شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر ابن کنول نے اپنے خطاب میں کہا کہ حکیم عبدالحمید نے انسانیت اور قوم کے لیے جو کام کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے کہا کہ 19 ویں صدی میں جس تعلیمی مشن کو سر سید احمد نے شروع کیا تھا اس کو 20 ویں صدی میں حکیم عبدالحمید نے پروان چڑھانے کا کام کیا ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے بتایا کہ حکیم عبدالحمید کی والدہ نے ان کو اور ان کے چھوٹے بھائی حکیم محمد سعید کو اچھی تربیت دی تھی، ان کی والدہ کے اندر بھی قوم کی خدمت کا جذبہ تھا۔ انھوں نے اپنے انتقال کے وقت دونوں بھائیوں سے کہا کہ اپنی پوری زندگی انسانیت اور قوم کے لیے وقف کرنا، ہمیشہ علم کی باگ ڈور سنبھال کر رکھنا، کبھی کسی سے بدلہ نہ لینا۔ اس تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بھائی نے مل کر ہمدرد دواخانہ کو بلندیوں پر پہنچایا۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکیم صاحب غالب نواز تھے۔ غالب اکیڈمی مزار غالب کے پاس قائم کر کے غالب نوازی کا حق ادا کیا۔ ناقدین اور محققین کی طرح غالبیات کے ضمن میں حکیم صاحب کا نام لیا جائے گا۔ وہ خود ادارہ تھے۔ دو درجن سے زیادہ ادارے قائم کیے۔ انھوں نے پوری زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

ڈاکٹر جی آر کنول نے تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب کامل مرد مومن تھے۔ ایسے بے مثال انسان اس دنیا میں بہت کم ہیں اور صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ حکیم خالد صدیقی کی عدم موجودگی میں ان کا مقالہ ڈاکٹر عقیل احمد نے پڑھا۔ پروگرام میں بڑی تعداد میں طلبہ اور اساتذہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 ستمبر 2022

'ہندوستان میں عربی شاعری: مسائل اور چیلنجز' کا منظر

ہندوستان میں عربی شاعری: مسائل اور چیلنجز

نئی دھلی: انڈیا عرب کلچرل سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'ہندوستان میں عربی شاعری: مسائل اور چیلنجز' کے موضوع پر توسیعی خطبہ کا پروفیسر محمد ایوب ندوی ڈائرکٹر انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں انعقاد کیا گیا جس میں کویت یونیورسٹی کے سابق استاذ پروفیسر عبداللہ قتم نے اپنا خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کے آغاز میں پروفیسر محمد ایوب ندوی نے مہمان خطیب، اساتذہ اور طلبہ و طالبات کا استقبال کرتے ہوئے انڈیا عرب کلچرل سینٹر اور پروفیسر عبداللہ قتم کا تعارف پیش کیا نیز موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر محمد ایوب ندوی کے بعد مہمان خطیب نے ہندوستان کی عربی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جب ہم ہندوستان کی عربی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بعض شعرا کی شاعری عرب شعرا جیسی معلوم ہوتی ہے۔ بعض ہندوستانی شعرا نے بھی مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ نے اپنے خطاب میں کہا کہ کئی سالوں قبل میں نے ہندوستان کی عربی شاعری کے کچھ نمونوں کو پڑھا اور اس کے بعد ہندوستان آکر یہاں کے بہت سے شعرا کی زندگی اور ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جنھیں میں نے ایک جگہ جمع کیا تاکہ عربوں کے سامنے ہندوستان کی شاعری کا نمونہ آسکے، اس کام کو مکمل کرنے میں مجھے تاج العروس سے کافی مدد ملی ہے۔ موصوف نے ہندوستان کی عربی نعتیہ شاعری پر بھی روشنی ڈالی۔ پروگرام کے آخر میں انڈیا عرب کلچرل سینٹر کے استاذ ڈاکٹر آفتاب عالم نے مہمان خطیب، اساتذہ اور تمام طلبہ و طالبات کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں بطور خاص پروفیسر حبیب اللہ خان، پروفیسر عبدالماجد قاضی، پروفیسر فوزان احمد، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن، ڈاکٹر احسن رضا اور دوسرے اساتذہ کے علاوہ انڈیا عرب کلچرل سینٹر اور شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 ستمبر 2022

ایک شام کنور مہندر سنگھ بیدی کے نام

نئی دھلی: گزشتہ روز کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ اور یوتھ آف یونیورس کے اشتراک سے ڈی اے وی کالج فرید آباد کے آڈیٹوریم میں ایک شام کنور مہندر سنگھ بیدی کے نام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر کالج کی موسیقی کی طالبات انیتا، نندی، امرتی، درشٹی اور کرشنا نے کنور مہندر سنگھ بیدی کی غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کیں۔ ہریانہ پنجابی اکیڈمی کے نائب صدر گوروندر سنگھ دھیما کو 2021 کا اور ادبی سنگم کے بانی کیول کرشن بہل کو 2020 کا ایوارڈ دیا گیا اور اردو کے مشہور افسانہ نگار کلدیپ جوشی کو بھی ایوارڈ دیا گیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کنور مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، وہ اچھے شاعر اور ایک بہترین نثر نگار تھے۔ حاکم تھے منصف تھے۔ اچھے انسان تھے۔ 1947 میں تقسیم کے وقت دہلی میں برپا ہونے والے فسادات کو روکا۔ ادبی اور کلچرل پروگراموں کا انعقاد کرکے لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھا۔ لال قلعہ کے مشاعرے کی بنیاد بیدی صاحب نے ہی ڈالی تھی۔ ان کا تعلق بابا گرونانک دیو کے خاندان سے تھا۔ کے ایل نارنگ ساقی کی کوششوں سے بیدی صاحب کی یاد کا سلسلہ قائم ہے۔ اس موقعے پر رہنمائے تعلیم جدید کے کنور مہندر سنگھ بیدی کے خصوصی نمبر کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس جلسے میں ہریانہ کی مشہور و معروف ادبی، سماجی، صنعتی ہستیاں موجود تھیں جن میں کنور مہندر سنگھ بیدی کے نواسے اور ٹرسٹ کے چیئرمین سردار اشوجیت سنگھ، کے ایل نارنگ ساقی، متین امروہوی، ابونعمان، اشونی کمار، سیما ترکھا، ممبر اسمبلی ہریانہ، ٹی ایم للانی، ڈاکٹر برہم دت، رشی پال چوہان، ناگالینڈ یونیورسٹی کے پرو چانسلر ڈاکٹر ایس این پانڈے، پانچ سو سے زائد سامعین کی موجودگی میں پروگرام کے آرگنائزر جیوتی سنگ نظامت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیے۔ اس موقعے پر مشہور شاعر متین امروہوی نے بیدی صاحب پر ایک نظم پیش کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 ستمبر 2022

ترقی پسند ادبی صحافت

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایوان غالب میں ڈاکٹر لئیق رضوی کی کتاب 'ترقی پسند ادبی صحافت' پر مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ ترقی پسند ادبی تحریک نے کئی جہتوں سے اردو ادب کو ثروت مند بنایا ہے۔ کوئی بھی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو پاتی جب تک اس کے تمام پہلوؤں کو

باقاعدہ ضابطے میں نہ لایا جائے۔ چنانچہ میڈیا کا کردار اس لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق عوام و خواص سے یکساں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر لئیق رضوی کی کتاب نے تحریک کے اس پہلو کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ میں ان کی اس کامیاب کوشش کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی یہ روایت ہے کہ نہ صرف یہاں اہم موضوعات پر سمینار ہوتے ہیں اور کتابیں شائع کی جاتی ہیں بلکہ ایسی اہم کتابوں پر مذاکرے کا سلسلہ بھی رہتا ہے جن کی اپنی ایک اہمیت ہے اور علمی بحثوں کو آگے بڑھانے میں ایک کردار ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ ترقی پسند تحریک اردو ادب کا بہت مرکزی موضوع رہا ہے۔ اس تحریک کے اکثر گوشوں پر خوب بحثیں ہوئیں اور لکھا گیا، لیکن ادبی صحافت کہیں نہ کہیں چھوٹ جاتی تھی۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ ڈاکٹر لئیق رضوی نے اس کمی کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس پر غیر جانبدارانہ انداز میں تبصرہ بھی کیا ہے۔ پروفیسر سراج اجملی نے کہا کہ لئیق رضوی سے میرا پرانا تعلق ہے۔ ان کی شخصیت میں احساس ذمہ داری بہت ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ بھی رہے۔ اس کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ انھوں نے وہاں بھی اپنی ذمے داری کا یہ ثبوت دیا کہ ایسے گوشے کو مرکز میں لے آئے جس کی طرف توجہ نہیں کی جا رہی تھی۔ یہ

ایک مشکل کام اس لحاظ سے تھا کہ تمام رسائل واخبارات تلاش کرنا کتابوں کی فراہمی سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ڈاکٹر لئیق رضوی نے کہا کہ ایک مصنف کے لیے اس کی کتاب کی اصل قیمت یہ ہے کہ اسے اچھے قارئین مل جائیں۔ مجھے اس بات سے بڑا حوصلہ ملا کہ آج کے جلسے میں آپ لوگوں نے اس کتاب کے تعلق سے گفتگو کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ میری کتاب پر مذاکرے کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر متین امروہوی نے تہنیتی قطعہ پیش کیا۔ مذاکرے کی نظامت معین شاداب نے کی۔ ادب اور صحافت کی دنیا کی اہم شخصیات نے اس مذاکرے میں شرکت فرمائی۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 18 ستمبر 2022

بہار

رسالت مآب

پٹنہ: اردو کونسل ہند کے زیراہتمام پروفیسر علیم اللہ حالی کی سرپرستی میں ان کی رہائش گاہ پر 'ادبی گفتگو سلسلہ 8' کا کامیاب انعقاد عمل میں آیا۔ اس مخصوص ادبی نشست میں اردو ادب کی روشن اور معتبر شخصیتوں نے شرکت کی۔ اس نشست میں معروف شاعر ظفر صدیقی کے نو وارد مجموعہ نعت 'رسالت مآب' پر دانشوران شعروادب نے تنقیدی نقطہ سے اس کے فکری اور فنی پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لیا اور اتفاق رائے سے اسے ایک منفرد اور محترم نعتیہ کاوش قرار دیا۔ پروگرام کے سرپرست پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہا کہ ظفر صدیقی اردو غزل کے ایک اچھے شاعر ہیں لیکن نعتیہ کلام میں بھی ان کا جوہر نکھر کر سامنے آیا ہے ان کے تازہ نعتیہ مجموعے 'رسالت مآب' کو نعتیہ شاعری میں ایک مستحسن اضافے سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ شفیع مشہدی نے کہا کہ نعت گوئی ایک مشکل ترین فن ہے مگر ظفر صدیقی اس منزل سے کامران گزرے ہیں، ان کے نعتیہ مجموعہ رسالت مآب کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کہا کہ ظفر صدیقی نعت گوئی کو عبادت سمجھتے ہیں غزل میں ان کا لہجہ راست اور بلند آہنگ ہے لیکن نعت گوئی کے وقت ظفر صدیقی نے اس صنف کے تمام لوازمات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور بہترین نعت کہی ہے جو عشق رسول سے سرشار ہے۔ پروفیسر منظر اعجاز نے ان کی غزل گوئی اور نعت گوئی کے حوالے سے تفصیلی بات کی اور اشعار کے حوالے سے ثابت کیا کہ ظفر صدیقی ایک بہترین نعت گو شاعر ہیں۔ مشتاق احمد نوری نے بھی مختلف اشعار کے حوالے اور ان تشریح سے ثابت کیا کہ ظفر صدیقی نعت گوئی کا ہنر جانتے ہیں۔ انھوں نے اس سے قبل کے مجموعہ نعت 'بعد از خدا' کے حوالے سے بھی ان کی نعت گوئی کو خوب سراہا۔ امتیاز احمد کریمی نے ظفر صدیقی کے کلام کی بھرپور ستائش کی اور کہا کہ ان کی شعر گوئی کا انداز ایسا ہے کہ شعر کا مفہوم بولنے لگتا ہے ان کی نعتیں لاجواب ہیں انھوں نے کہا کہ اردو کونسل ادبی گفتگو کی محفل سے ایک ادبی ماحول پیدا کر رہی ہے۔ جو مستحسن ہے۔

پریس ریلیز: اسلم جاوداں، پٹنہ 25 ستمبر 2022

مشرف عالم ذوقی: حیات وخدمات

دربھنگہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ کے زیراہتمام یک روزہ سمینار بعنوان: مشرف عالم ذوقی: حیات و خدمات کا انعقاد سی ایم کالج کے کرپوری ٹھاکر آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ اس موقع پر پروگرام میں شامل مہمانان کا استقبال چادر پوشی اور گلدستہ پیش کر کیا گیا۔ پروگرام میں پہلا حصہ سیمینار کا تھا جو دن کے دس بجے سے بارہ بجے تک رواں دواں ہو کر اختتام پذیر ہوا جس کی صدارت پروفیسر سید احمد قادری فرما رہے تھے۔ مہمان کے طور پر ڈاکٹر مشتاق احمد، اردو اکیڈمی کے سابق سکریٹری مشتاق احمد نوری، رسالہ 'ثالث' کے مدیر اقبال حسن آزاد، شمیم قاسمی (پٹنہ)، ریحان غنی (پٹنہ)، انوارالحسن وسطوی (حاجی پور)، سلطان آزاد (پٹنہ) کامران غنی صبا (پٹنہ) شامل تھے۔ روزنامہ قومی تنظیم کے مدیر اعلیٰ ایس ایم فرید نے کہا کہ مشرف عالم ذوقی اپنی بے باک تحریروں کے لیے جانے جاتے تھے۔ ہر طرح کی ظلم وزیادتی، سماجی، سیاسی برائیوں اور تہذیبی گراوٹ کی طرف عوام اور پڑھے لکھے طبقوں کا دھیان متوجہ کراتے رہتے تھے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے قارئین ان کی تحریروں کو بڑے دھیان سے پڑھتے ہیں۔ سمینار کے اجلاس میں اپنا مقالہ مشرف عالم ذوقی کے نام منسوب کرتے ہوئے مانو ریجنل سینٹر کولکاتہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر امام اعظم نے نہایت منصفانہ انداز میں مشرف عالم ذوقی کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے کہا وہ اردو فکشن کا ایک منور ستارہ تھے اردو ناول ہو یا افسانہ دونوں میں مشرف عالم ذوقی اپنے فکر و فن کے اعتبار سے بھی منفرد و ممتاز شناخت کے حامل تھے۔ پروفیسر محمد آفتاب اشرف صدر شعبہ اردو للت نارائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ نے سمینار کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مشرف عالم ذوقی اردو اور ہندی زبان وادب بالخصوص فکشن نگاری کا معتبر نام ہے انہیں برصغیر ہند و پاک سمیت پوری ادبی دنیا میں غیر معمولی اہمیت اور مقام خاص حاصل تھا۔ خلیق الزماں نصرت نے اپنے مقالہ میں کہا کہ مشرف عالم ذوقی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ وہ جیسا سوچتے ہیں اپنی تحریر کو ویسا ہی پیش کرتے ہیں ان پر کسی کا دباؤ نہیں ہے اس لیے وہ اپنے ناول میں حقیقت کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ کنوینر نوجوان صحافی ڈاکٹر منصور خوشتر نے کہا کہ مشرف عالم ذوقی اردو کے اہم ناول نگار تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا بہت سوچ سمجھ کر اور پوری ذمے داری کے ساتھ لکھا۔ نیلام گھر، شہر چپ ہے، بیان، پوکے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی عجیب داستان، لے سانس بھی آہستہ وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔ سیمینار میں سلطان آزاد نے اپنا مقالہ بعنوان مشرف عالم ذوقی ایک قدآور فنکار پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو کے ان چند مشہور افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں تھے جنہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ کم وقت میں بہت سارے افسانے اور ناول لکھے۔ صدارتی خطبہ میں سید احمد قادری نے جہاں روزنامہ قومی تنظیم کے گولڈن جبلی پروگرام کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مدیر اعلیٰ ایس ایم اشرف فرید مدیر طارق فرید اور پروگرام کے کنوینر نوجوان صحافی ڈاکٹر منصور خوشتر کو مبارک بادیاں دیں وہیں اس پروگرام کے پہلے اجلاس کو سمینار کی شکل میں مشرف عالم ذوقی کے نام کرنے پر بھی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ مشرف

عالم ذوقی ادبی دنیا کی وہ شخصیت ہے جس نے اپنی زندگی کو ادب کے نام وقف کر دیا تھا مشرف عالم ذوقی کی مناسبت سے پیش کیے گئے تمام مقالے اور خطبات کی بھی انھوں نے پوری فراخ دلی سے پذیرائی کی۔ مستفیض احد عارفی (مظفر پور)، ڈاکٹر عبدالحی، عارف اقبال (پٹنہ) ڈاکٹر فیضان حیدر، ڈاکٹر ریحان احمد قادری (بینی پور کالج)، انور آفاقی، رفیع نشتر، وسیم اختر، جاوید اختر، ڈاکٹر سید ظفر آفتاب حسین، سید محمود احمد کریمی، بی پی ایس سی کے رکن امتیاز احمد کریمی، ڈاکٹر ریحان غنی، اشرف النبی قیصر، اردو ایکشن کمیٹی کی ریاستی جنرل سکریٹری، انوارالہدی، انوارالحسن وسطوی، عارف حسن وسطوی، منظر الحق منظر صدیقی، نسیم رفعت کلی، ڈاکٹر عصمت جہاں، ممتاز عالم انصاری، منور عالم راہی اس سمینار میں شریک تھے۔

پریس ریلیز: قومی تنظیم، پٹنہ 6 ستمبر 2022

تلنگانہ

اکیسویں صدی میں اساتذہ کو درپیش چیلنجز

حیدرآباد: استاد کی شخصیت میں جادو ہے، جو آپ کے خوابوں کو پورا کرتا ہے، شکوک وشبہات کو دور کرتا ہے، آپ سے جذبۂ ہمدردی روا رکھتا ہے اور آپ کو بااختیار بناتا ہے۔ اصل بااختیاری زندگی بھر سیکھنے میں ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر آمنہ کشور، سابق ڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات وہندوستانیت نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں 'اکیسویں صدی میں اساتذہ کو درپیش چیلنجز' کے زیرعنوان یوم اساتذہ لیکچر دیتے ہوئے کیا۔ ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کی یاد میں یوم اساتذہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے صدارت کی۔ لیکچر کے بعد مرکز برائے مطالعاتِ اردو ثقافت (سی یو سی ایس) کے زیراہتمام اردو زبان، ادب اور تہذیب کی منفرد خدمات انجام دینے والی شخصیت کو بحیثیت 'ستارۂ اردو' اعزاز پیش کیا گیا۔ لکشمی دیوی راج، ڈاکٹر سید جعفر امیر رضوی، شاہد حسین زبیری، ڈاکٹر اودیش رانی باوا اور محمد مظہر الزماں خان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر یونیورسٹی نے انھیں 'ستارۂ اردو' اعزاز سے نوازا۔ پروفیسر شگفتہ شاہین، صدر نشین تہنیتی کمیٹی تھیں۔ پروفیسر آمنہ کشور نے مزید کہا کہ اساتذہ خود کو درپیش چیلنجز کو مثبت طور پر لیں۔ اگر کسی دن طلبہ کو مطمئن نہ کرسکیں تب طلبہ کے اطمینان کے لیے بہتر طریقوں پر توجہ کریں۔ اپنی خامیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے ہمیشہ بہتری کی راہ پر گامزن رہیں۔ وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ کلاس روم سے بڑا کوئی چیلنج نہیں ہے۔ ہر کلاس کی اپنی خاصیت ہوتی ہے۔ اساتذہ کو خود آگہی کے ذریعے اپنی غلطیوں کو دور کرنا ہوگا۔ کسی بھی شعبہ میں استاد سب سے زیادہ قابل احترام شخص ہوتے ہیں اور ان کی پہچان سب سے اہم ہوتی ہے۔ استاد کو بہتر فیصلے کرتے ہوئے اپنی ذمے داریاں نبھانی چاہئیں۔ انھوں نے مانو کے سبکدوش اساتذہ سے خواہش کی کہ وہ ہمیشہ یونیورسٹی کے ساتھ رابطے میں رہیں۔ بعد ازاں ستارۂ اردو ایوارڈ یافتگان نے مانو انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 ستمبر 2022

پروفیسر فاروق بخشی شخصیت اور ادبی جہات

حیدرآباد: حیدرآباد میں آج بھی اردو تہذیب وثقافت اسی آب وتاب کے ساتھ قائم ہے، جیسی ماضی میں ہوا کرتی تھی۔ فاروق بخشی کا یہ جشن اس بات کا اعتراف ہے کہ یہاں کے اہلِ علم وادب کس قدر وسیع النظر اور فراخ دل ہیں۔ ماضی میں بھی یہاں اردو شعرا وادبا کی کہکشاں پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگاتی تھی اور آج بھی بہت سے اردو کے بڑے نام اس شہرِ فرخندہ آباد کی فضاؤں کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ابن کنول نے اردو ہال واقع حمایت نگر، حیدرآباد میں 'پروفیسر فاروق بخشی شخصیت اور ادبی جہات' کے موضوع پر منعقدہ ایک روزہ کل ہند سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ سمینار محض فاروق بخشی کی خدمات کا اعتراف نہیں ہے بلکہ اردو کے ایک سرگرم مجاہد کی حوصلہ افزائی بھی ہے، جو شب و روز اپنے طلبہ اور اردو کے بارے میں سوچتا اور جیتا ہے۔ سمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر نسیم الدین فریس نے پروفیسر فاروق بخشی کی شخصیت اور مختلف ادبی گوشوں پر مفصل روشنی ڈالی۔ سمینار کے تینوں اجلاس میں کل 16 مقالے پیش کیے گئے۔ ان مقالات میں تفصیل سے فاروق بخشی کی شخصیت کے مختلف جہات پر روشنی ڈالی گئی۔ فاروق بخشی کی تنقیدی، تحقیقی اور شعری خدمات پر یہ تجزیاتی مقالے یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سمینار کی روح رواں، بزرگ ادیب اور کالم نگار ڈاکٹر اودھیش رانی باوا نے کہا کہ حیدرآباد میں فاروق بخشی کی آمد اس تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح تھی جس نے یہاں کی فضاؤں کو مزید معطر کردیا ہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر رحمت یوسف زئی، پروفیسر مجید بیدار، پروفیسر فضل اللہ مکرم، تلنگانہ اردو اکادمی کے چیئرمین اور صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی پروفیسر ایس اے شکور، معروف افسانہ نگار قمر جمالی اور ڈاکٹر رضاء اللہ خاں وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ سمینار انجمن ترقی پسند مصنفین کے ممبر سید عزیز پاشا سابق ممبر پارلیمنٹ کے زیرسرپرستی منعقد ہوا۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر رحمت یوسف زئی، پروفیسر مجید بیدار، محترمہ رفیعہ نوشین، ڈاکٹر اودھیش رانی باوا، ڈاکٹر کہکشاں لطیف، پروفیسر آمنہ تحسین، شبلی آزاد، شہباز ارشد، ڈاکٹر ابوشہیم، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر فہیم اشرف، ڈاکٹر ظفر گلزار وغیرہ شامل تھے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر رحمت یوسف زئی اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر مجید بیدار، پروفیسر علیم اشرف جائسی اور پروفیسر ایس اے شکور نے کی۔ سمینار میں بڑی تعداد میں حیدرآباد کی نامور شخصیات اور طلبہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اکتوبر 2022

داستان کا فن

حیدرآباد: ''داستان اپنے زمانے کی تہذیب اور کلچر کو سمجھنے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے۔ جس کی روشنی میں اس دور کے معاشرے کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلے زمانے میں داستانیں تفریح کا ذریعہ تھیں۔ شام کو چوپال پر بیٹھ کر وقت گزاری کے لیے داستانیں کہی اور سنی جاتی تھیں۔ بعد میں انھیں تحریری شکل دیا گیا جسے دور حاضر میں فلموں کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے۔ داستان کے واقعے عام طور سے بیرون ممالک کے ہوتے تھے مثلاً روم، شام، ایران، عجم، مصر وغیرہ۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ابن کنول نے شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد میں توسیعی خطبہ میں داستان پر گفتگو کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے بتایا کہ مثال کے طور پر اگر ہم حیدرآباد کے لوگوں کو چار مینار میں دیو دیکھنے کا واقعہ بیان کریں تو کوئی یقین نہیں کرے گا اور اگر دور دراز کے شہروں کا واقعہ بیان کریں تو اس سے حیرت واستعجاب پیدا کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مزید داستان کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ داستانوں میں ہمیشہ بادشاہوں، شہزادوں کے قصے ہوتے ہیں جس میں قوت متخیلہ اور ذخیرہ الفاظ کے ذریعے بات سے بات پیدا کی جاتی ہے۔ پانچواں توسیعی لیکچر بعنوان 'داستان کا فن' بمقام کانفرنس ہال، شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد میں عمل میں آیا۔ پروفیسر فضل اللہ مکرم، صدر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے پروفیسر ابن کنول کا تعارف پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 ستمبر 2022

کیرلہ

عربی زبان کے حصول میں درپیش مسائل اور ان کا حل

کیرالہ: ''عربی زبان نہ دنیا کی عظیم ترین تہذیب و ثقافت کی زبان ہے جس میں انسانی علوم و معارف اور اقدار کے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ ان خزانوں سے استفادہ کر کے انسانی دنیا کے سامنے پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے جس میں عربی زبان و ادب کے اساتذہ و طلبہ یکساں طور پر اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار شعبۂ عربی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد قطب الدین نے مدینۃ العلوم عربی کالج پولیکل کالیکٹ، کیرالہ کے زیر اہتمام عربی زبان کے انڈر گریجویٹ طلبہ کے لیے مخصوص ایک روزہ ورکشاپ بعنوان 'عربی زبان کے حصول میں درپیش مسائل اور ان کا حل' میں کیا۔ ورکشاپ کے مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد قطب الدین نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو کر دیگر زبانوں کی طرح عربی بھی سیکھیں اور کسب حلال کی کوشش کے ساتھ ساتھ علم و معرفت کے اس بحرِ ذخار سے قیمتی موتی نکال کر دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اس اہم ورکشاپ کی صدارت ڈاکٹر محمد علی، صدر شعبہ عربی، مدینۃ العلوم عربی کالج پولیکل نے کی، جب کہ مشہور عربی اسکالر اور اکیڈمی فار ایکسیلینس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر صابر نواس نے ورکشاپ کے اغراض و مقاصد پر بھرپور روشنی ڈالی۔ کالج کے استاد ڈاکٹر محمد امان نے مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد قطب الدین کا تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر علی جعفر، صدر عربی آمل کالج، نیل پور اور ڈاکٹر اعجاز، استاد ای ایم ای، اے کالج، کنڈوٹی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس ورکشاپ میں مدینۃ العلوم عربی کالج پولیکل کے علاوہ کیرالہ کے مختلف کالجز کے انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ اسٹوڈنٹس نے کافی تعداد میں حصہ لیا۔ اخیر میں کالج کے ریسرچ اسکالر سعید محمد نے تمام مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 ستمبر 2022

مدھیہ پردیش

داراشکوہ سمینار اور ڈرامہ

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی، محکمہ ثقافت کے زیر اہتمام 'یاد داراشکوہ: سمینار اور ڈرامہ کی پیشکش' کا انعقاد ٹرائبل میوزیم، شیاملہ ہلس، بھوپال میں کیا گیا۔

'فکر تونسوی: حیات وخدمات' کے موضوع پر سمینار

پروگرام کی شروعات میں اردو اکادمی کی ڈائرکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی نے تمام مہمانان کا استقبال کرنے کے بعد پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ داراشکوہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے علمبردار تھے۔ ان کی شخصیت اور ان کا فن ہندوستانی تہذیب کے لیے وقف شدہ تھے۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کے ساتھ ویدوں اور اپنشدوں کا بھی وسیع مطالعہ کیا۔ داراشکوہ کی شخصیت اور فن کو جاننے، سمجھنے کے بعد عوام کو خود فیصلہ کرنے میں مدد ملے گی کہ ان کو اسلام کا کون سا رخ قبول کرنا چاہیے۔ سمینار کی صدارت فرما رہے معروف ادیب اور مفکر ڈاکٹر نریش نے کہا کہ داراشکوہ شدت پسندی کے خلاف سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کا نمائندہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس کی تعلیمات اور فلسفے کو پڑھیں اور اس کے افکار کو سمجھیں۔ لکھنؤ سے تشریف لائے معروف ادیب اور شاعر ڈاکٹر عباس نیر نے کہا کہ ہندوستان وہ ہے جو ستیم شیوم سندرم کا ہندوستان ہے، جو میر و غالب اور مومن کا ہندوستان ہے، جو رویندر ناتھ ٹیگور کا ہندوستان ہے، جو شاعر مشرق علامہ اقبال کا ہندوستان ہے، یعنی ہندو مسلم سکھ عیسائی سب نے مل کر اس کی تاریخ لکھی ہے اور آپس میں شیر و شکر ہو کے زندگی گزارنے کے اسی صوفیانہ سلیقے اور فلسفیانہ شعور کا اصطلاحی نام داراشکوہ ہے۔ ڈاکٹر محمد اعظم نے کہا کہ داراشکوہ اسلام اور صوفی خیالات کو وحدانیت سے جوڑ کر دیکھتا تھا۔ سینئر صحافی علیم بزمی نے کہا کہ داراشکوہ اپنشد اور ہندوستانی فلسفے کا علم رکھتا تھا۔ دارا اس بات کو لے کر حیران ہوتا تھا کہ سبھی مذہبوں کے مفکرین اپنی اپنی تشریحات میں الجھے رہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھ پاتے کہ ان سبھی کا بنیادی عنصر تو ایک ہی ہے۔ اس موقعے پر محمد حسن کا تحریر کردہ ڈرامہ 'داراشکوہ' پردیپ اہروار کی ہدایت کاری میں رنگ محلہ سوسائٹی فار پرفارمنگ آرٹ کے ذریعے پیش کیا گیا جس میں عدنان خان نے داراشکوہ کا کردار نبھایا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض بدر واسطی نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ پروگرام کے آخر میں ممتاز خان نے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی جانب سے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 ستمبر 2022

ہریانہ

فکر تونسوی - حیات اور خدمات

پنچکولہ: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی اور ہریانہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام ہریانہ اردو اکادمی بھون آڈیٹوریم، آئی پی 16 سیکٹر 14 پنچکولہ میں ایک روزہ سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ناشر نقوی نے کی۔ ہریانہ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر چندر تریکھا نے اپنے ابتدائی کلمات میں فکر تونسوی پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ معروف شاعر شین کاف نظام نے بطور مہمان خصوصی فکر تونسوی پر تفصیلی گفتگو کی اور کہا کہ فکر تونسوی نے طنز و مزاح میں مہارت حاصل کی تھی۔ گورویندر سنگھ دھمیجا نائب صدر، ہریانہ پنجابی ساہتیہ اکادمی نے فکر تونسوی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو محبت کی زبان ہے۔ صحافی ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے کہا کہ فکر کی سماجی ادبی سیاسی اور اخلاقی فکر نے انھیں ادب کے افق کا آفتاب بنا دیا۔ آج بھی ان کے کالم ادب کی بیش قیمتی میراث ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر مادھو کوشک نے اپنے صدارتی بیان میں فکر تونسوی کے بارے میں بہت بصیرت افروز خیالات پیش کیے اور ان کی کتابوں اور ان کے مشہور کالم 'پیاز کے چھلکے' کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ دوسرے سیشن میں تین مقالات پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر لبنیٰ حامد نے اپنے مضمون میں انھیں ادب کی اہم شخصیت کی صورت میں پیش کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ناشر نقوی نے مضمون پیش کیا۔ حقانی القاسمی نے 'فکر تونسوی: نئے امکانی زاویے' پیش کیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان آپسی روابط کے لیے ہوتی ہے، تنازعات کے لیے نہیں، انھوں نے کہا کہ پانچوں

مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ہمیں اپنے ادیبوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور ان کی تحریروں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر وریندر چوہان نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنے خیالات پیش کیے۔ تیسرے سیشن کی نظامت ڈاکٹر جتندر پرویز نے کی۔ اس موقعے پر ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے فکر کی زندگی پر شائع ہندی کتاب اور ڈاکٹر مہتاب امروہوی کے تحقیقی مقالے فکر تونسوی ایک مطالعہ کی رونمائی کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 ستمبر 2022

اعزاز و اکرام

شین کاف نظام

جے پور: معروف مصنف و شاعر شین کاف نظام کو رواں برس ریاست راجستھان کی جانب سے دیے جانے

والے سب سے بڑے اعزاز راجستھان رتن سے نوازا جائے گا۔ شین کاف نظام کو سنہ 2010 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ وہ اب تک ایک درجن سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ادارت میں مشہور زمانہ رسالہ 'استفسار' شائع ہوتا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 5 اکتوبر 2022

ڈاکٹر اودھیش رانی

حیدرآباد: اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنے والے بنیادی طور پر لسانیات سے ناواقف ہیں۔ اردو ایک خالص ہند آریائی زبان ہے اور ہندوستانی تاریخ، تہذیب اور ثقافت سے اس کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر اودھیش رانی باوا اپنے اعزاز میں منعقد ایک ایوارڈ تقریب میں کر رہی تھیں۔ یہ ایوارڈ انھیں راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے دیا گیا جو معروف دانشور اور مشہور نقاد پروفیسر قمر رئیس کے نام سے موسوم ہے۔ جلسے کے آغاز میں راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر فاروق بخشی نے بتایا کہ پروفیسر قمر رئیس کے نام سے موسوم راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا یہ ایوارڈ ان ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو پیش کیا جاتا ہے جو ملک میں ادب کے ذریعے روشن خیالی، سائنسی فکر اور یکجہتی کے جذبے کے فروغ کے خواہاں ہیں۔ ایوارڈ تقریب کی صدارت کر رہے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ایس۔ ایم رحمت اللہ نے فرمایا کہ قومی یکجہتی اور اسلامی تعلیمات کا تعلق بہت گہرا ہے۔ اس ایوارڈ کے لیے ڈاکٹر اودھیش رانی باوا کا انتخاب یکجہتی کی فضا ہموار کرنے میں معاون ہوگا۔ ایوارڈ تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر عبدالحق یونیورسٹی کرنول کے وائس چانسلر پروفیسر پی۔ فضل الرحمٰن نے ڈاکٹر اودھیش رانی باوا کو ایوارڈ کے حصول پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ قدیم حیدرآبادی تہذیب کی روشن مثال ہیں۔ وہ ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں جس سے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جیسے عظیم المرتبت دانشور اور رہنما کا تعلق ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 ستمبر 2022

فاطمہ اکیڈمی میں ایوارڈ تقریب

نئی دہلی: پرانی دہلی کی فاطمہ اکیڈمی میں ایک ایوارڈ تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس میں بچوں کے غالب ڈرامہ میں بہترین اداکاری کرنے والے بچوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ سابق کونسلر محمد صادق، سابق پرنسپل محمد یوسف وغیرہ نے بچوں کو انعامات دیے۔ ساتھ ہی نقد انعام بھی دیا گیا۔ اس دوران صحافی محمد رامش، اعجاز نور سمیت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 ستمبر 2022

رسم اجرا

'اسلامک اسٹڈیز: تصور، صورت حال اور مستقبل

حیدرآباد: ''اسلامک اسٹڈیز کا مضمون اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے۔ اس میں موجودہ نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی تناظر میں معاشیات، سماجیات، سیاسیات، نسائیت وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے علاوہ فنون لطیفہ، خطاطی، ادب و عرفان، موسیقی اور تہذیب و ثقافت وغیرہ مختلف علوم و فنون کی تعلیم و تدریس کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ یہ مضمون سماجی علوم سے متعلق مسائل پر ایک پل کی حیثیت کا حامل ہے۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عین الحسن، شیخ الجامعہ نے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں کتاب 'اسلامک اسٹڈیز: تصور، صورت حال اور مستقبل' کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے کیا۔ شعبہ کی تیز رفتار ترقی اور فعالیت پر مبارکباد دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''یہ شعبۂ یونیورسٹی کے ان شعبوں میں سے ہے، جنھوں نے بہت کم وقت میں اپنے علمی معیار اور ترقی کی بنیاد پر ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے، چنانچہ اس شعبہ کی کتابیں اور مقالات و مضامین اکثر منظر عام پر اور خود ان کی نظروں میں آتے رہتے ہیں۔'' ڈاکٹر ثمینہ تابش، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی نے کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ کتاب سمینار بعنوان 'اسلامک اسٹڈیز: تصور، صورت حال اور مستقبل' کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ علمی و انتظامی نوعیت کے اس کامیاب سمینار میں ملک کے اسلامک اسٹڈیز سے وابستہ سینئر پروفیسرس، اساتذہ و اسکالرس نے انتہائی معیاری مقالات پیش کیے تھے اور انھی مقالات کا مجموعہ ہمارے سامنے ہے، جس کے لیے شعبہ اسلامک اسٹڈیز مبارکباد کا مستحق ہے۔'' پروفیسر دانش معین، صدر شعبہ تاریخ نے کہا کہ ''کسی بھی سمینار کی کامیابی کا راز اس میں پیش کیے گئے مقالات کی اشاعت میں ہوتا ہے۔ اس کے مقالات اس نوعیت کے حامل ہیں کہ یہ مجموعہ اسکول برائے فنون و سماجی علوم کے ہر شعبہ میں ہونا چاہیے۔'' پروفیسر محمد فہیم اختر، صدر شعبہ نے مہمانوں کا استقبال کیا اور کتاب کے مشمولات کا تعارف کرایا۔ محترمہ ذیشان سارہ، اسسٹنٹ پروفیسر نے نظامت اور شکریہ کے فرائض انجام دیے۔ پروگرام میں مختلف شعبوں کے صدور، اساتذہ اور اسکالرز و طلبہ و طالبات شریک تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 ستمبر 2022

قومی ستارے

گلبرگہ: ڈاکٹر غضنفر اقبال ادب اطفال کی تخلیق کے کٹھن راستوں سے کامیاب گزرے ہیں۔ اس خیال کا اظہار مایہ ناز ادیب و محقق ڈاکٹر انیس صدیقی (معتمد انجمن) نے کیا۔ وہ انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ کے زیر اہتمام جواں سال ادیب ڈاکٹر غضنفر اقبال کی تازہ ترین کتاب 'قومی ستارے' (بڑوں کی کہانیاں بچوں کے لیے) کی تقریب رسم اجرا سے مخاطب تھے۔ انھوں نے کہا کہ غضنفر اقبال نے ممدوح شخصیتوں کی کتاب حیات کے ایسے منتخب واقعات سے اپنے مضامین کو سجایا ہے جو بچوں کے دلوں میں محبت و احترام کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر انیس صدیقی نے مزید کہا کہ کتاب قومی ستارے ادب اطفال میں گراں قدر اضافہ ہے، جو طلبہ کے لیے بے حد مفید و کارآمد ہے۔ جناب میر شاہ نواز علی خان شاہین (نائب صدر انجمن)

نے کہا کہ ڈاکٹر غضنفر اقبال نے اپنی تحریر بچوں کے لیے آسان اور سلیس کردی ہے۔ انھوں نے کتاب قومی ستارے کو عالمی زبان انگریزی اور علاقائی زبان کنڑا میں ترجمہ کرنے پر زور دیا۔

جناب منظور وقار نے کہا کہ کتاب قومی ستارے سرکاری اسکولوں کے نصاب میں شامل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ کتاب معنوی اعتبار سے غیر معمولی ہے، جس کو ہر عمر کے لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ جناب محمد حسن محمود نے کہا کہ کتاب قومی ستارے میں غضنفر اقبال نے جن ستاروں کی بزم سجائی ہے، اس میں شامل ہر ایک ستارہ اپنے آپ میں ایک کہکشاں کی مانند ہے۔ جناب محمد جاوید اقبال صدیقی نے کہا کہ کتاب قومی ستارے ایک نہایت خوبصورت متنوع اور خوشبودار گلستان ہے اور اس کتاب کی تخلیق میں غضنفر اقبال نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ اس پر وقار تقریب میں معروف شاعر وصحافی حامد اکمل کا پیام جناب صادق کرمانی نے پڑھ کر سنایا۔ صاحب کتاب ڈاکٹر غضنفر اقبال نے اپنی جوابی تقریر میں انجمن کے ارباب مجاز کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کتاب میں ایسے قومی ستارے ہیں، جنھوں نے اچھے معاشرے کی تشکیل کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔

صدر اجلاس وصدر نشین انجمن ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین نے ایک اہم کتاب کی تخلیق پر ڈاکٹر غضنفر اقبال کو مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ کتاب نہایت معیاری اور سلیس ہونے کے باعث متوجہ کرتی ہے۔ اجلاس کی ابتدا میں جناب خواجہ پاشاہ انعام دار (نائب صدر انجمن) نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ کتاب قومی ستارے ادب اطفال میں اہم مقام حاصل کرے گی، جس کو مصنف نے محنت سے لکھا ہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد افتخار الدین اختر نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔ محترمہ شاہدہ بیگم کے شکریے پر یہ پروقار تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ، 18 ستمبر 2022

اردو شاعری میں پروشوتم رام

نئی دهلی: 'اردو شاعری میں پروشوتم رام' کے عنوان سے ڈاکٹر قرۃ العین کی مرتبہ کتاب کی رسم رونمائی تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر میں حاجی تاج محمد، ہمالیہ ڈرگس کمپنی کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق، پروفیسر مہتاب عالم رضوی جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر مشاہد عالم رضوی اور عبدالماجد نظامی گروپ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر پروفیسر مہتاب عالم رضوی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پروشوتم رام نے اعلیٰ اخلاق وکردار کا ایک عملی نمونہ پیش کیا ہے جو ہم سب کے لیے مشعل راہ ہے۔ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین حاجی تاج محمد نے پروشوتم رام کے حوالے سے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا اور اور کہا کہ پروشوتم رام کی حیات وخدمات کو عوامی سطح پر پہنچانے کی کوشش کی جائے گی تاکہ قومی یکجہتی کا پیغام پوری دنیا میں عام ہو۔ پروفیسر مشاہد عالم رضوی نے کہا کہ ہم سب کو بین المذاہب اتحاد واتفاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہندوستان کے وقار اور عظمت کو مزید بڑھایا جاسکے۔ عبدالماجد نظامی نے کتاب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ پروشوتم رام ہندوستانی تہذیب و ثقافت میں ایک عقیدت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید فاروق نے صدارتی کلمات میں رام کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے انھیں ہندوستانی تہذیب کی علامت کے طور پر پیش کیا۔ کتاب پر عبدالباری، ڈاکٹر سلمان فیصل اور ڈاکٹر نوشاد منظر نے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر سلمان فیصل نے کہا کہ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر اکبرآبادی کے عہد سے شری رام چندر جی پر نظمیں کہی جارہی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور خاص بات یہ ہے کہ نظیر سے حبیب تک کوئی دور ایسا نہیں رہا جس میں اس موضوع کو اردو شاعری میں نہ برتا گیا ہو۔ ڈاکٹر نوشاد منظر نے کہا کہ انسانی زندگی کسی بن باس سے کم نہیں ہے۔ یہ بن باس دراصل تزکیۂ نفس اور تطہیر قلب کا نام ہے جو انسان کو خداشناسی کا درس دیتا ہے۔ نظامت ڈاکٹر خان محمد رضوان نے کی۔ اخیر میں ڈاکٹر قرۃ العین نے تمام مہمانوں وحاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 ستمبر 2022

نقوش کہکشاں

نئی دهلی: عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن اور یونائیٹڈ اور یسی فرنٹ دہلی کے زیر اہتمام پرم ویر چکرو جیتا 'ویر عبدالحمید' کی یاد میں پروگرام کا انعقاد دو جے محلّہ موج پور میں کیا گیا، جس کی صدارت معروف ڈاکٹر حکیم سید احمد خاں نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر دہلی عرس کمیٹی کے چیئرمین ایف آئی اسماعیلی، سابق کونسلر ریشمہ ندیم، مہمان ذی وقار کی حیثیت سے تحسین علی اساروی، ڈاکٹر ارشد غیاث اور صحافی وشاعر حبیب سیفی نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے انجام دیے۔ پروگرام میں ڈاکٹر بدرالاسلام نے یوگا کے فوائد بھی بتائے، ساتھ ہی 'نقوش کہکشاں' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ویر عبدالحمید کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ندیم احمد نے کہا کہ زندگی میں کامیاب ہونا ہے تو ہمیں تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو جسمانی، ذہنی اور اقتصادی طور پر مضبوط بنانا ہوگا۔ رئیس ادریسی نے کہا کہ ہمیں اپنے اسلاف سے سیکھنے کی ضرورت ہے کہ انھوں نے ایسے وقت میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ جب ٹیکنالوجی اتنی ایڈوانس نہیں تھی۔ ڈاکٹر سید احمد خاں اور حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے مشترکہ طور پر کہا کہ آج ملک بھر میں آزادی کا امرت مہوتسو تزک واحتشام سے منایا جارہا ہے اسی کے پیش نظر عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن اور یونائیٹڈ ادریسی فرنٹ دہلی نے مجاہدین آزادی اور ملک کی خاطر اپنے جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے ویروں کی یاد میں یہ پروگرام منعقد کیا ہے جس میں سماجی خدمت میں پیش پیش رہنے والے افراد اور اپنے قلم اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے بیداری پیدا کرنے والے صحافیوں کو اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 ستمبر 2022

مقالات ابن احمد نقوی

نئی دهلی: جامعہ سلفیہ بنارس کے مجلّہ 'محدث' کے سابق ایڈیٹر مولانا ابوالقاسم فاروقی نے کہا کہ عبدالقدوس ابن احمد اطہر نقوی نے اپنے والد اور مجلّہ اہلحدیث کے ایڈیٹر مولانا سید تقریض احمد سہسوانی کی علمی وراثت کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ بات انھوں نے 15 روزہ 'جریدہ ترجمان' کے ایڈیٹر اور ماہنامہ 'التوعیۃ' کے سابق اداریہ نگار اور متعدد کتب کے مصنف عبدالقدوس ابن احمد اطہر نقوی کے مضامین کے انتخاب 'مقالات ابن احمد نقوی' کی رسم اجرا تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ سہسوان متعدد علمی شخصیات کا گہوارہ رہا ہے اور خود ابن احمد نقوی کے خانوادے میں بھی کئی بزرگ شخصیات گزری ہیں۔ انھوں نے ان سب سے کسب فیض کیا اور پہلے مجلّہ اہلحدیث اور پھر التوعیہ میں اپنے مضامین کے ذریعے ملک وملت کو ایک سنجیدہ راہ دکھانے کی کوشش کی۔ مہمان خصوصی مولانا رفیق احمد سلفی نے نقوی صاحب کے ساتھ گزارے اپنے ایام کے حوالے سے کہا کہ انھوں نے اپنے ہر مضمون میں مسلمانوں کو جذباتیت کو ترک کرنے کی تلقین کی ہے۔ مہمان اعزازی شیخ صلاح الدین مقبول احمد نے کہا کہ نقوی صاحب کے مضامین میں ملکی وغیر ملکی حالات کا جس طرح تجزیہ کیا جاتا ہے اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ ان کی نظر عالمی ادب پر بھی ہے اور عالمی تحریکوں پر بھی، جس کی وجہ سے ان کے مضامین میں ہمہ گیری کا رنگ نظر

آتا ہے۔ صاحب کتاب عبدالقدوس ابن احمد اطہر نقوی نے اپنے مضامین کے انتخاب اور اس کی اشاعت پر کتاب کے مرتب سینئر صحافی سہیل انجم اور پبلشر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان لوگوں کی وجہ سے انھیں اپنی زندگی کی آخری منزل پر وہ مسرت نصیب ہوئی ہے جس کی انھوں نے توقع بھی نہیں کی تھی۔ انھوں نے اپنی علمی خدمات پر اختصار کے ساتھ روشنی بھی ڈالی ہے۔ سہیل انجم نے کہا کہ نقوی صاحب کے مضامین کا انتخاب ان کی دیرینہ خواہش رہی ہے۔ چونکہ وہ ان کے والد کے دوستوں میں رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس کام کو سعادت سمجھ کر کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ نقوی صاحب اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر عبور رکھتے ہیں اور اردو، فاسی اور انگریزی میں شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کے مزید علمی کاموں کو دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ مکتبہ فہیم کے پروپرائٹر ابواشعر فہیم نے نقوی صاحب کے مضامین پر اظہار خیال کے ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ ان کے لیے خوشی کی بات ہے کہ انھیں اس کتاب کو شائع کرنے کا موقع ملا۔ تقریب میں جن شخصیات نے شرکت کی ان میں عبدالستار شمیم، مفتی جمیل احمد، مولانا عزیز احمد خاں، شیخ عبدالاحد مدنی، مولانا تجمل حسین ندوی ڈاکٹر سلمان فیصل، ڈاکٹر جابر زماں، مولانا عبدالقدیر، مولانا عبدالقیوم، مولانا جمال الدین اور عبداللہ سنابلی قابل ذکر ہیں۔ روزنامہ 'صحافت' 12 ستمبر 2022

پیروی کی خوشی

کالی کٹ: معروف عالم دین اور جامعہ مرکز الثقافۃ السنیہ کیرالہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالحکیم ازہری کی مشہور کتاب 'پیروی کی خوشی' کا اجرا کالی کٹ مرکز نالج سٹی میں منعقدہ تقریب کے موقعے پر عمل میں آیا۔ رونمائی کا فریضہ شیخ ابوبکر سید طہ ثقافی اور ڈاکٹر قاسم نے انجام دیا۔ اس کتاب میں محسن انسانیت کی سیرت طیبہ کے نقوش اور آپ کے فضائل وکمال کو نہایت ہی سلیس اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ناشر ملیبار فاؤنڈیشن فار ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ مرکز نالج سٹی ہے۔ ذرائع کے مطابق سیرت طیبہ پر مشتمل یہ کتاب گزشتہ ماہ ملیالم سے کنڑ زبان میں بھی شائع ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف زبان جیسے عربی، اردو، ہندی، ترکی، تمل، بنگالی اور ہسپانوی میں ترجمہ وتخریج واشاعت کا کام جاری ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 ستمبر 2022

نوازش

دیوبند: دیوبند کے معروف عصری تعلیم کے ادارہ نواز گرلز پبلک اسکول کی طالبات کی جانب سے تصویروں کے مجموعہ 'نوازش' میگزین کا اجرا وزیر مملکت کنور برجیش سنگھ کے بدست عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی اور وزیر مملکت نے طالبات کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ڈرائنگ اور ڈیزائن اپنے فن اور صلاحیتوں کے اظہار کا سب سے آسان طریقہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈیزائن اور پینٹنگ صدیوں سے کشش کا مرکز رہا ہے۔ واضح ہو کہ نواز گرلز پبلک اسکول کی طالبات نے معاشرے کے بے حد اہم موضوعات اور قابل غور وفکر مسائل کو خوبصورت رنگوں کے ذریعہ سے میگزین کی شکل میں پیش کرکے سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر نواز دیوبندی نے طالبات کی تعلیم کا قابل ذکر کارنامہ انجام دیا ہے۔ ادارہ کے بانی اور مینیجر نیز عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تصویریں ہمیشہ بولنے، چیخنے، چلانے، رونے، مسکرانے اور سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ طالبات نے واٹر کلر، اسکیچ، کیلی گرافی کے ساتھ ساتھ آرٹ کی تمام خصوصیات کو خوبصورتی کے ساتھ یکجا کرکے اور تصویروں میں بھر کر نہایت پرکشش مظاہرہ کیا ہے۔ بعدازاں دیوبند کے مشہور معالج ڈاکٹر ڈی کے جین نے تمام طالبات خاص طور سے اس میگزین کی مشترکہ ایڈیٹر فرحہ صدیقی اور شہلا مظہر کو مبارکباد دی۔ پروگرام کے مہمان ذی وقار ڈاکٹر سہیل نے بھی اس موقعے پر طالبات کی جانب سے خوبصورت رنگوں اور پینٹنگ والی میگزین پیش کرنے پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اس ملک کے تاریخ داں ادیب، شاعر اور آرٹ ہماری بہترین وراثت ہیں۔ اس موقعے پر سید وجاہت شاہ نے کہا کہ دوران طالب علمی میں ہی اگر اس فن کو اجاگر کیا جائے تو مستقبل میں ہمارے ملک کو اعلیٰ فنکار اور عالمی سطح کی پینٹنگ بنانے والے مل سکیں گے۔ پروگرام کے اختتام پر ادارہ کے ایڈمنسٹریٹر عبداللہ نواز خاں نے مہمان خصوصی اور تمام موجود افراد کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 18 ستمبر 2022

انس کے دوہے

نئی دھلی: صنفِ دوہا کی بقا کے لیے عمل میں آئی تنظیم 'دوہا موومنٹ' نے اپنی تحریک کا ایک سال کامیابی کے ساتھ مکمل کیا۔ اس مبارک موقعے پر 'تسمیہ آل انڈیا ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی' کے زیر اہتمام پرتکلف جشن کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت ہمالیہ ڈرگس کے مینیجنگ ڈائرکٹر اور تسمیہ سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ مہمانانِ خصوصی کے طور آدھونک اوٹومشن کے مینیجنگ ڈائرکٹر ششی کانت کوشک اور اردو کے نامور ادیب فاروق ارگلی نے شرکت کی، جب کہ مہمانانِ ذی وقار کی حیثیت سے کانپور سے آئے شاعر ذیشان نیازی، اردو اکادمی، دہلی سے ہارون حسینی اور عزیر حسن قدوسی نے شرکت کی۔ نظامت شاعر معین شاداب نے کی۔ اس موقعے پر تحریک کے روحِ رواں انس خان کے پہلے مجموعۂ کلام 'انس کے دوہے' کی رسمِ اجرا عمل میں آئی۔ جشن کا آغاز شاہد انور نے بحیثیت سکریٹری، دوہا موومنٹ کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کیا۔ بعد ازاں فاروق ارگلی، عفیف سراج، سید راغب اختر اور روپم چوپڑا عرف آرسی نے اپنے اپنے مقالوں میں انس کے دوہے کے لیے فنی نکات، انداز بیان ودیگر خصوصیات پر اظہارِ خیال کیا، جب کہ نوجوان گلوکار امرتانشو شرما نے انس خان کے دوہے اپنے مخصوص انداز میں گاکر محفل پر موسیقی کا نشہ طاری کردیا۔ تیسرے اور آخری دور میں محفلِ شعر وسخن آراستہ کی گئی، جس میں عرفان اعظمی، شاہد انور، ڈاکٹر خالد مبشر، ذیشان نیازی، قمر انجم کرشن، سلمیٰ شاہین، عمران قمر، خالد اخلاق، خواجہ طارق عثمانی، آدرش باجپئی، طارق عثمانی اور عمران راہی وغیرہ نے اپنے پسندیدہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ محفل کا اختتام ڈاکٹر سید فاروق کے اظہار خیال واظہارِ تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 ستمبر 2022

نول کشور سے نارنگ تک

نئی دھلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں خسرو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام فاروق ارگلی کی تحریر کردہ کتاب 'نول کشور سے نارنگ تک' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقعے پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی، پروفیسر نجے دویدی، پروفیسر اختر الواسع، اجے چودھری آئی پی ایس، شمیم طارق، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر اقتدار محمد خاں، عبدالصمد دہلوی سمیت بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرس اور طلبہ موجود تھے۔ کتاب کے بارے میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ فاروق ارگلی کی نئی علمی فتوحات میں منشی نول کشور سے نارنگ تک کا اضافہ ہوا ہے، یہ کتاب قدر شناسی ہی نہیں بلکہ اردو والوں کی طرف سے احسان شناسی بھی ہے۔ ایسے وقت میں جب لوگ زبانوں کو مذہبوں کے خانوں میں بانٹ رہے ہیں، فاروق ارگلی نے یہ تذکرہ ترتیب دے کر ایک بار پھر یہ ثابت کیا ہے کہ اردو ہماری مشترکہ تہذیب کی جاندار اور

شاندار نمائندہ ہے۔علاوہ ازیں ممتاز ادیب شمیم طارق اور عبدالصمد دہلوی نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 18 ستمبر 2022

کچھ خواب بوتو گیا

نئی دهلی: شاعری جوڑنے اور محبت عام کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے، آج اس فن سے وابستہ لوگوں کی قدر کرنے کی ضرورت ہے، فنکار کی حوصلہ افزائی ہی فن کی بقا کا ذریعہ ہے۔ان خیالات کا اظہار معروف شاعر ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی نے ڈاکٹر وریندر کمار شیکھر کے مجموعہ کلام ’کچھ خواب تو بوگیا‘ کی تقریب رسم اجرا میں بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ آئیڈیا کمیونی کیشنز اور شکھر این جی او کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں منعقد تقریب رسم اجرا میں انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج کی یہ تقریب فن کی بقا کی ضمانت ہے۔ یہاں شعرا کی حوصلہ افزائی بھی ہورہی ہے اور قرأت وسماعت کا موقع بھی فراہم کیا جارہا ہے۔صدر محفل پرتاپ سومونشی (ایگزیکیٹو ایڈیٹر، ہندوستان) نے کہا کہ شاعری ایک محبت کا جہان تخلیق کرسکتی ہے، اس کی خمیر میں یکجہتی اور انسان دوستی ہے۔ آئیڈیا کمیونیکیشنز کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے تعارفی خطبے میں کہا کہ شاعری تخلیقیت کی عطر اور تمدن کی معراج ہے، یہ کئی صدیوں کا سفر کرنے کے بعد آج اس مقام پر پہنچی ہے کہ وہ سماجی مسائل کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ فرد کے جذبات کے اظہار کا موثر ترین ذریعہ بن سکے، وریندر کمار شیکھر کی شاعری میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو بہترین شاعری کے لیے ضروری ہیں۔مہمان اعزازی آلوک یادو (شاعر اور پی ایف کمشنر) نے کہا کہ یہ خوبصورت محفل دنیا کو ہندوستانی شعری وتہذیبی روایت کا ایک خوبصورت پیغام ہے اور ڈاکٹر وریندر کمار شیکھر اس سلسلے کی خوبصورت کڑی ہیں۔ مہمان ذی وقار عبید طاہر (سینئر پروڈیوسر قطر ریڈیو) نے کہا کہ ڈاکٹر وریندر کمار شیکھر کی شاعری واقعی بلندی یعنی شکھر کی شاعری ہے، ان کا مجموعہ شعری روایت میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ صاحب مجموعہ ڈاکٹر وریندر کمار شیکھر نے اپنے خطاب میں کہا کہ خواب بونا اور خواب دیکھنا حوصلے کا کام ہے، آج کی بھاگ دوڑ بھری زندگی میں انسان کو خواب دیکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ خواب کی تکمیل کے ساتھ ساتھ نئے خواب بنتے رہنا ہی زندگی ہے۔معروف شاعر معین شاداب نے شعری مجموعہ ’کچھ خواب بوتو گیا‘ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ نریندر کمار شیکھر کی شاعری ایئر کنڈیشنڈ کیمروں میں بیٹھ کر نہیں بلکہ سڑک پر اتر کر لکھی جانے والی شاعری ہے، ان کی شاعری میں عام مزدور طبقے کے مسائل کا بیان ہے، ان کی شاعری نوجوانوں کو راہ دکھاتی ہے۔ آئیڈیا کمیونکیشنز کے ڈائرکٹر آصف اعظمی اور شکھر کے سربراہ ندیم اختر نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ نظامت کے فرائض پرکھر مالویہ کانہا نے انجام دیے جب کہ شکریہ کے کلمات صہیب فاروقی (شاعر، انسپکٹر، دہلی پولیس) نے ادا کیے۔

روزنامہ ’صحافت‘ دہلی، 22 ستمبر 2022

تمثیلِ نو

دربھنگہ: اردو جریدہ ’تمثیلِ نو‘ دربھنگہ کے تازہ شمارہ جنوری 2021 تا جون 2022 کی رونمائی 9 ستمبر کو پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی میں عمل میں آئی۔ اس موقع پر پروفیسر

آفتاب اشرف (صدر، شعبۂ ہذا)، ڈاکٹر سرور کریم (ایسوی ایٹ پروفیسر، شعبۂ ہذا)، ڈاکٹر مطیع الرحمٰن (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ ہذا) اور ڈاکٹر وصی احمد شمشاد (استاد، شعبۂ ہذا) اور رسالہ کے مدیر اعزازی ڈاکٹر امام اعظم موجود تھے۔ مدیر موصوف نے رسالہ کے متعلق بتایا کہ ’’یہ گزشتہ 22 برسوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔اس کے موضوعاتی شمارے اردو کے ادبی حلقوں میں کافی پسند کیے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ رسالہ عوام الناس میں اپنے متنوع مواد کی وجہ سے بھی کافی مقبول ہے۔‘‘ پروفیسر محمد آفتاب اشرف نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ’’میں اس رسالہ کا نہ صرف پرانا قاری ہوں بلکہ میری تحریریں بھی اس میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ کے موضوعات تنوع کے حامل ہیں۔اس شعبہ کے ریسرچ اسکالرز کی فہرست ’تمثیلِ نو‘ کے زیرِ نظر شمارہ میں شامل ہے جو مستقبل کے ریسرچ اسکالرز کے لیے سودمند ثابت ہوگی۔‘‘ ڈاکٹر سرور کریم نے کہا کہ ’تمثیلِ نو‘ کا سرسری جائزہ لینے کے بعد ہی اس کی انفرادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مارچ 2001 سے یہ رسالہ دربھنگہ سے شائع ہورہا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی محنت اس رسالے کی طباعت میں دیکھنے کے قابل ہے کیونکہ زیرِ نظر شمارہ 496 صفحات پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں دو کتابوں ’جہانِ ادب کے سیاح: ڈاکٹر امام اعظم‘ (مصنف: پروفیسر خالد حسین خاں) اور ’نوائے آرزو‘ (سہروں اور تہنیتی نظموں کا مجموعہ، مرتب: شاہد اقبال) کے علاوہ ’تمثیلِ نو‘ کے گزشتہ شماروں پر خصوصی پیشکش بھی شامل ہے۔‘‘ ڈاکٹر مطیع الرحمٰن نے کہا کہ ’تمثیلِ نو‘ کا یہ شمارہ اپنی پیشکشوں اور تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے مضامین کے سبب مقبولیت کا درجہ حاصل کرے گا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے 32 خطوط بنام مظہر امام اس شمارہ کی زینت ہیں جو ایک اہم ادبی ورثہ کو محفوظ کرنے کے مترادف ہے۔اسی طرح ڈاکٹر امام اعظم کا تحریر کردہ بھوپال کا سفرنامہ نیز پروفیسر ثوبان فاروقی اور پروفیسر معراج الحق برق کے درمیان منظوم مکتوب نویسی کی مثالیں بھی اپنی نوعیت کی چیز ہیں۔‘‘ ڈاکٹر وصی احمد شمشاد نے ’تمثیلِ نو‘ کے متعلق کہا کہ ’’مجھے ڈاکٹر امام اعظم صاحب کا اداریہ بطورِ خاص پسند ہے۔شمارہ کی اشاعت پر ڈاکٹر امام اعظم کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد۔‘‘ انجینئر فضا امام نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: اعظم، کولکاتا، مغربی بنگال، 9 ستمبر 2022

وفیات

احمد سعید ملیح آبادی

لکھنؤ: معروف عالم دین مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے فرزند، سابق رکن راجیہ سبھا اور غالب ایوارڈ یافتہ احمد سعید ملیح آبادی (92) نے طویل علالت کے بعد سنجے گاندھی پی جی آئی میں 2 اکتوبر کو داعی اجل کو لبیک کہا اور مالک حقیقی سے جاملے۔ وہ

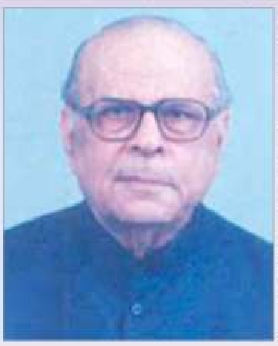

کافی مدت سے بلڈ کینسر کے مہلک مرض میں مبتلا تھے۔ تجہیز وتکفین 3 اکتوبر ان کے آبائی قصبہ ملیح آباد میں ہوئی۔ روزنامہ ’آزاد ہند‘ کے ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی کا شمار جدید اردو صحافت کے معماروں میں ہوتا ہے۔ اپنے سنجیدہ اور فکر انگیز اداریوں کے سبب انھیں بہت احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ بیک وقت مدیر، دانشور اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ تقریباً 36 سال تک روزنامہ ’آزاد ہند‘ ان کی ادارت اور ملکیت میں شائع ہوا۔ ان کے اداریوں نے کم ازکم دو نسلوں کو متاثر کیا۔احمد سعید ملیح آبادی، لکھنؤ کے قریب ملیح آباد کے ایک پٹھان خاندان میں 1926 میں پیدا ہوئے۔ صحافت انھیں ورثے میں ملی تھی۔

ان کے والد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو مولانا ابوالکلام سے گہری نسبت تھی اور انھوں نے ان کے دست راست کے طور پر کام کیا۔ احمد سعید ملیح آبادی نے صحافت کو اپنے والد کی جملہ خصوصیات کے ساتھ نہ صرف اپنایا بلکہ گوناگوں صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے سیاسی، سماجی اور صحافتی حلقوں میں اعتبار بھی حاصل کیا، ان کا اخبار 'آزاد ہند' اور اس کا ہفت روزہ ایڈیشن 'اجالا' شمال مشرقی ہندوستان میں عرصہ تک اہم روزنامہ شمار ہوتا رہا ہے۔ اس اخبار نے تقسیم ملک کے ناساز گار حالات کے باوجود کلکتہ میں اردو کی شمع کو روشن رکھا، شروع سے زبان و بیان پر گہری توجہ دی اور ترقی پسندانہ سیکولر پالیسی کو اپنائے رکھا۔ حالانکہ یہ اخبار اس شہر سے نکلتا تھا جہاں کی اکثریت کی زبان اردو نہیں بنگالی ہے اور لسانی وعلاقائی تعصب بھی کافی حاوی ہے، لیکن احمد سعید ملیح آبادی کی ادارت میں 'آزاد ہند' نے اپنے گیٹ اپ کو ہی دلکش نہیں بنایا بلکہ ایک الگ ریڈر شپ پیدا کی۔ ان کی کتابوں میں اللہ کے گھر میں، عظیم صحافی عظیم رہنما: مولانا ابوالکلام آزاد، میری صحافتی زندگی (خودنوشت) قابل ذکر ہیں۔ ان کی حیات اور کارناموں سے متعلق ماہنامہ 'انشا' نے 1987 میں ایک خصوصی شمارہ شائع کیا تھا۔ احمد سعید ملیح آبادی نے اردو صحافت کے بے لوث خدمت گار کی حیثیت سے قومی اتحاد، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سماجی بہبود کے لیے بھی انتھک کام کیا جس کے اعتراف میں انھیں درجنوں سرکاری، نیم سرکاری اور صحافتی تنظیموں کا عہدیدار اور رکن بنایا گیا، ان میں آل انڈیا ایڈیٹرس کانفرنس کی نائب صدارت، نیشنل کونسل برائے فروغ انسانی وسائل، مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سینٹ اور کورٹ کی رکنیت شامل ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اکتوبر 2022

رضوان اللہ فاروقی

نئی دهلی: بزرگ صحافی، شاعر، مترجم اور متعدد کتابوں کے مصنف رضوان اللہ فاروقی کا 8 اکتوبر بروز ہفتہ نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔

ان کی عمر 91 سال تھی۔ پسماندگان میں چار بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ کچھ دنوں سے علیل رہ رہے تھے۔ انھوں نے ہفتہ کی صبح تقریباً نو بجے آخری سانس لی۔ سینئر صحافی سہیل انجم کے مطابق رضوان اللہ فاروقی کے نواسے محمد طارق نے بتایا کہ گزشتہ چند دنوں سے ان کو سانس لینے میں دشواری تھی۔ کمزوری بھی بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ ان کی تدفین ہفتہ کی سہ پہر تین بجے شاہین باغ قبرستان میں ہوئی، جس میں موسم کی خرابی اور مسلسل بارش کے باوجود علاقے کے اہل علم نے شرکت کی۔ رضوان اللہ نے اپنی صحافت کا آغاز آزادی سے قبل کلکتہ کے روزنامہ 'عصر جدید' سے کیا تھا۔ بعد میں وہ اخبار کے نیوز ایڈیٹر ہوئے۔ انھوں نے احمد سعید ملیح آبادی کے اخبار روزنامہ 'آزاد ہند' میں بھی ایک عرصے تک کام کیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے کلکتہ میں واقع امریکی سفارت خانہ کے دفتر یو ایس آئی ایس میں جز وقتی کام شروع کر دیا تھا۔ 1975 میں دہلی میں واقع امریکی سفارت خانہ میں اردو ایڈیٹر کے طور پر ان کا تقرر ہوا، جہاں انھوں نے 1992 تک اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ سبکدوش ہونے سے کچھ پہلے وہ ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر میں منتقل ہوگئے۔ رضوان اللہ فاروقی نے اپنی پوری زندگی اردو صحافت کی خدمت میں گزاری۔ اس عمر میں بھی ان کی تصنیفی سرگرمیاں جاری تھیں۔ کلکتہ کی صحافت پر ان کی کتاب 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' کو خاصی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ 2020 میں ان کی کتاب 'تبصرات کتب' منظر عام پر آئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر کتب میں بے ادبیات، اوراق مصور، متاع سحر، ہمارے گاؤں ہمارے لوگ اور عکس خیال قابل ذکر ہیں، جب کہ انگریزی میں 6 کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ اردو، انگریزی اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ انھوں نے امریکی سفارت خانہ سے شائع ہونے والے رسالے 'اسپین' کے لیے طویل عرصے تک مضامین کے ترجمے کیے اور انگریزی ہفت روزہ 'ملی گزٹ' میں کالم لکھے۔ ان کے سب سے چھوٹے بھائی پروفیسر فیضان اللہ فاروقی کا 2020 میں کورونا وبا میں انتقال ہوا۔ وہ جے این یو سے عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ڈاکٹر زہرا فاروقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی میں استاد ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اکتوبر 2022

رباب رشیدی

لکھنؤ: اردو ادب اور لکھنوی تہذیب کی نمائندہ شخصیت رباب رشیدی کا 6 اکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 84 سال کے تھے۔ ان کی تدفین عیش باغ قبرستان لکھنؤ میں ہوئی۔

رباب رشیدی کا اصل نام سلمان احمد تھا۔ وہ 10 جنوری 1940 کو قصبہ پوایاں ضلع شاہجہانپور میں پیدا ہوئے۔

ان کے والد حکیم غلام جیلانی نامور شاعر تھے جن کا تخلص اسیر تھا۔ رباب رشیدی، رشید احمد خاں رشید رامپوری کے شاگرد تھے، اسی لیے اپنے نام کے ساتھ رشیدی کا لاحقہ لگاتے تھے۔ ان کا شمار نعت، غزل اور رباعی کے قادرالکلام استاد شاعروں میں ہوتا ہے۔ ابر سفید (1985)، الف میم (2001)، آنسو بولتے (2001) ہیں، ان کے کلام کے مجموعے منظر عام پر آکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ سال 2020 میں ان کی غزلیات اور رباعیات کے الگ الگ دو ضخیم مجموعے مزید زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل ذوق کے لیے بصیرت افروزی کا سبب بنے۔ ان کی حیات و خدمات پر مشتمل ایک کتاب 'رباب رشیدی: ایک سخنور پیارا سا' کے نام سے ڈاکٹر تابش مہدی نے مرتب کی ہے جس میں اہم علمی ادبی شخصیات کے مضامین شامل ہیں۔ ان کے انتقال پر مختلف ادبی تنظیموں اور شہر و بیرون شہر کی اہم شخصیتوں نے تعزیتی بیانات جاری کیے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 7 اکتوبر 2022 اور محمد اویس سنبھلی کے مضمون 'حیات وکائنات کا مغنی: رباب رشیدی' مطبوعہ اودھ نامہ 12 اکتوبر سے مستفاد

مولانا نیاز احمد مدنی طیب پوری

بلرامپور: متعدد کتابوں کے مصنف اور بخاری شریف کے ہندی مترجم جامعہ محمدیہ منصورہ کے کہنہ مشق استاذ شیخ

نیاز احمد عبدالحمید بن عبدالحی طیب پوری کا 3 اکتوبر کی رات طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ مولانا کے انتقال سے پورا علاقہ ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ مولانا کے انتقال سے سماجی و معاشرتی زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہوگیا ہے۔ ان کی بے شمار اور ان گنت خدمات کو یاد کرتے ہوئے زمانہ مدتوں ان کی کمی کو محسوس کرتا رہے گا۔ مولانا کی نماز جنازہ ان کے آبائی وطن میں دو بجے

دن میں مولانا عبدالعلیم سلفی استاد جامعہ اسلامیہ خیرالعلوم ڈومریا گنج کی امامت میں ادا کی گئی جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ مولانا علم کے سچے شیدائی اور وقت کے بڑے قدرداں تھے، تدریس اور تصنیف وتالیف سے والہانہ لگاؤ تھا، آپ کی تقریروں اور تحریروں کا مرکزی عنوان تربیت اور اصلاح معاشرہ تھا، آپ انتہائی خلیق، متواضع، ملنسار، خیرخواہ اور طلبہ پر بڑے شفیق تھے، بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ شیخ ابوخورشید نیاز احمد عبدالحمید بن عبدالحی طیب پوری 7 جنوری 1963 کو طیب پور پوسٹ پرسونہ ضلع بلرامپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر اور بیت نارمنشی عابدعلی کے پاس پانے کے ساتھ آپ نے 1976 اور 1977 میں ہائی اسکول بھی پاس کرلیا، اس کے بعد ملک کی مشہور علمی درسگاہ جامعہ سراج العلوم بونڈیہار میں عربی ثانی میں داخل ہوئے اور رابعہ تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ سلفیہ بنارس چلے گئے اور عالمیت میں داخلہ اور 1983 میں عالمیت مکمل کرلی۔ فضیلت ثانی میں پہنچے ہی تھے کہ اسی دوران جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے منظوری آگئی اور اس طرح وہاں کلیہ الحدیث میں داخل ہوگئے اور 4 سال تک تعلیم پانے کے بعد 1989 میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اس کے بعد وطن واپس لوٹ کر جامعہ سراج العلوم بونڈیہار میں تدریس سے منسلک ہوگئے۔ دوران تدریس آپ نے 91-1990 میں جامعہ الملک سعود ریاض جاکر تدریب المعلمین کا ایک سالہ کورس بھی کیا اور اس کے بعد 2000 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی ادب میں ایم اے مکمل کیا۔ مولانا کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں ہیں جو عوام وخواص میں بہت مشہور ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں بخاری شریف کا ہندی ترجمہ، خواتین کے مخصوص مسائل (ہندی)، پچھتانے سے پہلے (ہندی)، جدید طبی ایجادات اور اسلامی احکام، جمعہ کے احکام وفضائل وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی اور دیگر اخبارات سے، 4 ستمبر 2022

محمد حنیف ندوی

حیدر گڑھ: بارہ بنکی کے معروف عالم دین مولانا محمد حنیف ندوی مہتمم مدرسہ فیض القرآن حیدر گڑھ وامام عیدین کا 30 ستمبر کو 73 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ مدرسہ فیض القرآن کے احاطے میں ندوۃ العلما کے ناظر عام مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی کی اقتدا میں ادا کی گئی، جب کہ تدفین جامع مسجد سے متصل آبائی قبرستان میں ہوئی۔ پسماندگان میں پانچ بیٹے جن میں دو عالم وحافظ، دو حافظ ایک عالم ہیں اور چار بیٹیاں جن میں تین عالمہ ہیں۔ مرحوم تقریباً 10 دنوں سے سخت علیل تھے۔ لکھنؤ کے ایک ہسپتال کے آئی سی یو وارڈ میں زیرعلاج تھے۔ طبیعت میں بہتری تھی۔ صبح دل کا دورہ پڑا اس کے بعد آخری سانسیں لیں۔ مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر نے اہل خانہ سے فون پر بات کر کے اظہار تعزیت کی۔ مرحوم روزنامہ انقلاب کے نمائندہ محمد عامر ندوی کے والد بھی تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی 1975 کے آس پاس ندوۃ العلما سے فراغت کے بعد اپنے علاقے میں دینی تعلیم سے وابستہ ہوئے ایک مکتب کا انتظام سنبھال کر اسے باقاعدہ مدرسے کی شکل دی، جہاں سے بڑی تعداد میں حفاظ فارغ ہوئے اور بڑی تعداد میں طلبہ نے عالمیت کی ابتدائی درجات پڑھ کر دارالعلوم ندوۃ العلما سے فراغت حاصل کی، جو متعدد شعبہ حیات میں رہ کر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے انتقال پر قصبہ واطراف کے ہزاروں لوگوں کا جم غفیر مدرسہ فیض القرآن پہنچا جہاں نماز ادا کرنے کے بعد آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اکتوبر 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................... بتاریخ.................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہندوستان میں معذور بچوں کا نظام تعلیم

مصنف: محمد حفظ الرحمن، مترجم: فیض اللہ خان

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 148

قیمت: 90 روپے

انتخاب غزلیات میر

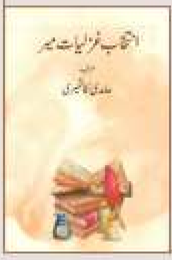

مرتب: حامدی کاشمیری

چوتھی اشاعت: 2022

صفحات: 208

قیمت: 115 روپے

پریم چند کی کہانیاں

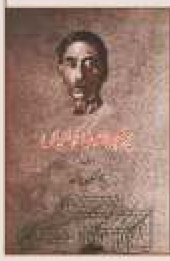

مرتب: جوگندر پال

چوتھی اشاعت: 2022

صفحات: 235

قیمت: 125 روپے

سائنس کی کہانیاں

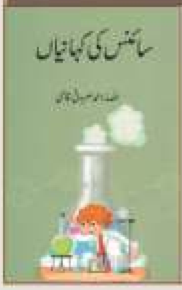

مصنف: انصار احمد معروفی قاسمی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 85

قیمت: 25 روپے

شعریات

ترجمہ و تعارف: شمس الرحمن فاروقی

پانچویں اشاعت: : 2022

صفحات: 124

قیمت: 80 روپے

تدریس جغرافیہ

مصنف: محمد ضیاء الدین علوی

تیسری طباعت: 2022

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

پھول بن

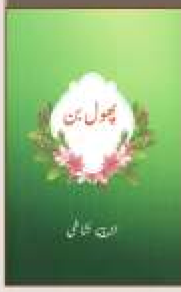

شاعر: ابن نشاطی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 190

قیمت: 115 روپے

نیاز فتح پوری کی تحریریں (ایک مختصر انتخاب)

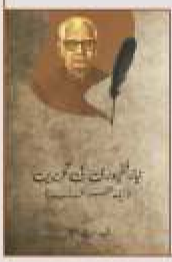

مرتب: ف س اعجاز

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 166

قیمت: 100 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, नवम्बर-२०२२,वर्ष:२४, अंक:११
URDU DUNIYA Monthly, November-2022, Vol.24, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/10/2022
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6